

ہندوستانی قصوں سے ماخوذ

اُردو مشنویاں

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور



ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں

ہندوستانی قصوں سے ماخوذ

اُردو مثنویاں

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.439 Gopi Chand Narang, Dr.
Hindustani Qissa kay Makhoos
Urdu Maanvigan / Dr. Gopi Chand
Narang.- Lahore : Sang-e-Meel
Publications, 2003.
364p.
1. Urdu Adab. 2. Taseer-e-
Tareekh. I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز / مصنف سے باقاعدہ
تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی
کوئی بھی صورت حال نمودار پڑے گی تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

2003

نیا زامہ نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1461-0

Sang-e-Meel Publications

25 Shahrah-e-Farid, Lower Mall, P.O. Box 107, Lahore-54000, PAKISTAN

Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101

http://www.sang-e-meel.com e-mail: smep@sang-e-meel.com

Chowk Urdu Bazar, Lahore, Pakistan. Phone: 7667970

حلی حلیف ایڈیٹر سٹریٹنگز لاہور

انتظار حسین

حیرت کی بات ہے کہ اتنا اہم تحقیقی کام اور پاکستان میں نابید چلا آتا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا یہ تحقیقی کارنامہ ۱۹۵۹ء میں کتابی صورت میں سامنے آیا۔ پھر دوبارہ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا مگر صرف ہندوستان میں۔ حالانکہ جس قسم کا یہ کام ہے اسے تو فوراً پاکستان کے ناشرین کو لپک لینا چاہیے تھا۔

نارنگ صاحب کا یہ تحقیقی کام ایسا ہے کہ اردو شاعری کا سارا نقشہ ہی مقلب نظر آتا ہے۔

اردو شاعری کے ساتھ ایک بڑی خرابی یہ ہوئی کہ اردو غزل کو پوری اردو شاعری سمجھ لیا گیا۔ تو جب اردو کی شعری روایت کی بات کی گئی تو اس کا مطلب لیا گیا 'اردو غزل کی روایت'۔ اس سے چند در چند خرابیاں پیدا ہوئیں۔ ایک بڑی خرابی یہ پیدا ہوئی کہ اردو زبان کے محافلوں کو یہ کہنے کا موقع ہاتھ آ گیا کہ اردو کا تو اس سرزمین سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

اس کی شاعری کو دیکھو! استعارے، تشبیہیں، تلمیذیں، موسم،
پرندے، درخت سب عرب و غم سے مستعار ہیں اور جناب دینے
والوں کو دیکھو کہ انہیں اپنی زبان کے دفاع میں نظیر اکبر آبادی
کے سوا کوئی حوالہ ہی یاد نہ آتا تھا۔ کیسے یاد آتا۔ ہمارے نقادوں
نے اپنا زور تنقید تو غزل پر صرف کیا تھا۔ باقی شاعری کو فالتو مال
جان کر کسی کال کوٹھری میں ڈال دیا۔

تاریک صاحب کا حقیقی کارنامہ اصل میں یہ ہے کہ
انہوں نے کال کوٹھری کا تالا توڑا اور چھپا ہوا سارا مال ہمارے
سامنے بکھیر دیا۔ لیجئے یہ تو اردو شاعری کا سارا نقشہ ہی بدل
گیا۔ عجیبی روایت تو غزل تک تھی۔ اس سے گذر کر کھگ مشوہوں
میں جھانکو۔ یہاں ہندی روایت کس زور شور سے اپنا جلوہ دکھا
رہی ہے۔ یہاں تو زمین و آسمان ہی اور ہیں۔ غزل کے زمین و
آسمان سے یکسر مختلف۔ ہندی دیو مالا پرانوں کی کہانیاں،
مہابھارت کی کہانیاں، لوک کہانیاں، قدیم اور وسطی زمانے کے
ہند کے تاریخی، نیم تاریخی اور تخیلاتی قصے۔ مختصر یہ کہ برصغیر کی
پوری سرزمین اپنی دیو مالا اور کھانیاں کی روایت کے ساتھ
یہاں جلوہ گر ہے۔ ایران و عرب کے قصے بھی اگر آئے ہیں تو
اسی رنگ میں رنگے گئے۔

اب ذرا سوچئے کہ اس تحقیق کے ساتھ اردو کی شعری
روایت کا دائرہ کتنا بکھیل گیا اور اس میں کتنا تنوع پیدا ہو گیا۔

پاکستان کے اپنے حساب سے بھی اس تحقیق کی اپنی
ایک معنویت ہے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ اردو علاقائی زبانوں سے
یکسر بیگانہ ہے۔ غالب و میر برحق مگر اس زبان کو پنجابی، سندھی،

بلوچی کے شاعروں کا اتنا پتہ ہی نہیں ہے اور چلی ہے پاکستان پر
اچھا حق جتانے۔ مگر ذرا مثنویوں کو اس حوالے سے بھی دیکھئے۔
ہیرا انجھا پر اردو میں کتنی مثنویاں لکھی گئی ہیں اور سسی پنوں کے
قصے پر کس کس نے مثنوی بانجھی ہے۔

باقی اس تحقیقی کام پر کہنے کے لیے بہت سی باتیں
ہیں۔ وہ نفاذ کریں گے۔ میں تو اس پر خوش ہو رہا ہوں کہ
سنگ میل کے ٹھیلے یہ کام اب پاکستان میں شائع ہو رہا ہے۔

فہرس

باب دوم :	7	پیش لفظ
قدیم لوک کہانیاں	17	مقدمہ
دکھنی مثنویاں		باب اوّل :
مثنوی کدم راؤ پدم راؤ	31	پورا ایک قصّے
مثنویات طوطی نامہ	33	مثنویات گل و من
قصّہ	33	قصّہ
فارسی نسخے	39	اردو نثری نسخے
اردو نسخے	39	اردو منظوم نسخے
مثنوی طوطی چہرہ خواہی	41	مثنوی گل و من احمد سراوی
طوطی نامہ سے ملتی جلتی دوسری مثنویاں	48	مثنوی گل و من بکھت
مثنوی سوداگر کی بی بی	49	مثنوی گل و من راحت
مثنوی لعل طوطا و بیبا	56	مثنوی گل و من کمال پر شاہ
مثنوی روشن میاں سوداگر	57	مثنویات شکستہ
اور شمسودا	58	قصّہ
مثنوی چندا اور لورک	62	فارسی نسخے
(چینا ستونقی) خواہی	62	اردو نثری نسخے
کنور منوہر اور بدھو مالیت	63	اردو منظوم نسخے
قصّہ	65	مثنوی نیرنگ سر
فارسی اور اردو نسخے	68	مثنوی ستیہ والان ساہوکاری

139	مثنوی مود نامہ	97	قاری
	مثنوی گلشن عشق یعنی قصہ راجا	98	اردو
147	بلوان مل و ہر سین	99	مثنوی گلشن عشق
	مثنوی افسانہ غم یعنی قصہ		مثنوی ظفر نامہ عشق
147	روپ ہست	103	از سید مظفر الحق - مظفر
	مثنوی قصہ راجا رام اور	104	مثنوی سندرسنگار
150	کنول دی	104	مثنوی عود صندل
154	مثنوی طوطی نامہ	105	مثنوی لعل و گوہر
155	مثنوی انشا	108	مثنوی نیہ درپن
157	مثنوی کنور و چندر کرن	110	مثنویات کامروپ اور کلا کام
	مثنوی راجا چترکٹ و رانی	111	قاری فیض
157	چندر کرن	115	اردو فیض
	مثنوی راجا چترکٹ و رانی		مثنوی کامروپ اور کلا کام
157	چندر کرن راجہ سروہوی	119	از حسین الدین
158	مثنوی قصہ گوپی چند	121	قصے کا خلاصہ
164	مثنوی راجا رگمبیر	127	شمالی ہندوستان کی مثنویاں
	مثنوی تھنہ مشتاق معروف	127	مثنویات سنگھاسن پتیسی
165	قصہ بکامل	129	قاری فیض
	مثنوی راجا کنور سین و رانی	132	اردو فیض
165	چتراولی	132	نثر
	مثنوی ہنس جواہر	133	نظم
165		134	مثنوی سنگھاسن پتیسی بکرا بیت
		136	مثنوی دیر بکرم
		136	مثنوی سنگھاسن پتیسی - چمن

190	مثنوی آہلیہ حرارت عشق	167	قصہ بردہ بھسوکا و قصہ پریم لوکا
191	مثنویات سستی پنوں	167	مثنوی گلدستہ عشق
193	قصہ	168	مثنوی قتیل عشق
194	جاد بختی حیثیت	168	مثنوی قصہ ست کنور
196	قاری بیٹے	169	مثنوی قصہ جمنی بہان
197	اردو بیٹے	169	مثنوی قصہ تہولن
200	مثنوی اسرار محبت	169	مثنوی غمزہ دلربا یعنی ہاسکیت
مثنوی ضمیمہ سحر، مصنفہ ہندت جلال			
206	خستہ دہلوی	169	اردو منظوم
211	مثنویات پدماوت		باب سوم:
212	قصہ		نیم تاریخی قصے
213	جاد بختی اصلیت	171	
220	قاری بیٹے	173	مثنویات ہیر و رانجھا
222	اردو بیٹے	174	قصہ
224	اردو نظم	175	جاد بختی حیثیت
225	مثنوی پدماوت غلام علی دکنی	178	قاری بیٹے
226	مثنوی رتن پدم، دلی دلیوری	178	نظم
227	مثنوی دیپک چنگ، مشرقی	181	نثر
229	مثنوی شمع و پروانہ	182	اردو بیٹے
232	مثنوی پدماوت، قاسم	182	نثر
234	مثنوی سوہنی مینوال	183	نظم
236	مثنوی سیلی سجنوں	184	مثنوی ہیر رانجھا عشق
237	مثنویات قصہ شاہ ادھما	187	مثنوی ہیر رانجھا نجیب
	مثنوی قصہ شہداد سہااز	188	مثنوی ہیر رانجھا کرم الہی
237	قائم چاند پوری		

269 مثنوی تقود با منی

269 مثنوی طاب و سرائی

272 مثنوی طبع عشق

272 مثنوی پہلول صادق

273 مثنوی فضلہ شوق

279 مثنوی سوز و گداز

280 مثنوی دل پذیر

282 مثنوی سراپا سوز

285 پانچ مزید ملحق جلتی مثنویاں

285 مثنوی حسن و عشق، راسخ

287 مثنوی کشف عشق

290 مثنوی راند و چری

291 مثنوی حسن و عشق، بے

293 مثنوی گدازے سرست

باب چہارم:

ہند ایرانی قصے

301

303 مثنوی پہول بن

311 مثنوی سحر الہیان

319 مثنوی گلزار نسیم

320 فارسی نسخے

321 اردو نسخے

327 قصے و تجرہ

341 کتابیات

351 اشاریہ

مثنوی اہلہ عشق

241 از راسخ عظیم آبادی

243 مثنوی چھو منتر

246 مثنوی جذبہ عشق

250 مثنوی کرشن کنور

250 مثنوی جذب عشق

250 مثنوی بدحوہ گل فردش

251 مثنوی قطب مشتری

254 ہارنجی حیثیت

256 مثنویات چند بدن و مہیار

258 قصہ

259 ہارنجی حیثیت

259 تجرہ

263 قصہ چند بدن پر مبنی مثنویاں

263 مثنوی ندرت عشق

263 مثنوی از واقف

264 مثنوی از بلبل

265 مثنوی از شاکر

265 مثنوی از سیف اللہ

266 قصہ چند بدن اور مہیار سے

266 ملحق جلتی مثنویاں

266 مثنوی مغل اور نامرئی

267 مثنوی تازمین اور پندھان

268 مثنوی بصر الامال

مکتوبات

A Descriptive Catalogue of the Oriental Library of the Late Tippoo Sultan of Mysore by Charles Stewart, Cambridge, 1809.

اسٹوارٹ

A Catalogue of the Arabic, Persian and Hindustani Manuscripts of the Libraries of the King of Oudh, Compiled by A. Sprenger, Calcutta, 1854.

اسپرانگر

Catalogue of the Hindi, Punjabi and Hindustani Manuscripts in the Library of the British Museum by J. F. Blumhardt, London, 1899.

برٹش

Catalogue of Hindustani Printed Books in the Library of the British Museum by J. F. Blumhardt, London, 1889.

برٹش کتب

A Supplementary Catalogue of Hindustani Books in the Library of the British Museum by J. F. Blumhardt, London, 1909.

برٹش ضمیمہ

Catalogues of the Hindi, Punjabi, Sindhi and Pushtu Printed Books in the Library of the British Museum by J. F. Blumhardt, London, 1893.

ہندی، پنجابی، سندھی، پشتو، کتب برٹش

A Supplementary Catalogue of Hindi Books in the Library of the British Museum by J. F. Blumhardt, London, 1913.

ہندی

A Second Supplementary Catalogue of Printed Books in Hindi, Nepali and Pahari in the Library of the British Museum, compiled by L.D. Barnett, London, 1957.

ہندی ضمیمہ ۲

Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum by Charles Rieu, London Vol. I, 1879, Vol. II, 1881, Vol. III, 1883, Vol. IV, 1895.

رج

Catalogue of the Hindustani Manuscripts in the Library of the India Office by James Fuller Blumhardt, London, 1926.

انڈیا

Catalogue of the Library of the India Office, Vol. II – Part II, Urdu Books, by J. F. Blumhardt, London, 1900.

انڈیا مطبوعات

Catalogue of the Library of the India Office, Vol. II – Part III, Hindi, Punjabi, Pushtu and Sindhi Books by J. F. Blumhardt, London, 1902.

انڈیا ہندی

Catalogue of Persian Manuscripts in the Library of the India Office, by Hermann Ethe, London Vol. I, 1903 Vol. II, 1937.

اسحق

Catalogue of the Library of the India Office, Vol II – Part VI, Persian Books by A. J. Arberry, London, 1937.

آربری

Catalogue of the Persian Manuscripts in the Bodleian Library, Part I, Part II, by Hermann Ethe, Part III by A.F.L. Beeston, Oxford 1889, 1930 and 1954.

باؤلین

Catalogue Roisane of the Buhar Library, Vol. I, Begun by Maulavi Qasim Hasir Radavi, Revised and Completed by Khan Sahib Maulavi Abd-ul-Muqtadir, Imperial Library, Calcutta, 1921.

بوہار

Descriptive Catalogue of the Persian Manuscripts, Asiatic Society of Bengal, by Wladimir Ivanow, Calcutta, 1924.

ایشیائک

Descriptive Catalogue of the Persian Manuscripts, Curzon Collection, Asiatic Society of Bengal by Wladimir Ivanow, Calcutta, 1926.

کرزن

بانگی پور

Catalogue of the Arabic and Persian Manuscripts in the Oriental Public Library at Bankei Pore, Vol. VIII by Maulavi Abdul Muqtadir, Patna, 1925.

بہمنی

A Descriptive Catalogue of the Arabic, Persian and Urdu Manuscripts in the Library of the University of Bombay by Khan Bahadur Shaikh Abdul Kadir-e-Sarfaraz, Bombay, 1935.

لکھنؤ

A Catalogue of the Oriental Manuscripts in the Library of the University of Lucknow by Kali Prasad, Lucknow, 1931.

آصفیہ
فہرست کتب عربی، فارسی و اردو محفوظہ کتب خانہ آصفیہ از
سید تصدق حسین، حیدرآباد، جلد ۲، ۱۳۳۳ھ؛ جلد ۳،
۱۳۳۷ھ؛ جلد ۴، ۱۳۵۵ھ

الفہرست
نذیریہ مخطوطات
الفہرست مرتبہ محمد سجاد مرزا ایک دہلوی، حیدرآباد ۱۹۳۳ء
فہرست کتب قلمی، شعبہ مخطوطات عربی فارسی اردو،
نذیریہ پبلک لائبریری، دہلی، مرتبہ محمد المہدی جعفری،
۱۳۶۰ھ دہلی

نذیریہ
عثمانیہ
فہرست کتب زبان اردو، نذیریہ پبلک لائبریری دہلی،
باہتمام سید محمد عبدالرؤف، دہلی
تفصیلی فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ، مرتبہ عبدالقادر
سرحدی، حیدرآباد ۱۹۴۹ء

سبحان اللہ
فہرست نسخ قلمی (عربی فارسی و اردو) سبحان اللہ اور بخش
لائبریری مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ مرتبہ سید کامل حسین
علی گڑھ، ۱۹۳۰ء

سبحان اللہ مطبوعات فہرست مطبوعات (عربی، فارسی و اردو) سبحان اللہ اور نخل
 لا بھریری علی گڑھ، مرتبہ محمد ابرار حسین فاروقی،
 علی گڑھ ۱۹۳۱ء

شیفتہ فہرست کتب ذخیرہ شیفتہ، مرتبہ ابو بکر محمد شیفتہ،
 علی گڑھ ۱۹۳۲ء

صدیق فہرست کتب صدیق بک ڈپو، مرتبہ شفیق شاہ پوری،
 لکھنؤ ۱۹۳۰ء

فہرست کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند) حیدر آباد، مرتبہ
 سید علی اختر حاتمی، حیدر آباد، ۱۹۳۳ء

سالار جنگ کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی
 وضاحتی فہرست از نصیر الدین ہاشمی، حیدر آباد ۱۹۵۷ء

ادارۃ ادبیات تذکرہ مخطوطات ادارۃ ادبیات اردو، ڈاکٹر سید محی الدین
 قادری، زور

حیدر آباد، جلد اول ۱۹۳۳ء، جلد دوم ۱۹۵۱ء

جلد سوم ۱۹۵۷ء، جلد چہارم ۱۹۵۸ء، جلد پنجم ۱۹۵۹ء

ادارہ مطبوعات فہرست مطبوعات، کتب خانہ ادارۃ ادبیات اردو، جلد اول
 مرتبہ غلام رسول و محمد اکبر الدین صدیقی، حیدر آباد، ۱۹۵۶ء

ادارہ مطبوعات ۲ فہرست کتب خانہ ادارۃ ادبیات اردو۔ مطبوعات اردو فارسی
 عربی، جلد دوم، مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی، حیدر آباد، ۱۹۵۹ء

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے لیے لفظ "اسلام" اور اسی طرح انسائیکلو پیڈیا بریٹیکا
 کے لیے "بریٹیکا" انسائیکلو پیڈیا امریکانا کے لیے "امریکانا" اور جیمیز انسائیکلو پیڈیا
 کے لیے "جیمیز" استعمال کیا گیا ہے۔

مقدمہ

اردو میں تحقیق کی موجودہ رفتار کو دیکھتے ہوئے، یہ بات افسوس ناک ہے کہ اردو مثنوی پر ابھی تک کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ غزل کے بعد ہمارے شاعروں نے جس صعبہ سخن پر سب سے زیادہ طبع آزمائی کی، وہ مثنوی ہی ہے۔ غزل پر تو ان چند برسوں میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دیے گئے ہیں، لیکن مثنوی کا کوئی پرسان حال بھی نہیں۔ امیر احمد علوی نے ”مثنویات“ پر ایک مقالہ ۱۹۳۵ء میں نگار کے لیے لکھا تھا۔ یہی بعد میں کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ عبدالقادر سروری کی کتاب ”اردو مثنوی کا ارتقا“ بھی تقریباً بیس برس پہلے لکھی گئی تھی۔ جلال الدین جعفری کی کتاب ”تاریخ مثنویات اردو“ کے نام سے دو بار شائع ہو چکی ہے۔ لیکن اس کی نوعیت تاریخی اور تحقیقی نہیں۔ اس میں زیادہ توجہ مشہور اردو مثنویوں کا انتخاب پیش کرنے پر صرف کی گئی ہے۔

اس دوران میں اردو تحقیق نے ترقی کی جو منزلیں طے کی ہیں، ان کے پیش نظر اردو مثنوی کے تاریخی ارتقا کا تحقیقی و ادبی جائزہ لینا نہایت ضروری ہو گیا ہے۔ مختلف یونیورسٹیوں میں اس سلسلے میں کام جاری ہے۔ بھوپال میں ڈاکٹر گیان چند جین ”شمالی ہندوستان میں اردو مثنوی کا ارتقا“ پر تحقیق کر رہے ہیں۔

اردو مثنویوں کی قدر و قیمت جاننے اور تاریخ ادب میں ان کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا جائزہ تاریخی و معاشرتی پس منظر کے ساتھ لیا جائے۔ اردو ادب نے فارسی سے بہت کچھ لیا۔ اس میں ایرانی اور اسلامی روایات کا رنگ بھی گہرا ہے، لیکن یہ ہندوستان سے بیگانہ محض نہیں ہے۔ اس نے یہاں کے ماحول، معاشرت اور تہذیب و تمدن کے اثرات بھی

قبول کیے ہیں۔ اردو کی دوسری اصناف سخن کی طرح ہماری مثنویاں بھی اُس اغذ و قبول، اختلاط اور اشتراک کا پتا دیتی ہیں، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ کے بعد یہاں تہذیبی اور معاشرتی سطح پر کار فرما رہا۔ قدیم مثنویوں میں عموماً قصے کہانیاں بیان کی جاتی تھیں، جن کا گہرا تعلق قوی روایات، مذہب اور معاشرت سے ہوتا تھا۔ ہماری مثنویاں چونکہ مشترک تہذیب اور ملی جلی معاشرت کے زیر اثر لکھی گئیں، اس لیے ان میں اسلامی قصے کہانیوں کے علاوہ ہندوستانی لوک کہانیاں اور عوامی روایتوں سے متاثر ہونے کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ اسی رجحان کا معروضی اور تحقیقی نقطہ نظر سے جائزہ لینا زیرِ نظر کتاب کا موضوع ہے۔ اس موضوع سے متعلق بحث کی حدود متعین کرنے سے پہلے ہندوستانی موضوعات پر مشتمل اردو مثنویوں کے عہد بہ عہد ارتقا پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ اُس زمانے میں جب اردو شاعری ابھی اپنے ارتقا کی منزلیں مذہب و تصوف کے سہارے طے کر رہی تھی، اردو کی اولین مثنوی میں ایک ہندوستانی قصے کو موضوع بنایا گیا۔ یہ مثنوی بھمنی دور کے ایک شاعر افطاس سے منسوب کی جاتی ہے اور اس میں کدم رافہ پدم رافہ کا مقامی قصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی غالباً احمد شاہ ثالث بھمنی (۸۶۷-۸۶۵ھ) کے زمانے میں لکھی گئی۔

اردو ادب کا باقاعدہ فروغ قلب شاہی اور عادل شاہی سلاطین کی سرپرستی میں دسویں صدی ہجری میں شروع ہوا۔ اسی زمانے میں ایک درباری شاعر وجہی نے سلطان محمد غلی قلب شاہ (۱۰۲۰-۹۸۸ھ) کی وارداتِ عشق کو مثنوی قلب مشعری میں شاعرانہ انداز سے پیش کیا۔ خواصی نے جہاں الف لیلا کی کہانیوں پر مبنی ایک مثنوی سیف الملوک اور بدیع الجمال لکھی (۱۰۳۵ھ)، وہاں دو اور مثنویاں طوطی نامہ (۱۰۳۹ھ) اور مینا و ستونجی (قبل ۱۰۵۰ھ) ہندوستانی موضوعات پر بھی تصنیف کیں۔ نصرتی نے منوہر اور مدحوماتی کے مشہور قصے کو نظم کا جامہ پہنایا (۱۰۶۸)۔ اس کی مثنوی ”علی نامہ“ ایک رزمیہ کارنامہ ہے،

جس میں علی عادل شاہ (۱۰۶۷-۱۰۸۳ھ) اور مغلوں اور شیواجی کی جنگوں کا احوال بیان کیا گیا ہے۔

اس دور میں ابن نساطری نے اپنی مشہور مثنوی پھول بن نکھی (۱۰۷۶ھ) اس کا پہلا قصہ نقیض کے سوداگر زلے کا، دوسرا جوگیوں سے عقیدت رکھنے والے ایک راجے کا اور تیسرا مصر کے شہزادے کا ہے، جو ہندوستان میں آکر اقامت گزیرے ہوا۔

دکنی ادبیات کے اس دور میں اسلامی قصوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی لوگ کہانیاں بھی بہت مقبول رہیں۔ اگر ایک طرف امین، دولت اور طبعی نے بہرام گور کے فارسی قصوں کو اردو میں منتقل کیا اور ملک خوشنود اور ہاشمی نے یوسف زلیخا اور احمد نے لیلیٰ و مجنون سے متعلق مثنویاں لکھیں، تو دوسری طرف غلام علی (۱۰۹۱ھ) (عشرقی (۱۰۷۷ھ) اور محمد نیاز دلی ویلوری (قبل ۱۱۳۷ھ) نے اپنی اپنی مثنویوں میں پدمات کی داستان عشق کو بیان کیا۔ مقبلی نے چند بدن اور صہیار کے دکنی قصے کو نظم کر کے (قبل ۱۰۵۰ھ) آنے والے شاعروں کے لیے نئی راہ کھول دی۔ مقبلی کے بعد پانچ اور دکنی شاعروں، محمد باقر آگاہ، واقف، بلبل، شاکر اور سیف اللہ نے بھی اس قصے پر طبع آزمائی کی۔ اس سے ملتی جلتی سات اور مثنویاں بھی اسی دور میں لکھی گئیں۔ ان کے نام ہیں: مثنوی مغل اور ناگرنی، مثنوی نازنین و پشمان، مثنوی بہر الال، مثنوی تھو پامنی، غالب و موہنی، صبح عشق اور بھلول صادق۔ ان مثنویوں میں ہیرو اور ہیروئن کا تعلق باہم مختلف مذاہب سے دکھایا گیا ہے۔ اسی طرح کی چار مثنویاں شمالی ہندوستان میں بھی لکھی گئیں۔ میر کی مثنوی شعلہ شوق میں عاشق اور معشوق کا تعلق باہم مختلف مذاہب سے نہیں، لیکن اس قصے سے ملتی جلتی جو عوامی روایت بعد میں مشہور ہوئی اور جسے شوق نیوی نے مثنوی سوز و گداز میں نظم کیا، اس میں عاشق کا مذاہب اس کے محبوب سے مختلف بتایا گیا ہے۔ میر کی مثنوی شعلہ شوق سعادت یار خاں رنگین کی مثنوی دل پزیر، قاضی محمد صادق اختر کی ”سرپا سوز“

اور شوق نیوی کی مثنوی ”سوز و گداز“ کے قصوں میں ہیروئن کا مذہب، ہیرو کے مذہب سے مختلف بتایا گیا ہے۔

۱۹۰۷ء میں مغلوں کے ہاتھوں پنجپور کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کی شکست و ریخت کا ذکر ایک شاعر سید عالم پنجپوری نے اپنی مثنوی ”جامع المنجرات“ میں بڑے درد و سوز سے کیا ہے۔

۱۹۰۸ء میں اورنگ زیب عالمگیر نے قطب شاہی سلطنت کو بھی مغلیہ قلمرو میں شامل کر لیا اور ان دونوں سلطنتوں سے متعلق شعرا آرکات، ویلور، سدھوت، کرنول، کڑیا وغیرہ مختلف ریاستوں میں منتشر ہو گئے۔ اس انتشار اور اتاری کے عالم میں جو مثنویاں لکھی گئیں، ان سے بھی دکنی شاعروں کی ہندوستانی موضوعات سے وابستگی کا ثبوت ملتا ہے۔ عارف الدین عاجز نے اندر سبھا کی طرز پر ایک مثنوی قصہ ’اعل و گوہر لکھی‘ (قبل ۱۱۳۹ھ) سید احمد ہنر نے اپنی نقاشی کی ”پھول بن“ کے جواب میں ”مثنوی نیہ در پن“ پیش کی، جس میں راجا راج کنور اور رانی کام لاکا کا قصہ بیان کیا گیا ہے (۱۱۳۳ھ)۔

دلی دکنی جس کے دیوان کی شہرت سے شمالی ہندوستان میں شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز ہوا، دو مثنویوں کا مصنف ہے۔ ان میں سے ایک صوفیاء ہے اور دوسری شہر سورت کی تفریف و توصیف میں لکھی گئی ہے۔

مقامی موضوعات پر طبع آزمائی کا رجحان بارہویں صدی کے دکنی شاعروں کے ہاں بھی ملتا ہے۔ اس زمانے میں طوطی نامہ سے ملتی جلتی تین اور مثنویاں گجرات میں لکھی گئیں۔ مثنوی سوداگر کی بیوی از سید عبداللہ (۱۱۶۳ھ)، طوطا اور بیٹا از روشن علی (۱۱۸۸ھ) اور مثنوی روشن سوداگر از جمال الدین۔ حسین الدین کی مثنوی کام روپ اور کام کلا بھی دکنی ہی میں ۱۷۰۰ء میں لکھی گئی۔ یہ مثنوی یودپ میں بہت مقبول رہی ہے۔ دہاسی کا بیان ہے کہ اردو میں اس قصے کو چار اور شاعروں حسین، سراج، حسن اور آرزو نے بھی نظم کیا تھا۔

شمالی ہندوستان میں باقاعدہ اردو مثنوی کا اولین نمونہ محمد افضل کی بکٹ

کہانی کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں بارہ ماسے کی طرز پر ایک فراق زدہ عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ میر جعفر زنگی کے الحاقی کلام میں ایک مثنوی موسم سرما کی خدمت میں پائی جاتی ہے۔ شاہ حاتم نے مثنوی بہار یہ میں ہولی اور دیوالی کا سماں کمال خوبی سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے جعفر علی خاں زکی کی شروع کی ہوئی مثنوی ”داستان عشقِ حق“ کو بھی مکمل کیا اور اس زمانے کی حقہ نوشی کے لوازمات اور آداب کو بڑے پُر لطف حیرائے میں بیان کیا۔ سودا نے مثنوی طفل لکڑی باز لکھ کر ایک خاص طبقے کے اعمال و کردار کو بے نقاب کیا۔ لیکن حقد میں مثنوی کا علی ترین نمونہ میر تقی میر نے پیش کیا۔ مثنوی دریائے عشق کا قصہ تھیلی ہے۔ لیکن حقلہ شوق پر س رام کے عشق کی ایک ایسی لوک روایت پر مبنی ہے، جسے بعض حلقوں میں ہر واقع کا زحیہ دیا جاتا ہے۔ میر نے اپنی دو مثنویوں میں برسات کی شدت اور سیلاب کی تباہ کاریوں کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ انھوں نے ایک مثنوی ”در بیان ہولی“ بھی لکھی۔ ہولی کا ذکر جشن گد خدا کی سے متعلق دو اور مثنویوں میں بھی ملتا ہے۔ ہولی سے متعلق اس زمانے میں بعض اور شاعروں نے بھی مثنویاں لکھیں۔ ان میں سے فائز دہلوی، قائم چاند پوری اور راغب دہلوی کی مثنویاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شیر علی افسوس نے بھی جشن ہولی سے متعلق ۲۲۸ اشعار کی ایک مثنوی لکھی تھی، جو ان کے قلمی دیوان مکتب خانہ مشرقیہ، پٹنہ میں موجود ہے۔ اسی کتب خانے میں محمد جعفر خاں راغب کے دیوان کے دو مخطوطے ہیں۔ شمار ۶۹ میں مثنوی ”بیان احوال بزم ہولی“ شامل ہے۔ یہ ۹۷ اشعار پر مشتمل ہے، جن میں سے ۷۳ اشعار قاضی عبدالودود صاحب نے رسالہ اشارہ (گیا) میں شائع کیے ہیں۔ قائم چاند پوری کی مثنوی ”در توصیف ہولی“ ان کے قلمی دیوان، اسٹیٹ لائبریری راجپور میں شامل ہے اور یہ کل ۳۳ اشعار کی ہے۔ حاتم کی مثنوی بہار یہ بھی غیر مطبوعہ ہے اور یہ مثنوی اسٹیٹ لائبریری راجپور کے نسخہ دیوان زادہ میں موجود ہے۔

اسی زمانے میں میر اثر نے مثنوی خواب و خیال لکھی، جس میں سرپا نگاری کی ہندی روش کا بیج کیا گیا ہے۔ کچھ نرائن شفیق اورنگ آبادی کی مثنوی تصویر چانائوں کی روش بھی لکھی ہے۔

میر حسن نے اپنی شہرہ آفاق مثنوی ”سحرالبیان“ (۱۹۹ھ میں) نکلنے میں مکمل کی۔ اس کا قصہ ایرانی طرز کا ہے، لیکن اس کے ذیلی واقعات راجا اندر کے قصوں اور سراندرپ سے متعلق لوگ کہانیوں سے ملتے جلتے ہیں۔

مصطفیٰ نے ہندستان کے ”موسم گرما“ اور ”افراط موسم سرما“ پر بڑی عمدہ مثنویاں لکھیں۔ ان سے پہلے قائم بھی برسات اور سرما سے متعلق دو بلند پایہ مثنویاں لکھ چکے تھے۔ غالباً ان کی دیکھا دیکھی جرأت نے بھی ہندستانی موسموں کے احوال پر قلم اٹھایا اور متعدد مثنویاں لکھیں، جو ان کے مجموعہ مثنویات (قلمی) میں شامل ہیں۔ انٹا نے رانی کھنکی اور کنور اودے بہان جیسی ایک کہانی ضمیمہ ہندستانی میں بھی نظم کرنا شروع کی تھی، مگر یہ مکمل نہ ہو سکی۔

محبت خاں محبت شاگرد جرأت نے سستی پنوں کے مشہور قصے کو ۱۱۹۷ھ میں ”اسرار محبت“ کے نام سے اردو میں لکھا۔ اسی زمانے میں گلکنٹا کے قصے پر تین مثنویاں لکھی گئیں۔ پہلی سید محمد تقی کی رنک گلزار، دوسری غلام احمد کی فراموش یاد (قبل ۱۸۳۹ء) اور تیسری عنایت گلکے کی غارۂ عشق (۱۸۸۳ء)۔ لکھنوی رنگ کی مثنویوں کی نمائندگی کا شرف گلزار نسیم (۱۲۵۳ء) کو حاصل ہے۔ اس میں مخلوط قسم کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ شاعر نے ہندی اور ایرانی عناصر کی آمیزش سے نیا ہیرو تیار کیا ہے۔ گل بکاؤلی کا قصہ نسیم سے پہلے بھی اردو میں موجود تھا۔ مثنوی ”تخت مجلس سلاطین“ (غالباً ۱۵۱۵ء) اور مثنوی ”خیابان رحمان“ (۱۲۱۳ء) دونوں مثنویاں گلزار نسیم سے پہلے کی تصنیف ہیں۔ گل بکاؤلی کا ایک اور منظوم ترجمہ محمد دہلوی علی سے بھی منسوب کیا جاتا ہے، جو ۱۲۶۱ء میں لکھا گیا۔

لگ بھگ اسی زمانے میں مرزا شوق لکھنوی نے اپنی زندہ جاوید مشنویوں: ”زہر عشق“، ”بہار عشق“، ”فریب عشق“ کے موضوعات لکھنؤ کے ماحول و معاشرت سے اخذ کیے اور انھیں کمال فن کاری سے شعر کے پیرائے میں بیان کیا۔ تیرہویں صدی بھری میں بعض غیر لکھنوی شعرائے اردو نے بھی ہندوستانی موضوعات پر مشنویاں لکھیں۔ ان میں سے عل دمن، پدماوت، سنگھاسن بیتی اور بہر راہنما خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مؤرخ الذکر قصے کو مول چند مٹھی اور نجیب الدین نجیب نے اپنی اپنی مشنویوں میں لکھا۔ ضیاء الدین صہرت اور ان کے انتقال کے بعد غلام علی عشرت (۱۲۱۱ھ) نے پدماوت کو اردو نظم میں پیش کیا۔ محمد قاسم بریلوی کی ضخیم اردو پدماوت ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی۔ عل دمن کے قصے پر اس صدی کے دوران میں چھ مختلف شعرا نے طبع آزمائی کی۔ احمد سراوی (۱۲۳۰ھ)، نیاز علی ٹکٹ (شاگرد شاہ نصیر) (قبل ۱۳۵۶ھ)، بھگونت رائے راحت کاکوروی (۱۲۳۳ھ)، میر علی بنگالی، احمد علی (قبل ۱۲۷۰ھ) اور کالی پرشاد نے ۱۲۸۶ھ میں عل دمن منکوم تصنیف کی۔ مشنوی سنگھاسن بیتی کے دو اردو نسخے علی گڑھ میں ہیں۔ نسخہ لٹن کا مصنف خود کو خواجہ میر درد کا شاگرد بتاتا ہے۔ بلاشبہ سے روایت ہے کہ منسارام ناتواں اور رنگین لال رنگین نے بھی سنگھاسن بیتی کے قصوں کو اردو میں منتقل کیا تھا۔ رنگ لال چمن کی مشنوی سنگھاسن بیتی ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی۔ اسی دور میں روپ ہنسٹ کے مقبول عام قصے کو سر دھنا کے ہر چند رائے ہر چند نے اردو مشنوی میں بیان کیا (۱۸۵۳ء) قصہ راجا چترکت اور رانی چندو کرن سے متعلق دو مشنویاں ملتی ہیں۔ ایک روشن علی کی اور دوسری سمن لعل راجب امر و ہوی کی جو ۱۸۸۳ء میں لکھی گئی۔ انجی پرشاد ہوش نے قصہ گوپی چند بھرتی کو بطور مشنوی بیان کیا۔ یہ مشنوی دہلی سے ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی۔

اس دوران میں بعض اردو مشنویاں پنجاب میں لکھی گئیں۔ سستی پنوں کے قصے سے متعلق کیسرا سنگھ، سالک اور لال سنگھ نے مشنویاں لکھیں۔ کرم الہی بھوپالی نے ۱۹۰۵ء میں ہیر رانجھا کو پھر سے نظم میں پیش کیا۔ اسی قصے سے متعلق عبدالغفور قیس کی مشنوی ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کا نام ”ارمغان گدا“ ہے۔

سنہ اٹھارہ سو ستادہ کے پہلے کے بعد سے قدیم اردو شاعری کا رنگ تبدیل ہونے لگا۔ تو منظوم قصے کہانیوں کا بھی پہلا سا ذوق و شوق باقی نہ رہا۔ رشتہ رشتہ ان کی جگہ ناول اور افسانے نے لے لی۔ پھر بھی موجودہ دور میں جو اپنی کہنی مشنویاں لکھی گئیں، ان کا سلسلہ بھی مقامی موضوعات پر طبع آزمائی کرنے کی اس قدیم روایت تک پہنچتا ہے، جس کا آغاز، وجہی، غواہی اور نصرتی کے زمانے میں ہوا تھا۔ ان میں بے نظیر شاہ وارثی کی مشنوی ”اکھام“ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ یہ ایک صوفیانہ مشنوی ہے، لیکن اس میں ہندوستانی مظاہر فطرت کی ایسی عمدہ مرقع کشی کی گئی ہے کہ اردو میں اس کی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ مشنوی عالم خیال میں، شوق قدوائی نے ہندی بارہ ماسے کی طرز پر ایک فراق زدہ خاتون کے جذبات بیان کیے ہیں۔ اقبال و راسخو بھنگوی نے مشنوی نیرنگ سحر میں شکستہ کا قصہ بیان کیا ہے، جو انھوں نے کالی داس سے لیا۔ (۱۹۱۰ء) جگر بریلوی کی مشنوی پیام سادتری، اس دور کی اور اپنے رنگ کی آخری مشنوی ہے، جس میں ستیہ دھن سادتری کا پورنک قصہ بیان کیا گیا ہے۔ (۱۹۳۰ء)

یہ ہے، ہندوستانی زندگی سے ماخوذ اردو مشنویوں کے تاریخی ارتقا کا سرسری خاکہ! ان مشنویوں کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ اردو مشنوی کا دامن مقامی موضوعات سے کبھی خالی نہیں رہا۔ ان موضوعات سے ہمارے شاعروں کی وابستگی سطحی یا رسمی نہیں۔ ان میں سے بیشتر نے ”ذریعہ بیان سوہا“ تالیف کتاب“ میں صراحت کر دی ہے کہ جس قصے کو وہ مشنوی کے قالب میں پیش کر رہے

ہیں، اس میں کبھی کبھی خوبیاں ہیں اور وہ اسے اتنا زیادہ پسند کیوں کرتے ہیں۔ محبت خاں محبت نے سستی بنوں کے بارے میں لکھا ہے کہ اس قصے کو سن کر سنگ دل سے سنگ دل انسان کا کلیجہ بھی پانی ہو جائے گا۔ ضیاء الدین عبرت نے جب پداوت کا قصہ نظم کرنا شروع کیا تو بعض لوگوں نے ہندو راجارانی کا قصہ لکھنے پر اعتراض کیا۔ جواب میں عبرت نے کہا کہ مجھے وطن سے زیادہ کوئی سر زمین عزیز نہیں۔ جو کچھ اپنے وطن میں ہے، دوسرے ملکوں میں کہاں، پھر کیوں ہندوستان کے قصے چھوڑ کر دوسروں کے قصے دہراتا رہوں۔

تحقیق و تنقید کی سہولت کے لیے مقامی موضوعات پر مشتمل اردو مشنویوں کو مندرجہ ذیل جیسے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) مذہبی مشنویاں: مثلاً رامائن از بھگن ناتھ خوشتر، رامائن از شکر ویال فرحت، مہابھارت از طوطا رام شالیاں، بھاگوت از خوشتر، بھگوت گیتا، گیتا مہاتم اور بٹن لیللا از رام سہاسے تننا، لکھنوی مہاتم از رام پرشاد، ملخصہ چہ تراز جواہر لال کرامت، برج صہب از بنواری لال شعلہ۔

(۲) تاریخی مشنویاں: مثلاً علی نامہ از نصرتی، میزبانی نامہ اور ظفر نامہ نظام شاہ از شوقی، اضراب سلطانی، فتح نامہ شیخ سلطان از حسین علی طرب دکھنی۔ تاریخ سلاطین ہند از سمیل، پھول نامہ از رائے برج فرائن درما ناظم، تاریخ بدیع اثر امیر اللہ حلیم لکھنوی وغیرہ۔

(۳) وہ مشنویاں جن میں ہندوستان کے معاشرتی کوائف و آثار کی تفصیل ملتی ہے۔ مثلاً شاہ حاتم، میر، راجب دہلوی، فائز دہلوی، قائم چاند پوری اور شیر علی اموس کی مشنویاں ہولی کی تعریف میں۔ حاتم کی مشنوی حقے کے بیان میں، سودا کی مشنوی جھوٹا لکڑی باز اور میر کی مشنوی مرغ باز میں بھی قدیم

معاشرت کے بعض پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب نے مولف کے نام اپنے خط میں مطلع کیا ہے کہ سید انشاء اللہ خاں انشاء نے بھی ”مرغ نامہ“ لکھا تھا۔ ایک مثنوی مرغ نامہ پیر محمد مراد آبادی جرأت کی تصنیف بھی بتائی گئی ہے۔ قدرت اللہ شوق کا بیان ہے: ”پیر محمد مراد آبادی جرأت تکلف از یاران مراد علی حیرت... اشعارش بسمع نرسیدہ مگر مثنوی مرغنامہ لو کہ اختتام آں از حیرت است، مشہور و معروف است۔“ (تذکرہ طبقات سخن، قلمی، ورق ۲۷۶ الف، آصفیہ)

میلہ بہتہ کے بیان میں فائز دہلوی کی مثنوی، چھڑیوں کے میلے کے بارے میں میر حسن کی ”گلزارِ لہر“ اور نکستو کے میلے فیصلوں سے متعلق ہادی علی بے خود کی مثنوی ”جلوۂ اختر“ بھی اسی ذیل میں آتی ہیں۔ طبقہ نسواں کے آداب و اطوار، لباس، پوشاک، رہن سہن اور شادی بیاہ کی رسوم کی تفصیل اردو کی مندرجہ ذیل مثنویوں میں ملتی ہے: نصرتی کی ”گلشنِ عشق“، ابنِ نسا علی کی ”پھول بن“، میر کی در بیان کدخدائی، بشن سنگھ پسر راجا ناگر مل (دبہ اختلاف چند اشعار) در بیان کدخدائی آصف الدولہ، میر حسن کی سحر الہیان اور مثنوی شادی، مرزا حسن علی ہندی شاگرد مصحفی کی مثنوی ہندی، نواب بادشاہ محل کی مثنوی عالم، حسین بخش واقف کی مثنوی بہارستان شادی، مرزا شوق نکستوی کی زہر عشق، بہار عشق، فریب عشق، حاتم علی مہر کی شعاع مہر، منیر شکوہ آبادی کی حجابِ زناں اور تسلیم سہوائی کی مثنوی سعدین۔

(۳) وہ مثنویاں جو ہندستان کے قطری مظاہر یا موسموں کے بارے میں ہیں، مثلاً سودا کی مثنوی گرمی کے بیان میں، میر کی ”در مذمتِ برہکال“۔ قائم کی مثنوی ”در شدتِ سرما“ اور ”مثنوی در بیان شدتِ گلِ دلوائے“۔ مصحفی کی ”مثنوی گرما و آتش زدگی“ اور ”در بیان موسمِ سرما“ اور جرأت کی مثنویاں در بارہ

سرماہ گریما اور برسات۔ مصحفی کی مثنوی اجواجن، غالب کی مثنوی انبہ اور عبدالباقی سہوانی کی مثنوی انبہ نامہ بھی اسی ذیل میں شامل ہیں۔ ہندوستانی موسموں کی وافر سچی اور دل کشی کا اظہار اردو کے قدیم پارہ ماسوں میں کیا گیا ہے۔ ان میں سے خاص خاص یہ ہیں: بکٹ کہانی، محمد افضل، پارہ ماسی عبدالمولیٰ عزالت، بکٹ کہانی النبی بخش کاندھلوی، پارہ ماسہ سندھ کلی، پارہ ماسہ کاظم علی جواں، پارہ ماسہ وہاب، ڈوری لال، بہادر علی وحشت، لطف علی، رائے پرشاد شلاہ، عبداللہ انصاری، کنہیا لال طالب وغیرہ۔

(۵) وہ مثنویاں جن میں حسب الوطنی کے جذبات پائے جاتے ہیں، مثلاً حضرت شاہ مراد کی مثنوی در بیان لاہور، سورت کی تعریف میں ولی کی مثنوی، ہدایت شاگرد ورو اور سعادت یار خاں رنگین کی مثنویاں مئارس کے حسن و خوبی کے بیان میں، محمد بخش شہید، خواجہ بادشاہ خلف وزیر کی مثنویاں لکھنؤ کی تعریف و توصیف میں، چھنوالا طرب کی مثنوی امین آباد کی تعریف میں، موسن کی مثنوی جہادیہ، واجد علی شاہ کی حزن اختر اور مولوی لیاقت علی کی وہ مثنوی جو غدر کے دنوں میں لکھنؤ میں بطور اشتہار شائع ہوئی تھی۔

(۶) ہندوستانی قصے کہانیوں سے ماخوذ مثنویاں: موضوع کی اہمیت اور وسعت کے پیش نظر زیر نظر کتاب میں صرف آخری قسم کی مثنویوں کو لیا گیا ہے۔ یعنی یہاں فقط ان مثنویوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے گا، جن کا تعلق پورانک قصوں سے ہے یا جو ہندوستان کی قدیم روایتوں اور لوک کہانیوں سے ماخوذ ہیں۔ انھیں مزید چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں ابواب کی تقسیم اسی انداز پر عمل میں لائی گئی ہے۔

(الف) پورانک قصے: ان قصوں کا تعلق مہابھارت، رامائن اور ہندوؤں کے دوسرے پورانوں سے ہے۔ ان میں سے اردو میں زیادہ تر عل

دہشتی، ذہنیت اور کلکتلا اور سچے وان و سادہتری کے قصے لے گئے ہیں۔ سادہتری کی کہانی سے متعلق ایک، کلکتلا پر چار اور مل دہشتی پر جتنی جیسے مثنویاں اردو میں لکھی ہیں، جن کی تفصیل کتاب میں ملے گی۔

(ب) لوک کہانیاں : اس ذیل میں وہ قصے کہانیاں آتی ہیں، جو بچ بچ، تنز، شک سب تھی، چال بچھی، کشا سرت ساگر یا جاتک کہانوں یا ہندستان کے قدیم افسانوی ادب سے ماخوذ ہیں، یا جو عوامی روایتوں اور علاقائی زبانوں کے مقبول عام قصوں سے لی گئی ہیں۔ انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی شق میں دہشتی مثنویات مثلاً کدم رلا، پدم رلا، طوطی نامہ، بیاستوتی، منوہر اور بدھوالتی، عود و صندوق، یہ درجن اور کامروپ و کلا کام سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں شمالی ہندستان کی مثنویوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، جن میں سے زیادہ اہم مثنویاں یہ ہیں : سنگھاسن بتیسی، راجا بلوان مل و چتر سین، قصہ کنور و چندر کرن، راجا چترکٹ اور رانی چندر کرن، قصہ راجا گوپی چند اور قصہ راجا کنور سین و رانی چتراولی۔

(ج) نیم تاریخی قصے : ان کے تحت وہ قصے لے گئے ہیں، جنہیں عوامی روایتوں میں سر واقع سمجھا جاتا ہے یا جن کا تعلق کسی تاریخی واقعہ سے ہے۔ اردو میں ایسی چند مثنویاں یہ ہیں : ہیر رانجھا، سکی بنوں، پدموت، سوہنی میمنوال، بدھو گل فروش، قطب مشتری، چندر بدن و مہیار، ندرت عشق، مغل اور ناگرتی، طالب و موہنی، بہلول صادق، فلعہ شوق، سوز و گداز، مثنوی دل پذیر اور مثنوی سراپا سوز۔

(د) ہند ایرانی قصے : مذکورہ بالا قصوں کے علاوہ اردو مثنویوں کے کچھ قصے ایسے بھی ہیں، جن میں دھرمی تو یہ کیا گیا ہے کہ قصہ "نچن و ماچن یا

خطا و غلطی کا ہے، لیکن کرداروں کے معاشرتی آثار و کوائف، فطری مظاہر اور مشنوی کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ قصے کی جائے وقوع ہندوستان ہی ہے۔ یہ قصے پلاٹ کے اعتبار سے مخلوط ہیں، نہ یہ خالص ہندوستانی ہیں نہ ایرانی۔ کہنے کو یہ قصے طبعاً ہیں، لیکن دراصل ان میں ہندی اور ایرانی قصے کہانیوں کی روایتیں کچھ اس انداز سے مل گئی ہیں کہ ایک نیا قصہ بن گیا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ایسے قصوں میں ایرانی قصے کی عظمت اور ہندی لوک کہانیوں کی پراسرار وسعت دونوں کا اثر نظر آئے گا۔ اس لحاظ سے انھیں ”ہند ایرانی“ کہا جاسکتا ہے۔ اردو میں اس قسم کی متعدد مشنویاں لکھی گئی ہیں۔ ان سب کا ذکر چونکہ نکرار اور طوالت کا موجب ہوگا، اس لیے یہاں دکنی، دہلوی اور لکھنؤی مشنویوں میں سے ایک ایک کا انتخاب کر لیا گیا ہے۔ دکنی مشنویوں میں سے بھول بن، دہلوی رنگ کی مشنویوں میں سے سحر الہیان اور لکھنؤی مشنویوں میں سے گلزار نسیم کا تہذیبی مطالعہ پیش کرتے ہوئے، اس بات کا پورا خیال رکھا گیا ہے کہ قصے کے مختلف اجزاء کی اصلیت پوری طرح روشنی میں آجائے۔

مندرجہ بالا مشنویوں کو ہر باب کے تحت قصے کی قدامت اور تاریخی ترحیب کے اعتبار سے پیش کیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ مشنوی سے بحث کرتے ہوئے متعلقہ قصے کی قدیم ترین روایت کو سامنے رکھا جائے اور اختلافات کی نشان دہی بھی کردی جائے۔ اردو کی بعض مشنویاں چونکہ فارسی سے ترجمہ ہیں، اس لیے فارسی نسخوں کے نام پیش کرنا بھی ضروری سمجھا گیا۔ ہر قصے سے متعلق اردو کی نثری اور منظوم روایتوں کی بھی پوری تفصیل دے دی گئی ہے۔ اردو کی زیر تسمیرہ مشنویوں میں سے چونکہ بیشتر قلمی ہیں اور ان کا تعارف پہلی مرتبہ کر لیا جا رہا ہے، اس لیے مآخذ بہ قید سند و صفحہ درج کر دیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف قدیم اور قلمی تذکروں کے علاوہ کتب خانہ شاہان اودھ، برٹش

میوزیم، انڈیا آفس، ہاولین، کیبیرج، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کرزن ککشن، بانگی پور، کتب خانہ سالار جنگ، عثمانیہ اور آصفیہ (حیدر آباد) کی وضاحتی فہرستوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ تاکہ زیر تبصرہ مشنویوں کے مختلف نسخوں کے بارے میں تمام ضروری معلومات فراہم کر دی جائیں۔ جہاں تک ممکن تھا، کوشش کی گئی ہے کہ موضوع زیر بحث کا کوئی حصہ نقشہ نہ رہے اور اردو مشنویوں کا وہ پہلو جو ہنوز تاریخی میں تھا پوری طرح سامنے آجائے۔

مشکل شدہ است کار دل از عشق و خوش دلم
شاید رسد بخاطر مشکل پسند تو

گوپی چند نارنگ

دہلی یونیورسٹی
۲ اگست ۱۹۵۹ء

باب اوّل

پُورانک قصّے

مثنویات قل و من

ہندستان کا یہ ہر دل عزیز قصہ ہندوؤں کی مشہور مذہبی کتاب ”مہابھارت“ سے لیا گیا ہے۔ یہ پانچوؤں کو ان کی جلاوطنی کے زمانے میں تقریباً سنایا گیا تھا۔ اس لحاظ سے قل و من کی کہانی پُرانوں کے زمانے سے بھی قدیم ہے۔ سنسکرت میں اس قصے کے متعدد نسخے ملتے ہیں، لیکن مستند متن مہابھارت ہی کا ہے۔ قل و من ہندستان کے ان چند قصوں میں سے ہے، جن کی شہرت و مقبولیت ہندستان سے باہر بھی ہے اور جن کا غیر ملکی زبانوں میں بار بار ترجمہ کیا گیا ہے۔

قصہ

قل و من کے اس مشہور قصے کا خلاصہ یہ ہے :

قل و من ہندستان کی نشاۃ ریاست کا راجا تھا۔ نہایت حسین، خوبصورت، دیدوں کا عالم، شجاعت اور مردانگی میں فرد اور سپ شناسی میں یکائے روزگار تھا۔ رتھ چلانے میں ہوا سے بھی تیز، لیکن چوسر بازی اور بھوکھیلنے کی لت تھی۔ دہشتی دور بھ (بیدر) کے راجا بھیم کی اکلوتی بیٹی تھی، جس کے حسن و خوبی کا ایک عالم میں چرچا تھا۔ قل اور دہشتی دونوں ایک دوسرے کی تعریف و تحسین سن کر ناپیدہ عشق میں مبتلا ہو گئے۔ حسن اتفاق سے قل کے ہاتھ ایک ایسا ہنس لگا، جس نے دہشتی سے جا کر قل کی شورش عشق کا ذکر کیا۔ دہشتی اس آگ میں پہلے ہی بھنک رہی تھی۔ غرض نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہوا اور حمایہ کی بے تابی دونوں طرف رنگ لانے لگی۔

راجا بھیم نے فیصلہ کیا کہ دہشتی سوئبر کے ذریعے اپنے شوہر کا انتخاب کر لے۔ بیکروں راجے مہاراجے اور کنور قسمت آزمائی کے لیے بیدر پہنچے۔ قل بھی ان میں سے ایک تھا۔ چار دیوتا آگئی، اندر، ورن اور یم بھی اس سوئبر

میں شرکت کی غرض سے آئے۔ راستے میں قل سے ان کی منہ بھیڑ ہوئی۔ انہوں نے قل کو حکم دیا کہ وہ دہشتی سے کہہ دے کہ دہشتی ان چاروں میں سے کسی ایک کو شوہر منتخب کر لے ورنہ خیر نہیں۔

بیدار پہنچ کر قل نے ہاولہ ناخواستہ دیوتاؤں کے حکم کی تعمیل کی۔ مگر خود اس کی موجودگی میں دیوتاؤں کا چراغ کیا جلا! دہشتی کو قل کی طرف مہلت دیکھ کر دیوتاؤں نے قل کی شکل اختیار کر لی۔ دہشتی اپنے امیدواروں میں ایک کے بجائے پانچ قل دیکھ کر محضے میں پڑ گئی۔ مگر دلہ جلتا نے وہ نمائی کی اور دہشتی نے انتخاب کا سہرا حقیقی قل کے گلے میں ڈال دیا۔

کالی دیوتا سوئمر میں دیر سے پہنچا۔ قل کی کامیابی پر وہ حسد کی آگ میں جلنے لگا اور اس نے بدلہ لینے کی ٹھانی۔

شادی کے بعد قل اور دہشتی نکاح میں بڑی فراغت سے زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کے ایک لڑکا اندر سین اور ایک لڑکی اندر اپیدا ہوئی۔ چند برس بعد قل کی کسی خلیف بھول پر حاسد دیوتا کالی کو قل کے حواس پر قابو پانے کا موقع مل گیا اور اسے اپنے بھائی پٹنگر سے چوسر کھیلنے کی ترغیب ہوئی۔ قل بازی بد کر کھیلا۔ چوسر پر کالی کا اثر تھا۔ قل کو مات پر مات ہوئی، حتیٰ کہ وہ تخت و تاج اور مال و مالاک ہر شے ہار گیا۔ راجا بننے کے بعد پٹنگر نے اعلان کیا کہ کوئی شخص قل کو پتہ نہ دے۔ قل کے لیے سوائے نکاح جھوڑنے کے چارہ نہ تھا۔ دہشتی نے بھی اس کا ساتھ دیا اور دونوں نے جنگل کی راہ لی۔

دوران سفر میں بھوک نے زور کیا تو قل نے پرندے پکڑنے کے لیے ان پر اپنی چادر پھینکی، پرندے چادر سمیٹ اڑ گئے۔ اس غربت اور بے بسی کے عالم میں قل سے دہشتی کی پریشانی نہ دیکھی گئی۔ حاسد دیوتا کی وجہ سے قل پر جنون کا غلبہ تو تھا ہی، اس نے سوتے میں دہشتی کو اکلیا چھوڑ کر اپنی راہ لی۔ دہشتی مدتوں جنگلوں کی خاک چھائی اور جھکے چلتی پھری۔ اتفاق سے اسے جمبدی کی شہزادی کے ہاں پتہ مل گئی، جہاں سے اس کے والدین اسے لے گئے۔

اُدھر اعلیٰ خاک بسر، وہ بدو ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ جنگل میں اس نے ایک سانپ کی جان بچائی، اُسے جلتی آگ سے باہر نکالا۔ لیکن سانپ نے اعلیٰ کو ڈس لیا، جس سے اعلیٰ کی شکل ایک سیاہ بونے کی سی ہو گئی۔ اعلیٰ کے سٹ پٹانے پر سانپ نے کہا کہ ”تمہارا بھلا اسی میں ہے۔ تمہاری قسمت کا ستارہ گردش میں ہے اور اسی شکل میں تم آنے والی صعوبتوں سے محفوظ رہ سکو گے۔ جب تمہارے دن پھریں گے تو زہر کا اثر خود بخود جاتا رہے گا۔“ چنانچہ اعلیٰ اسی حالت میں ابھو دھیا کے راجا روتھن کے ہاں رتھ بان اور خانساں کی حیثیت سے ملازم ہو گیا۔

دہمختی نے میکے پہنچ کر اعلیٰ کی تلاش میں جگہ جگہ شراغ رساں بھیجے مگر بے سود۔ اعلیٰ کی صورت بدل چکی تھی۔ آخر بعد مدت کے ایک دقیقہ رس برہمن شراغ رساں کو راجا روتھن کے رتھ بان پر اعلیٰ کا شبہ ہوا۔ دہمختی نے اس کی تصدیق چاہی اور راجا روتھن کو اپنے سو بھائی کی جھوٹی خبر پر بلا بھیجا اور وفد اتنا تھوڑا دیا کہ دنیا بھر میں سوائے اعلیٰ کے اس قدر تیز رتھ چلانے والا کوئی نہ تھا جو راجا روتھن کو رات کی رات مقررہ وقت کے اندر ودر بھ پہنچا دے۔

راجا روتھن ریاضی اور چوسر میں غیر معمولی دسترس رکھتا تھا۔ دوران سفر میں وہ اعلیٰ کو ان علوم کے رموز و نکات سے آگاہ کرتا رہا اور اعلیٰ نے اس احسان کے بدلے میں اپنی حیرت انگیز برقی رفتار رتھ پانی کا کمال دکھایا اور صبح ہونے سے پہلے ہی روتھن کو ودر بھ پہنچا دیا۔ یہ دیکھ کر دہمختی کا شبہ گہرا ہو گیا۔ لیکن اعلیٰ ابھی بونے کی شکل میں تھا۔ دہمختی نے اس کی اصلیت کا یقین کرنے کے لیے چند اور آزماہیں کیں اور بالآخر اعلیٰ کا پتہ ہوا کہ اعلیٰ جھکے سے اس کا کمان یقین میں بدل گیا۔ اعلیٰ پہچانا گیا۔ مدتوں کے گھمڑے آپس میں ملے۔ اعلیٰ نے سانپ کی بتائی ہوئی ترکیب سے اپنی بد شکل سے نجات پائی اور اپنی اصل حالت میں آ گیا۔

دہمختی کے والد راجا بھیم نے اعلیٰ کی جمعیت میں ایک بھاری لشکر روانہ کیا تاکہ وہ اپنے غاصب بھائی بھنگر سے جنگ آزما ہو کر اپنی سلطنت حاصل

کر سکے۔ نٹادھ پہنچ کر قل نے ہنگر کو پھر چوسر کی دعوت دی اور اب کی بار سلطنت کے مقابلے پر قل نے دمیٹی کو لگا دیا۔ قل پہلے ہی رتوہن سے اس کھیل کے رموز و نکات سیکھ چکا تھا۔ چنانچہ کامیاب رہا۔ ہنگر اپنے کیے پر ہچکتا یا اور معافی کا طالب ہوا۔ قل نہ صرف خلوص و محبت سے پیش آیا بلکہ انعام و اکرام سے نوازتے ہوئے اس نے ہنگر کو نگاہوں جانے کی اجازت بھی دی۔ اجڑا چمن شاداب ہوا اور قل اور دمیٹی پھر سے نٹادھ پر حکمرانی کرنے لگے۔^(۱)

قل دمن کے اس قصے کو مشہور مسکرت شاعر کالی داس نے بھی ”قل اورے“ کے نام سے نظم کیا ہے۔^(۲) کالی داس کے بعد اس قصے پر طبع آزمائی کرنے والوں میں شری ہرش قاتل ذکر ہیں۔ انھوں نے اس قصے کو ”نٹادھ چتر“ کے نام سے لکھا۔^(۳) قل دمن کے ہندی ترجموں میں سب سے مشہور اور اہم ترجمہ کوئی سور داس کا ہے۔^(۴)

قل دمن کا قصہ مہابھارت کے بعد ہندوستانی قصے کہانیوں کی مشہور کتاب کھاسرت ساگر مؤلفہ سوم دیو میں بھی ملتا ہے۔ یہاں سے اسے Penzer نے بڑبان انگریزی The Ocean of Story جلد ۴ میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب لندن سے ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔

قل دمن کا ترجمہ انگریزی، فرانسیسی، سویڈش، پولش، یونانی اور فنکیرین وغیرہ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ انگریزی میں^(۵) Norman E. Penzer اور Sister Nevidata کے خلاصے، لاطینی میں Bopp Franz اور جرمن میں Ruckert کے ترجمے قاتل ذکر ہیں۔^(۶)

- ۱ مہابھارت، جہڑا کر ریمبرج انسٹیٹیوٹ، پو: ۱۹۳۲ء، اولن پرو: قل پاکستان پرو
- ۲ جان برو، جیمیز جلد ۹، ص ۶۵۳
- ۳ امریکا، جلد ۱۹، ص ۶۸۵
- ۴ بھٹی نمبر ۱۳ ص ۷۷
- ۵ اورنگل کالج میگزین فیبر ۱۹۳۱ء، صفحہ ۲۰
- ۶ ایذا، اگست ۱۹۳۲ء، صفحہ ۳

قل دمن کا متن Buhler نے ۱۸۷۷ء اور Kellner نے ۱۸۸۵ء میں شائع کیا۔ Monier Williams کا انگریزی ترجمہ آکسفورڈ سے ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا۔ (۷)

فارسی میں اس قصے کو سب سے پہلے اکبر اعظم کی فرمائش پر فیضی نے ۱۰۰۳ھ میں لکھا۔ (۸)

ابوالفضل فیضی (۹۵۳ھ - ۱۰۰۳ھ) نے غصہ یعنی ٹھائی کی پانچوں مشنویوں کا جواب لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کی تفصیل اس نے خود ایک خط میں لکھی ہے :

”اسامی کتب غصہ ابن سبت، اول مرکز اودار کہ اکثرے در فتح چہر گفت شدہ بود، دوم سلیمان و بلقیس کہ پیش ازیں ہفت سال در لاہور بنیاد کردہ بود، و چہرے چند ازال گفت، سوم قل دمن کہ تمام شد، چہارم ہفت کشور، کہ در احوال ہفت اقیم گفت خواہد شد، پنجم اکبر نامہ کہ آں ہم چہتہ چہتہ وقتے گفتہ بود۔“ (۹)

ابوالفضل نے اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ یہ پانچوں مشنویاں انہام کو پہنچیں۔ (۱۰) لیکن یہ صحیح نہیں۔ شبلی کا بیان ہے کہ ”ان میں سے دو کتابیں یعنی قل دمن اور مرکز اودار انہام کو پہنچیں۔ مرکز اودار کی ترویج ابوالفضل نے فیضی کے مرنے کے بعد کی۔ ۳۰ جلوس میں فیضی کو غصہ کا خیال پیدا ہوا اور ساتھ ساتھ مشنویوں کی بنیاد ڈالی۔ لیکن چونکہ بہت مشغلہ پیش آتے رہتے تھے، کوئی کتاب انہام کو نہ پہنچ سکی۔ ۳۹ جلوس میں اکبر نے اصرار کے ساتھ کہا کہ سب سے پہلے قل دمن انہام پائے۔“ (۱۱) ابوالفضل نے لکھا ہے کہ ”..... دریں سال

۷ ہسٹری آف مشنری لٹریچر، اے۔ اے۔ میڈلنڈ، ص ۳۳۵

۸ ایشیاٹک، ۶۶۶ (این اے ۱۰۶) یز کرزن، ۲۵۷ (۱۸ III) راج: برٹش مسلم ۱۶۷۱: اشہر انگر

ص ۳۰۲، بنگلی، ص ۲۷۸

۹ شعر النجم جلد ۳، ص ۵۵

۱۰ اکبر نامہ جلد ۳، ص ۶۶۱

۱۱ شعر النجم جلد ۳، ص ۵۶

(۳۹ جلد) اورنگ نہیں فرہنگ آرا آں دلتاے رموزا نفسی و آفاق را طلب داشتہ، اہتمام پیمان بردن آں پنجنامہ فرمود۔ و اشارت ہمایوں براں رفت کہ نخست افسانہ قل دمن ہزاروے سخن نئی برخطہ آید۔ در چہار ماہ چہار ہزار بیت ہفتونہ انجام برداشتہ او گفت۔ (۱۲)

اکبر اس مثنوی سے بہت مفلوظ ہوا۔ قیاب خاں کو حکم ہوا کہ وہ پڑھ کر سنایا کرے۔ پوری تفصیل بدایونی نے یوں لکھی ہے:

”دریں ایام (۱۰۰۳ھ) ہنگام اشعرا حکم تصنیف پنج مثنوی فرمودند تا در دست پنج ماہ کم و بیش کتاب قل دمن را کہ عاشق و معشوق بودند و آں قصہ در اہل ہند مشہور است مشتمل بر چہار ہزار و دو ہجست بیت و کسری مرتب ساختہ در نظر باچہ اشرفی نذر گذراہند و بسیار مستحسن افندہ و حکم بکتابت و تصویب آں و خواندن در محل بہ قیاب خاں فرمودند الحق مثنوی ست کہ دریں ہی صد سال محل آں بعد از میر خسرو شاہد در ہند کسے دیگر گفتہ باشد۔“ (۱۳)

فیضی کی یہ شہرہ آفاق مثنوی پہلی بار کلکتے سے ۱۸۳۱ء میں شائع ہوئی۔ (۱۴) اس مثنوی کے کچھ حصوں کا ترجمہ Spiegel نے لیزگ سے ۱۸۳۶ء میں Chrestomathia Persica میں پیش کیا۔ (ص ۱۵۰-۱۳۱) (۱۵)

اکبر کو یہ مثنوی اس قدر پسند تھی کہ خاص خوشنویسوں اور مصوروں کو حکم دے کر مصور و حرمین شاہی نسخہ تیار کرایا۔ فیضی کی یہ مثنوی اپنی فنی خوبیوں اور قصے کی دلچسپی کی وجہ سے بہت مشہور ہوئی۔ اردو میں اس قصے سے متعلق جتنے بھی نسخے ملتے ہیں، ان میں سے اکثر میں کہانی کی بنیاد فیضی ہی کے متن پر

۱۲ اکبرنامہ جلد سوم، ص ۶۶۲

۱۳ غقب التواریخ جلد دوم، ص ۳۹۶ فیضی کے حالات و غیرہ کے لیے حریہ ملاحظہ ہو،

کائناتنامہ جلد ۲، ص ۵۸۲۔ نقل ص ۸۳

۱۴ انشائیکو پیڈیا آف اسلام، جلد ۲، ص ۳۳

۱۵ ۴، ص ۲۷۳۔

رنگی مکی ہے۔

اردو نثری نسخے

- (۱) اردو نثر میں اس قصے کو سب سے پہلے الٹی بخش شوق نے ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء میں لکھا۔ یہ نسخہ فیضی کی قلم دہن سے ترجمہ ہے۔ شوق مرزا مظہر بخت خلف مرزا جواں بخت کے ملازم تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۳۱ھ میں ہوا۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔^(۱۶)
- (۲) گارساں دتاسی نے رکھوتا تھ کے ایک مطبوعہ نسخے کا حوالہ دیا ہے۔^(۱۷) لیکن قلم دہن از رکھوتا تھ تحقیق طلب ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ نسخہ نثر میں ہے یا نظم میں۔

اردو منظوم نسخے

- (۱) قلم دہن (اردو ڈراما) مصنفہ گوری فکر صفحات ۳۶، کانپور ۱۸۸۸ء۔^(۱۸)
- (۲) قلم و سبیتی (اردو ڈراما) از دینانیک پرشپور، کل صفحات ۷۱، لکھنؤ ۱۸۸۵ء۔^(۱۹)
- (۳) قماشائے فونہال چمن (اردو ڈراما) مشتمل بر قصہ قلم دہن۔ مصنفہ مرزا نظیر بیگ اکبر آبادی۔ صفحات ۵۶، آگرہ ۱۸۹۳ء۔^(۲۰)
- (۴) قلم دہن، میر نیاز علی دہلوی متخلص بہ نکبت (قلمی) اوراق ۱۱۵،

۱۶ علوم و ادب: ۱، برٹش: ۹۷

۱۷ تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی: ج ۲، ص ۵۲۲، ۵۲۳، بحوالہ معاصر ۱۱

۱۸ اطرافِ مطبوعات ص ۹۸

۱۹ ایضاً، ص ۹۸

۲۰ اطرافِ مطبوعات ص ۱۰۰، نیز اردو ڈراما، عشرت رحمانی، ص ۲۲۳

- مخطوطہ کتب خانہ رضائیہ، راجپور۔ ناقص الآخر (قبل ۱۲۵۶ھ) (۲۱)
- (۵) قل دمن، بھگونت رائے راحت کاکوروی (قلمی) سنہ تصنیف ۱۲۴۴ھ۔ مکتوبہ ۱۸۵۶ء، لورائی ۶۶، مخطوطہ لٹن لاہوری علی گڑھ۔ (۲۲)
- (۶) بہار عشق، میر علی بنگالی (قبل ۱۸۵۳ء) (۲۳)
- (۷) قل دمن، احمد سرلوی (قلمی) پنجاب یونیورسٹی لاہوری، لاہور، لورائی ۴۵، سنہ کتابت ۱۳۰۰ھ، غالباً ۱۲۴۰ھ۔ (۲۴)
- (۸) قل دمن، احمد علی؛ لکھنؤ (قبل ۱۸۵۳ء) (۲۵)
- گارساں دتاسی نے غالباً احمد سرلوی ہی کو احمد علی لکھا ہے۔ ہمارے نزدیک فقط احمد سرلوی کی مثنوی کا وجود حقیقی ہے۔
- (۹) قل دمن، کالی پرشار، صفحات ۳۶، مطبوعہ ۱۸۶۹ء، لکھنؤ (۲۶)
- (۱۰) نکریم الدولہ سید علی اکبر خاں بہادر مستقیم جنگ، اکبر ٹھکس نے بھی ایک اردو مثنوی "قل دمن" لکھی تھی۔ انھوں نے چالیس تذکروں سے مدد لے کر شعرائے ریختہ کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا اور ایک فارسی دیوان بھی یادگار چھوڑا تھا، مگر اب ان میں سے کوئی کتاب نہیں ملتی۔ (۲۷)
- اکبر، نواب تاج محل نسیم کے برادر حقیقی اور مرزا جواں بخت جہاندار شاہ ولی عہد کے باموں تھے۔ تمام عمر پیش و عشرت سے بسر کی۔ علم موسیقی میں بھی

- ۲۱ کتب خانہ رضائیہ راجپور: نقاب ۵۸۲
- ۲۲ لٹن لاہوری، علی گڑھ، نقاب ۵۵
- ۲۳ "بہار عشق" مصطفیٰ نور ان کی تصانیف "شعورہ خطبات گارساں دتاسی، ص ۱۵۵، خطبہ سوم میں دتاسی نے بہار عشق کو اور علی سے منسوب کیا ہے، ص ۲۳
- ۲۴ اورینٹل کالج لیبرری، میسر، نومبر ۱۹۳۱ء، صفحہ ۲۱
- ۲۵ "بہار عشق" مصطفیٰ نور ان کی تصانیف "شعورہ خطبات گارساں دتاسی، ص ۱۵۵
- ۲۶ علوم ہدایت، کتب برحق، ص ۱۵۳
- ۲۷ نکات، اول، ص ۲۷۵

اچھا دغل تھا۔ مین عالم شباب میں ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں انتقال کیا۔ (۲۸)

(۱۱) ڈاکٹر مختار الدین آردو کا بیان ہے کہ بھولا ناچھ فرارغ نے بھی ایک مثنوی تل و من لکھی تھی۔ (۲۹) اس کی تفصیل ہنوز تحقیق طلب ہے۔ بلوم ہارت نے بھولا ناچھ کا تحفہ ”فارغ“ بتایا ہے اور ان کی ایک تصنیف ”فسانہ عجائب منظوم“ جو رجب علی بیگ کے ”فسانہ عجائب“ پر مبنی ہے، کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب لکھنؤ سے ۱۸۷۰ء اور کانپور سے ۱۸۷۷ء میں ۳۱ صفحات پر شائع ہوئی تھی۔ (۳۰)

(۱۲) راجا تل بڑبان ہریانہ (گیتوں اور دوہوں میں) مصنفہ مخن لال پٹنی لال۔ اسے اردو رسم الخط میں شجوب دیال دینا تھا تھ نے دریہ کلاں دلی سے اواخر انیسویں صدی میں شائع کیا۔

(۱۳) راجا تل دمنٹی بڑبان ہریانہ (گیتوں اور بھجوں میں) از چٹت موتی رام شیو چند۔ یہ کتاب بھی اردو رسم الخط میں دریہ کلاں دلی سے اواخر انیسویں صدی میں شائع ہوئی۔

مثنوی تل و من، احمد سراوی

اشچرا نگر کا بیان ہے کہ غالباً یہ احمد سراوی وہی شخص ہے، جس نے ”مگل و صنوبر“ اور دو ہندستانی نظمیں ”مور پکھی“ اور ”رنگ پر“ لکھی ہیں اور جن کا ذکر گارساں دتای نے کیا ہے۔ (۳۱) مؤرخ الذکر ۱۲۳۱ھ میں لکھی گئیں۔ مثنوی تل و من میں سز کتابت پانصرتخ درج نہیں کیا گیا۔ فقط ۴۰ھ لکھا ہے۔ اگر رنگ پر ی اور مثنوی تل و من کا مصنف ایک ہی احمد سراوی ہے تو رنگ پر ی کے سز کتابت ۱۲۳۱ھ کے پیش نظر، یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ مثنوی تل

۲۸ علامہ نور محمد مجموعہ نقوۃ، ص ۷۷، طبقات شعراے ہند ۲۸۲ و قانع عالم شای ۱۹ اور ۲۰۰

۲۹ مکتوب پیام مولف

۳۰ انڈیا مطبوعات، ص ۱۵۳

۳۱ یادگار شعراء، ص ۲۰

دمن کے ترقیے میں ۴۰ء سے مراد ۱۲۳۰ء ہے۔

مثنوی قل دمن از احمد سراوی میں سنہ کتابت فقط ۴۰ء درج ہے۔
ڈاکٹر سید عبداللہ کا قیاس ہے کہ یہ مثنوی ۱۱۳۰ء میں لکھی گئی۔ (۳۲) اشپراگر نے
جس احمد سراوی کا ذکر کیا ہے، وہ اس کی دو نظموں: مود پنکھی اور رشک پری کو
۱۲۳۱ء کی تصنیف بتاتا ہے۔ (۳۳) چنانچہ قطعی ثبوت کی غیر موجودگی میں ہم
نے مثنوی قل دمن کو ۱۲۳۰ء کی تصنیف قیاس کیا ہے۔

اس مثنوی کا مکمل متن ڈاکٹر سید عبداللہ نے آج سے اٹھارہ برس
پہلے، اور فیل کالج میگزین میں بالا قسط شائع کیا تھا (۳۴) اور اس تصنیف کی لسانی
خصوصیات سے بھی سیر حاصل بحث کی تھی۔ (۳۵) گو اس مثنوی کا مصنف احمد
سراوی، سراوا ضلع میرٹھ کا باشندہ ہے، لیکن مثنوی کی زبان میں ہریانی کا عنصر
گہرا ہے۔ احمد سراوی نے قصہ قل دمن کو ہریانی میں نظم کرنے کی کوئی وجہ بیان
نہیں کی۔ لیکن اطلب ہے کہ قل دمن فیضی کی مقبولیت اس کی محرک ثابت
ہوئی ہو۔ احمد سراوی نے فیضی ہی کی مثنوی کو اپنے قصے کی بنیاد بنایا ہے۔ کہیں
کہیں فیضی کے فارسی الفاظ ہو بہو لے لیے ہیں۔ لیکن یہ مثنوی فیضی کا پابند
ترجمہ نہیں۔ احمد نے قصے کے معاملے میں فیضی کا صحیح ضرور کیا ہے، لیکن فیضی
کی طول لوبی سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے جذبات کے بیان اور مناظر
کی تصویر کشی میں اضافے کیے ہیں، لیکن اصل قصے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔
اپنے زمانے کے رواج کے مطابق احمد سراوی بھی کہانی کی ہر کڑی کے بعد بھاشا
کے ذہرے درج کرتا ہے، جو خود اس کی تصنیف ہیں۔ اس سے قیاس ہوتا ہے

۳۲ اور فیل کالج میگزین، خیر نوبر ۱۹۳۱ء۔

۳۳ یادگار شعریہ، ص ۲۰

۳۴ ملاحظہ ہو اور فیل کالج میگزین (خیر) نوبر ۱۹۳۱ء، ص ۳۶۴۲۰، فروری ۱۹۳۲ء، ص ۴۳

۵۲ مئی ۱۹۳۲ء، ص ۶۸۴۵۴، اگست ۱۹۳۲ء، ص ۸۳۴۶۹، نوبر ۱۹۳۲ء، ص ۹۸۴۸۵

۳۵ ملاحظہ ہو اور فیل کالج میگزین، خیر، اگست ۱۹۳۲ء، ص ۲۴۴۲۳

کہ اس کے چہ نظر علی دمن کا کوئی بھاکا میں لکھا ہوا نسخہ رہا ہوگا۔ لیکن غلطی قصہ پر غور کرنے سے یہ حقیقت کھلتی ہے کہ اصل مسکرت روایت اور فیضی کے ہاں جو ہلکے سے اختلافات ہیں، وہ احمد سراوی کے ہاں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ واقعات قصہ کے معاملے میں احمد سراوی سوائے فیضی کے کسی دوسری روایت سے متاثر نہیں ہوا۔ ڈاکٹر سید عہد اللہ نے صحیح لکھا ہے کہ ”احمد سراوی نے اس نظم کو لکھتے ہوئے فیضی کی کتاب سے لفظاً و معنایاً بہت فائدہ اٹھایا ہے۔“ (۳۶)

مثنوی کا آغاز حسب معمول حمد و نعت سے ہوتا ہے۔ اس ضمن میں یہ دوہا بند کے آخر میں آیا ہے:

ہوں نرگن، اوگن کمی تو بج کا کر بار

ہن نرگن کے کارنی، اوگن موری بار

اس کے بعد کشور بند کی یوں تعریف کی ہے:

ہے کشور بند دل کشا تر برو بخش فرح فرا تر

اس خاک سے ہے خمیر میرا خود شید ہے پاں خمیر میرا

ہے بند بہشت کی نشانی ہر چشمہ آب زندگانی

ہر شہر و قریہ ہائے ایسا بوم فردوس ہے چاہجائے مقوم

غرمیں نکلیں جوشہ پرداز غنچہ وہاں شوق طہیز

سوداگر عاشقان بے دل لیتے ہیں بہ نقد غمزہ صد دل

مشہور ہے بند میں سراوا رکھتا ہے بہشت ساتھ دعویٰ

ہر طفل بعلم عشق استاد حق اس کو رکھے ہمیشہ آباد

عل کی شورش عشق کے بعد ایک ندیم اتفاقاً دمن کے حسن و جمال کا

تذکرہ کرتا ہے۔ اس موقع پر احمد سراوی نے عل کا سراپا بڑی خوبی اور چابکدستی

سے پیش کیا ہے۔ مریاتی نام کو نہیں، لیکن سراپا نگاری کی قدیم روایت کو ذفرق باہتمام پوری طرح نبھایا ہے۔ مثنوی کی زبان ابتدائی زمانے کی ہے اور مخلوط ہریاتی کی وجہ سے لائق اور انجینی معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ اگر غور کیجیے تو اس منجہ طراز کی تصویر کشی میں شاعر نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ہر نقش زندہ ہے اور ہر خط دل کش۔ تشبیہیں اور استعارے صاف، پر زور اور معنی خیز۔ گو شاعر کے سامنے غار سی مثنوی تھی، پھر بھی جمالیاتی احساس کی فضا میں ہندوستانی رنگ صاف جھلکتا ہے :

کیا ہال کہوں بھونک (۳۷) کھارے	چندن پی کریں کھول سارے
وہ مانگ سفید جگر گارے	مگ پائن (۳۸) گھٹا نے آوے
کیا وصف کروں میں اس جہیں کا	ماحقا نہیں، چاند چودھویں کا
امد نہ، رکھ تیغ مغربی ہیں	جنگلی صف وے پلک سجے ہیں
دوغین گویا کھجی (۳۹) کے جوڑے	سرخ و سپہ و سفید ڈورے
ہے مانگ گویا کھڑک (۴۰) کی دھارا
رخسارہ سفید، سرخ خوش رنگ	تل کھائے رہے دو تانگ لون سنگ
وہ کان میں بالیاں براہیں	سوتی سجے لون کے سنگ ساہیں
لب سرخ دہان تک پیادے	دندان کی جوت سے پیادے
گردن نہ، کہوں رنگ (۴۱) سجدار	کہہ باگ رکھے ہے جیسے اسوار
بہندی میں ہتھیلیاں رچائیں	خورشید دپے (۴۲) کپے جوں صبا میں

۳۷ سانپ

۳۸ بھونک کی قطار

۳۹ چھوٹی سی چڑیا جو ہالوں میں دکھائی دیتی ہے

۴۰ کھور

۴۱ کھوڑا

۴۲ روشنی

ہے پیٹ کھول چڑ ملائم پاؤں سے ہے قوت اس کا دائم
دو جاگے (۳۳) کساق کو یکشیدہ شمشاد قدم راست مثل سرو آزاد
کیا حسن کہ آگ کا بھوکا لوتا ہے قرار ہر کسو کا
سر کھول پری اگر اٹھاوے دن رات کو ایک ہی دکھاوے
مہندی سے نہیں قدم کو لالی آئے ہے خلق پہ پامالی
بکلی کی جھلک ہے مسکراتا اندھیار میں پہلجھڑی دکھاتا
لبونت سورج سے کھ چھاوے جہروں سے پری کو لاج آوے
مشہور بنام خود دمن ہے بے شبہ جمال کا جہن ہے

مرغ کے ذریعے پیغام یاد پاکر، دمن، تصور جاناں لیے ہوئے یوں آو و
نغاں کرتی ہے:

اے طالع سخت تیں جلیا تو بھی مرے کام کچھ نہ آیا
اسطور سے غل خن سناوے ہیراگ کا راگ غم سے گاوے
دم دم میں دمن دمن پکارے پل یاد جہن کی نہ ہمارے
اے صلح کہاں ہے تو کہاں ہے آتش زن خانماں کہاں ہے
بن دیکھیں ہی زخم تین لگایا پیداوا! تجھی رحم نہ آیا

کاری لاگو گھاو، کت جاؤں کاسوں کہوں

تو سووے سکھ نیند ہوں تجھ بن دوکھ یہ کہوں

سوئبر کا سماں دیکھیے۔ دور دور سے رہے مہاراجے اور کنور قسمت آزمائی کے
لیے تشریف لائے ہیں:

سب راجا و راجہ آرزو میں مشغول دمن کی مہنگلو میں
کیا جائے درش کب دکھاوے اب کون پسند اوس کو آوے

ہوں مہم کے نصیب بیدار پاوے شفا ہم میں کون بیدار
کوئی حسب اور نسب جنکوے کوئی لعل مردی دکھاوے
دیس اپنا کوئی زباں پہ آنے ایک اور خزانے کو بیکھانے
کوئی کہے فوج مجھ ہے بھاری میں سب میں بڑا ہوں راہدہ جاری
سکھرائی کوئی کرے مسودہ کوئی کرے اپنا شوق اظہار
لوے (۳۳) سے نکلی دامن پری روپ جھلکار

بانو سبھی سبھا کوں گئی تھکلی مار

مسکن میں سب بیدار لوٹی سورج کی کرن صبح میں پھوٹی
گھونگھٹ تو لٹوٹک اٹھائے دیں قتل عام سبھا کا مفت کیہیں
پھولوں کا لیے وہ ہار در دست آوے گویا حور ناز میں مست
سندھ کی میں چال کیا تھلاں کیا ہنس د کہک کوں لچلاں
ہر طرف نگاہ کو چلاوے تاروں میں گویا کہ چاند آوے

شادی کے بعد فیضی کے ہاں قل دامن کی شب زفاف کا طویل بیان ہے۔ احمد سراوی نے حضرت لب در خسار کے اس پہلو کی طرف چشم سخن کا اشارہ ہی کافی سمجھا ہے اور اس کو سچے میں زیادہ دیر ٹھہرنا گوارا نہیں کیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میر اثر اور میر حسن کے بعد یہ کافر روایت اردو شاعروں کے ایسی منہ گلی کہ بہت دنوں تک اس کا پیکانہ گیا۔

احمد سراوی نے حسن و جمال کی وجدانی کیفیتیں بڑی کامیابی سے اُبھاری ہیں۔ درد و داغ و جستجو و آرزو کے بیان میں بھی جذبات کو پر زور اور موثر طریقے سے پیش کیا ہے۔ جلا وطنی کے مصائب، سفر کی صعوبتیں اور قسمت کی نیرنگیوں کے ذکر میں زبان کے لہجہ اور آہنگ کا پورا خیال رکھا ہے۔ قصے میں باوقوف انفلتات عناصر کی بھرمار ہے۔ ان میں سے فیضی نے چند واقعات حذف

کر دیے تھے۔ احمد سراوی نے بھی بعض ڈبلی حادثات چھوڑ دیے ہیں اور اپنی مثنوی میں صرف انھیں غیر عقلی واقعات کو لیا ہے، جو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً ان کے ہاں پوری مثنوی میں دمن کی اڑدہ سے بات چیت اور حاسد دیوتاؤں کا قل کی شکل اختیار کرنا دو خیالی واقعات ہیں۔ احمد سراوی نے اختصار پر بالخصوص نظر رکھی ہے۔ یہ مثنوی کل ۹۰ صفحات میں بیان ہوئی ہے اور ہر صفحے میں ۱۸ سطریں ہیں۔ غیر ضروری واقعات سے بچنے اور طوالت سے دور رہنے کی بدولت قصے کے تسلسل میں فرق نہیں آتا اور مثنوی میں جاہلیت قائم رہتی ہے۔ شاعر کہیں کہیں اوصاف حمیدہ یا زندگی کے نشیب و فراز پر چبھتے ہوئے انداز میں اشارہ کر جاتا ہے۔ مثلاً قل جلا وطنی کے زمانے میں راجا رتھن کے ہاں ملازم ہے، تو وہ سرخ رساں برہمن سے باتیں کرتے ہوئے دوستی اور وفا شعاری کے بارے میں اپنے دل کا راز یوں دے جاتا ہے:

اوم ہے عزیز ذات تیری	مصری کی ڈلی ہے بات تیری
جس یار میں کچھ وفات ہووے	وہ پھول ہے پاس ناگ سووے
جو یار پہ گر پڑیں پہاڑاں	کب سوئیں اوداس یار یاراں
ہاں یار کو یار کا گلا کیا	البت میں جدائی اور ملا کیا
جو یار کو ایک یار جانے	اپنے وہ پرانے کب بکھانے

قل دمن کی دوبارہ ملاقات اور سلطانہ اجمین حاصل کرنے کے بعد احمد سراوی بھی فیضی کی طرح قل کو جاو و منصب سے بیزار ہوتے ہوئے دکھاتا ہے۔ اس کے بعد کے چند لورائق نصف میں نہیں۔ موجودہ حالت میں مثنوی کا خاتمہ خزاں کے بیان پر ہوتا ہے۔ خزاں کی یہ کیفیت بہار زندگی کی بے ثباتی اور ناپائیداری کی علامت ہے:

اب باد خزاں چلی چوں اور پت جہز کا بن میں پڑ گیا شور

سب باغ و چمن اجلا کیناں بلبل کا مکاں کنوؤں کو دیناں
سبزہ کی شکل نظر نہ آوے ہر باغ کو دیکھ کر ڈر آوے
قل ہو کے لو اس اپنے من میں آ بیٹھا او اس ہو چمن میں
را بیل نہ موتا نہ لالا سب باغ ڈالا (۲۵)

مثنوی قل دمن کہت

میر نیاز علی کہت کی مثنوی کا نسخہ راجپور ناقص الاخر ہے۔ اس میں سال تصنیف کہیں درج نہیں۔ شروع میں چند اشعار نواب احمد علی خاں والی راجپور کی مدح میں ہیں۔ نواب موصوف کا سنہ وفات ۱۲۵۶ھ ہے۔ اور کہت کا انتقال اس کے گیارہویں برس بعد ۱۲۶۷ھ میں ہوا۔ غرض یہ مثنوی ۱۲۵۶ھ سے پہلے لکھی گئی ہوگی۔ اس کی کوئی مطبوعہ روایت ہماری نظر سے نہیں گزری۔ کہت، شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔

اس مثنوی کے پہلے ۱۱۳ اشعار حمد و نعت میں ہیں۔ اس کے بعد تخریبِ عشق ہے اور پھر قصے یوں شروع ہوتا ہے:

تھا کشور ہند میں کوئی شاہ مشہور تھا مای سے وہ تاماہ
والی تھا وہاں کا وہ نکو بخت تھا اوس کا اوچین پایہ تخت
رستم سے دلیر فن المثل تھا مشہور جہاں میں نام قل تھا

کہت نے قصے کو پوری تفصیل سے نظم کیا ہے۔ زبان زیادہ صاف نہیں لیکن قصے کی دلچسپی میں مزاحم نہیں ہوتی۔ جنگل میں قل، و سلتی کو چھوڑتے ہوئے سوچتا ہے:

جب لالہ کنار اوس کو دیکھوں کیونکر سر خار اوس کو دیکھوں
لیکن یہ صلاح ہے ہفت جوں بخت اسے چھوڑ جاؤں خفت

پلوے کی نہ مجھ سے خستہ تن کو اپنی چلی جائے گی وطن کو

کی تل نے دو نیم اوس کی چادر لی آدھی اور آدھی چھوڑ دی تن پر
اوس نیم سے کر کے پردہ تن لی رادو فرار جنگل و بن

نکبت نے راحت کی طرح قصے کو ابواب میں تقسیم نہیں کیا۔ تمام مطالب مربوط بیان کر دیے ہیں۔ مشنوی میں تقریباً نصف قصے کے بعد کے اوراق نہیں ہیں۔ جنگل میں سانپ کے کانٹے سے تل کی شکل و صورت ہونے کی سی ہو جاتی ہے اور وہ ملازمت کے لیے راجا رتھن کے پاس پہنچتا ہے۔ آخری شعر یہ ہے :

بس تل کو بھی لے گئے وہاں پر سلطان کی تھی بارگاہ جہاں پر (۳۶)

مشنوی تل دمن راحت

بھگونت رائے راحت، کاکوری کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد منشی دین دیال ریکس شہر تھے۔ راحت کو آغا حسن امانت لکھنوی سے تلمذ تھا (۳۷) اور فن سخن میں اچھی مہارت حاصل کر لی تھی۔

دہلی پر شاہ بدشاہ مؤلف تذکرہ آثار الشعراء ہندو کا بیان ہے کہ بھگونت رائے راحت کاکوری آغا حسن امانت لکھنوی کے شاگرد تھے۔ (۳۸) لیکن قاضی عبدالودود صاحب اسے تسلیم نہیں کرتے۔ ان کی رائے میں : ”اس راحت کا شاگرد امانت ہونا خلاف قیاس ہے۔“ (۳۹) حالانکہ دیوان امانت میں ایک غزل ایسی ملتی ہے جس میں امانت کے بچوس شاگردوں کے مختص آگئے ہیں۔ ایک

۳۶ مشنوی نکبت، قلمی، حوالہ ماسبق

۳۷ تذکرہ آثار الشعراء ہندو، بدشاہ، ص ۶۳

۳۸ آثار الشعراء ہندو، ص ۶۳

۳۹ مکتوب نظام مؤلف

شعر میں راحت کا تخلص بھی موجود ہے:

غم دوست ہے دل رنج سے راحت ہے جہاں میں
فرحت کا سر انجام ہے آزارِ لالت (۵۰)

مثنوی قل دمن کے علاوہ راحت نے محمد اکرم غنیمت کجھای کی مثنوی کا ترجمہ ”نگارستانِ راحت“ کے نام سے کیا تھا (۱۸۹۹ء) (۵۱) کجھای کی مثنوی کا نام ”نیر ملکِ عشق“ ہے۔ (۵۲) مثنوی ”زہرہ و بہرام“ اور مثنوی ”سوز عاشقانہ“ بھی ان کی تصنیف ہیں۔ فحشہ چلوید سے روایت ہے کہ راحت، واجد علی شاہ کے زمانے تک حیات تھے۔ غدر کے بعد ان کا انتقال ہوا۔ (۵۳) سالِ وفاتِ راحت بقول خواجہ عشرت لکھنوی ۱۸۸۳ء ہے۔ (۵۴) راحت نے مثنوی بدہ مالتی اور مثنوی بوستانِ راحت بھی لکھیں۔ (۵۵) مثنوی بوستانِ راحت ۱۸۸۰ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوئی تھی۔ (۵۶)

مثنوی قل دمن کا ذکر اشپرا نگر نے فہرست کتب خانہ شاہانِ اودھ میں کیا ہے اور اس کا نام ”واستانِ راحت افزا“ بتایا ہے۔ (۵۷) حالانکہ لفظ ”واستان“ نام کا حصہ نہیں۔ اشپرا نگر نے مزہ تالیف ۱۳۲۹ھ لکھا ہے اور یہ بھی صحیح نہیں۔ مثنوی قل دمن کا سالِ تصنیف ۱۳۳۲ھ ہے جیسا کہ مثنوی میں مندرج تاریخ سے ثابت ہے:

-
- | | |
|----|--|
| ۵۰ | دعوانِ لالت، ص ۳۳ |
| ۵۱ | علومِ ہدایت، برائے شمس، ص ۳۰۱ |
| ۵۲ | اشپرا نگر، ص ۱۰۴، فہر ۳۱ |
| ۵۳ | فحشہ چلوید، جلد ۳، ص ۳۱۰ |
| ۵۴ | بدہ و شعر، ص ۶۱ |
| ۵۵ | ایضاً |
| ۵۶ | مکتوب ذاکر، دارالحدیث آرزو، نامِ راقم الحروف |
| ۵۷ | اشپرا نگر، ص ۷۳ |

ہوئی جب مشنوی تیار نکسر بندھا تاریخ کا دل میں تصور
مرے ہیں ایک مشفق کالی پر شاہ ہوئے اس مشنوی کو سن کے جو شاہ
مناہیت کر اسی دم غور فرما کہا ”یہ داستان ہے راحت افزا“

۱۲۳۳ء

ان کی مشنوی قل دمن اپنے زمانے میں خاصی مقبول رہی ہے۔ مطبع نول کشور اور
دوسرے مطابع سے اب تک اس کے بیسیوں ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ مؤلف
”مثنویات“ نے لکھا ہے کہ قل دمن مطبوعہ مطبع مجیدی اور نول کشور مطابع لکھنؤ کے
مثنویوں میں اسے تاج بہادر ساکن نوبت کی تصنیف بتلایا گیا ہے (۵۸) لیکن یہ صحیح
نہیں۔ اس سلسلے میں مولف مثنویات سے تسامع ہوا ہے۔ مذکورہ بالا مطابع میں
چھپی ہوئی قل دمن کا ترجمہ یہ ہے: ”قطعہ تاریخ طبع قل دمن اردو تصنیف
تاج بہادر متخلص بہ تاج ساکن محلہ نوبت، شہر لکھنؤ“:

طبع شد چوں ایں کتاب دل پسند گفت ہر کس طالب دجوابے او
تاج تدرخش جہت گفت دل ”ہست تختہ قل دمن اردو بگو“

۱۲۳۳ء

یہاں ”تصنیف“ قل دمن کے لیے نہیں بلکہ قطعہ تاریخ کے لیے آیا
ہے۔ اس قطعہ سے اوپر مؤلف نے جو تاریخ نظم کی ہے، اس میں لفظ راحت
موجود ہے، جس سے غلط فہمی کا امکان نہیں۔ عبدالغفور ندرخ نے بھی تذکرہ خن
شعرا میں تصریح کر دی ہے کہ یہ مشنوی بھگوت رائے راحت کی نوشتہ ہے۔ (۵۹)
راحت کی مشنوی کا قلمی نسخہ یا قلم اور بم اللہ الرحمن الرحیم سے
شروع ہوتا ہے۔ حمد کے بعد چند شعر ”در بیان توصیف مسالک ہندستان و مدح
راہ قل اور تک نشین ملک اوچین“ میں ہیں، ملاحظہ ہوں:

۵۸ مثنویات، ص ۳۱

۵۹ غن شعرا، ص ۱۷۵

جب نزہت فزا ہندوستان ہے کہ ہر شہر اس کا رنگیں بوستان ہے
غضب ہیں بت وہاں کے شرخ بھاک کہ ہیں زاہد کا دل لینے میں چالاک
دیا ہے حسن ایسا حق نے نکلیں کھل پا کو نہ پہنچے لعبت جیس
اگر اس جاگزر ہووے پری کا کرے اقرار اپنی بے پری کا
جب وہ ملک ہے روے زمیں پر نہیں کوئی ولایت اس کے ہم سر
صوت ہے مگر خلجہ بریں کا کہ ہے رتہ بلند اس سرزمین کا
ز بس ہے فتن میں وہ ملک نامی بجا ہے گر کرے کھٹاں خٹای
مثنوی ایک ہزار جیسے سو پیچتر (۱۶۷۵) شعروں پر مشتمل ہے جو خاتے
کے اس شعر سے ظاہر ہے :

گنی میں نے جو بیتیں کہہ کے بکسر
ہوئیں گنتی میں سولہ سو پیچتر

راحت کی مثنوی کھبت کی مثنوی سے کہیں زیادہ مقبول ہوئی اور کئی بار
مختلف مطابع سے شائع ہوئی۔ اس کے چھٹے مطبوعہ صفحہ ہماری نظر سے گزرے
ہیں، سب بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع ہوتے ہیں۔ راحت نے قصے کو ۳۳
ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر فصل کا عنوان فارسی میں قائم کیا ہے۔ سہیہ
تالیف کتاب کے ضمن میں راحت کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

جو دیکھا آج کل ہندی (۶۰) کا چرچا ہوا دل ایک دن مشتاق اس کا
کہ عشق مل جو ہے عالم میں مشہور کرے ہندی زبان میں اس کو نہ کور
اگرچہ فارسی میں سب بیاں ہے مگر طول اس کی ہر اک داستاں ہے
اشعار دل سے یوں میں نے جو پایا سخن کا جلد تر دریا بہایا

قصے کے لحاظ سے راحت اور کھبت کی مثنویاں ایک دوسرے سے بہت

مشابہ ہیں۔ دونوں نے سوائے ایک واقعے کے اصل قصے میں کوئی رنگ آمیزی نہیں کی۔ قل دہشتی کی رسم و رواج سامنے میں ہنس کا جو حصہ ہے، اسے دونوں نے قائم رکھا ہے۔ اصل قصے میں ہنس اپنی جان بچانے کے لیے قل کو دہشتی کے حسن و جمال سے آگاہ کرتا ہے۔ یہی ہنس دہشتی کے پاس جا کر قل کے اوصاف بیان کرتا ہے۔ لیکن نکتہ اور راحت کے ہاں قل کی "شورش جنوں" کا آغاز ایک خواب سے ہوتا ہے۔

نکبت:

لیکن مرے دل میں وہ ستم گر
کاکل کے ہوں بست دام سے میں
تھے جتنے کہ قل کے محرم راز
اک ان میں سے ہم جلیس بولا
ہے اک وہ پری دکن میں یعنی
ہارک کمر ہے نازک اندام
ماکل نہ ہو سومات پر وہ
بھڑا ہے پس گلوگرہ بند
غنیچہ ہے ابھی گل جوانی
پاس آنے نہیں دیا حیا نے

غمرہ کا گیا ہے بار خنجر
آگاہ نہیں ہوں نام سے میں
سب کرنے لگے در سخن باز
اس طرح در سخن کو کھولا
نازاں ہے بنا کے جس کو صانع
اس دھک چن کا ہے دمن نام
ٹھوکر بھی نہ مارے لات پر وہ
صندل میں ہے آہوی بیوند
پھولا نہیں ہارغ زندگانی
دامن کو نہیں چھوا صبا نے

راحت:

قضا نے آغوش ڈالا بلا میں
کہ اک شب پیش میں لیٹا تھا آگاہ
جب آدمی رات کا پھر وقت آیا
جب صورت کی اس دم نیند آئی

پھنسیا یعنی اک زلف دو تا میں
ہوا پیدا اسے غم خورہ ناخورہ
پکایک خواب نے آکر ستیا
کہ بیداری میں ہرگز کل نہ پائی

طال ایسا ہوا خاطر میں پیدا کہ اس دم سے ہوا الفت کا شیدا
 مہبتا کس پری کا ہے یہ افسوں ہوئی جس سے مری حالت دگرگوں
 شک چہر کا ہے کس نے زخم دل پر جو بے تابی نے آجی میں کیا گھر
 اٹھے جب گرم تر شعلے جگر سے خیال آیا محبت کے اثر سے
 کہا یہ سب حرارت عشق کی ہے اسی نے بے قراری مجھ کو دی ہے
 اسی نے دل کو سودائی بنایا اسی نے شور خاطر میں اٹھایا
 ہوئی تھی بس کہ پیدا بے قراری انھیں باتوں میں کافی رات ساری

اوجر دہشتی بھی خواب ہی میں تیز عشق کا شکار ہوتی ہے اور اس کے
 بعد "نمہ و پیام بدست مرغ" کا آغاز ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کجبت اور راحت
 دونوں غل دہشتی کے اس روایتی قصے سے متاثر تھے، جس میں ایرانی داستانوں کے
 انداز پر خواب کا افسانہ کر دیا گیا تھا۔ عشق کے آغاز کے بعد غل اور دمن میں جو
 خط و کتابت ہوتی ہے، راحت نے اس میں عشقیہ جذبات کی جی کھول کر دلا دی
 ہے اور انھیں پورے شاعرانہ لوازمات سے ادا کیا ہے۔

شادی کے بعد دونوں ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔ لیکن آخر وہ دن بھی
 آ پہنچتا ہے جس کے لیے حاسدوں کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ اس مقام کے بعد
 جلا وطنی اور بے سروسامانی کی کیفیت راحت نے بڑے دردناک اور نڈسوز
 حیرانے میں بیان کی ہے۔ زبان صاف، سادہ اور سلیس ہے اور درد و فراق کی
 کیفیت نے اس میں ہلکی سی تیزی پیدا کر دی ہے۔ ملاحظہ ہو، غل کے چھوڑ جانے
 پر دہشتی کی حالتِ زار:

نہ پلایا یار کو جس وقت باہم رہی آئینہ ساں حیرت میں ہدم
 کہا جی میں کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ اس گل کا نہیں بالکل پتا ہے
 کہاں جاؤں کہ مر دھوڑوں نشان اب خدا جانے گیا ہے وہ کہاں اب
 بھری ہر چند صحرا میں بہت سا نہ دیکھا اپنے بھٹوں کو کسی جا

ہوئی جب دھوڑ کے حیراں نہایت گلی کرنے تصور میں شکایت
کہ کیا وحشت ترے دل میں سائی جو کی اک بارگی مجھ سے جدائی
گیا جس دم نہ کیوں تجھ کو خبر کی فقط آرام پر اپنے نظر کی
تجھے واجب نہ تھا جانا دعا سے خبر کرنا تھا کچھ راہ و وفا سے
کہاں کی دشمنی مجھ سے نکالی جو خاطر مہر سے بالکل اٹھا دی
گیا ہے تو صمن سے ہو کے آزاد کیا سب عشق کا تاسوس برباد

دھوڑ کے بعد دوریہ میں دونوں کا سامنا ہوتا ہے۔ اڑوہے کے ڈسنے سے گل کی رنگت سیاہ پڑ چکی ہے اور وہ پہچانا نہیں جاتا۔ دمن قرائن سے گل کو جان بچتی ہے، لیکن پھر بھی تصدیق کے لیے اس سے سوال و جواب کرتی ہے۔ نظروں ہی نظروں میں دل کا راز کھل جاتا ہے اور برسوں کے گھجڑے ہوئے آپس میں ملتے ہیں:

دمن یک بارگی بو اس کی لے کر خوشی سے ہو مہنی بس تار و تر
کہا کیوں تن پہ چھائی ہے سیاہی کہا یہ ہے صبرِ غم کی گواہی
کہا ہے مظلوم غم پر کس لیے تنگ کہا ہے دل کی حیرانی سے یہ رنگ
کہا کس کارواں کے ساتھ آیا کہا ریگِ رواں کے ساتھ آیا
کہا کچھ یاد ہے سودا کا دیواں کہا ہے بیتِ ابرو کا مجھے دھیواں
کہا ہدم ترا کوئی کہیں ہے کہا اب غم سوا کوئی نہیں ہے
ہوئے جب خوب باتوں میں اشدے دلوں کے کھل گئے مضمون سارے
صبت میں ہوئے باطن میں یکساں نئے سر سے کیا پھر عہد و پیاں
خوشا وقتے و خرم روزگارے کہ یادے پر خور دلوں وصل یادے^(۶۱)

راحت نے سارا قصہ چار جزو میں بیان کر دیا ہے۔ تعداد اشعار ۱۶۷۵ ہے۔ انھوں نے کہیں بھی بیچ دے کر کہانی کو بلا ضرورت پھیلانے کی کوشش

نہیں کی۔ الفاظ کا انتخاب مناسب ہے۔ مرقع نگاری صاف ہے اور جذبات کے بیان میں اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ دل کی کیفیتوں کو پر خلوص پیرایے میں سادگی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ راحت کے تحفیل میں وہ زور اور زبان میں وہ قدرت نہیں کہ شعر سحر و ابجاز معلوم ہونے لگے۔ لیکن سادگی، صفائی اور حقیقت نگاری نے مثنوی میں اثر پیدا کر دیا ہے اور کہانی کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مثنوی اپنے زمانے میں خاصی پسند کی گئی اور بیسویں صدی کے اوائل تک بار بار چھاپی جاتی رہی۔

مثنوی قل و من کالی پر شاو

ہمارا خیال ہے کہ مثنوی قل و من از کالی پر شاو کوئی اصلیت نہیں رکھتی۔ بلوم ہارٹ سے تسامع ہوا ہے اور وہ بھگونت رائے، راحت کا کوروی ہی کی مثنوی کو غلطی سے کالی پر شاو سے منسوب کر گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قل و من راحت بیسویں پار مختلف مطابع سے شائع ہوئی اور اکثر نسخوں میں مصنف کے نام کی تصریح نہیں کی گئی۔ چنانچہ قل و من مطبوعہ مطبعہ مجیدی اور نثر المطابع لکھنؤ کے نسخوں میں اسے تاج بہادر ساکن نورست کی تصنیف بتایا گیا حالانکہ تاج بہادر نے فقط قطعہ ”تاریخ کہا تھا۔ اسی طرح ”کالی پر شاو“ کا نام بھی خود مصنف کے قطعہ ”تاریخ میں آیا ہے۔ کالی پر شاو مثنوی قل و من کے مصنف راحت کا کوروی کے دوست تھے اور انھوں نے مثنوی کو سن کر ”یہ داستان ہے راحت افزا“ کے الفاظ سے اس کی تاریخ لکائی۔ بلوم ہارٹ اس قطعہ تاریخ کو پڑھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ کالی پر شاو ہی مثنوی قل و من کے مصنف ہیں۔ یہ قطعہ ”تاریخ یوں ہے :

ہوئی جب مثنوی تیار نکسر بندھا تاریخ کا دل میں تصور
مرے ہیں ایک مشتاق کالی پر شاو ہوئے اس مثنوی کو سن کے جو شاو

عنایت کر اسی دم نور فرما کہ ”یہ داستان ہے راحت افزا“
۱۲۳۳ء

بلوم ہارٹ نے فہرست کتب برٹش میوزیم میں اس مشنوی کی تین اشاعتوں کا ذکر کیا ہے۔^(۶۲)

۱۔ لکھنؤ ۱۸۶۹ء صفحات ۳۶ ((۳) ۵۰ (۱۳۱۰۶ B. ۵۰))

۲۔ کانپور ۱۸۷۲ء صفحات ۳۶ ((۹) ۱۷ (۱۳۱۱۹ E. ۱۷))

۳۔ کانپور ۱۸۷۹ء صفحات ۳۶ ((۳) ۱۹ (۱۳۱۱۳ C. ۱۹))

ہمیں اس مشنوی کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ کتب خانہ انڈیا آفس، لندن میں اس مشنوی کے مندرجہ ذیل سات ایڈیشن محفوظ ہیں: دہلی ۱۸۳۵ء، لکھنؤ ۱۸۶۸ء، کانپور ۱۸۶۹ء، لکھنؤ ۱۸۶۹ء، کانپور ۱۸۷۲ء، میرٹھ ۱۸۷۵ء، لکھنؤ ۱۸۷۶ء۔^(۶۳) یہاں بھی بлум ہارٹ نے لکھنؤ ۱۸۶۸ء والے ایڈیشن کو کالی پرشاد سے منسوب کیا ہے، جو غلط ہے۔

دعائی کا بیان ہے کہ قل دمن کے مشہور قصے کو احمد علی نے نور میر علی ہنگالی نے بھی نظم کیا تھا۔^(۶۴) لیکن ہم اس کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کے جن کتب خانوں سے ہم نے استفادہ کیا ہے، وہاں ان کا کوئی نسخہ نہیں۔ یورپی کتب خانوں کی فہرستوں میں بھی احمد علی اور میر علی ہنگالی کی قل دمن کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

مثنویات شکستہ

شکستہ ہندوستان کا لاقافی قصہ ہے۔ اس کی شہرت و مقبولیت میں کچھ حصہ کالی داس کے سحر و اجاز کا بھی ہے، جس نے اسے زمان و مکاں کی قید سے

۶۲ بлум ہارٹ، کتب برٹش، ذیلہ ۱۵۳

۶۳ انڈیا مطبوعات، ص ۱۵۹

۶۴ قطعات، ص ۲۳

ہیش کے لیے بلند کر دیا۔ اصل قصہ مہابھارت سے ماخوذ ہے اور اس میں ہندوستان کے اولین راجا 'بھرت' کی پیدائش کی روایت بیان کی گئی ہے۔ اسی 'بھرت' ہی کی رعایت سے ہندوستان کا نام 'بھارت ورش' مشہور ہوا۔

قصہ

دھیت، ایک راجا، ایک دن شکار کھیلتے کھیلتے جنگلوں میں اپنے ساتھیوں سے چھڑ گیا۔ کنو رشی کی جھوپڑی کے قریب اس کی نگاہیں ٹکستلا سے دو چار ہوئیں اور پہلی ہی نظر میں وہ عشق کا شکار ہو گیا۔

ٹکستلا کنو رشی کی جھوپڑی میں رہتی تھی، لیکن وہ دشواستر کی بیٹی تھی اور اندر لوک کی حسین ترین اہرامیکا کے بطن سے تھی۔ اس کی پیدائش کے بارے میں روایت ہے کہ ایک دفعہ رشی دشواستر نے شدید ریاضت شروع کی۔ حتیٰ کہ راجا اندر کو اپنے سنگھاسن کے چھن جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ دشواستر کے زہد و اتقا اور ریاضت و عبادت کو ناکام بنانے کے لیے اندر لوک کی حسین و جمیل حور مہیکا کو حسین کیا گیا۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور دشواستر اور مہیکا کے وصال کا نتیجہ ٹکستلا تھی، جسے پیدائش کے بعد مہیکا نے جنگلوں میں چھوڑ دیا۔ یہاں پر ندے اس کی پرورش کرتے رہے۔ حتیٰ کہ کنو رشی اسے اپنی جھوپڑی میں اٹھالے گئے اور پال پوس کر بڑا کیا۔

ٹکستلا کے آسانی حسن کو دیکھ کر دھیت کا صبر و قرار جاتا رہا۔ اس نے ٹکستلا سے گندھ و میہ کی درخواست کی (جو طرفین کی رضامندی پر بغیر برہمنی رسومات اور لوازمات کے فوراً رچایا جاسکتا ہے) ٹکستلا نے اس شرط پر یہ درخواست قبول کر لی کہ ٹکستلا ہی کی اولاد تخت و تاج کی وارث ہوگی۔ راجا واپس جاتے ہوئے وعدہ کر گیا کہ وہ بہت جلد ٹکستلا کو محلات میں عزت و احترام سے طلب کرے گا۔

ٹکستلا راجا کی یاد میں دن دن رات کھوٹی کھوٹی رہنے لگی۔ ایک دن

درواسارشی کنو سے ملنے آئے، لیکن کھنڈلا کو ان کی پڑ پائی کا مطلق خیال نہ رہا۔ اس سوئے ادب پر درواسا نے بد دعا دی کہ اسے لڑکی! تیرا عاشق تجھے بھول جائے۔ بعد میں کہنے سننے پر انھوں نے یہ دلاسا دیا کہ دھینت انگوٹھی دکھانے پر کھنڈلا کو پہچان لے گا۔

کھنڈلا چونکہ ماں بننے والی تھی، مہینوں دھینت کی رولہ دیکھنے کے بعد آخر وہ اس سے ملنے کے لیے خود ہی روانہ ہو گئی۔ راہ میں ایک مقدس جگہ اس نے غسل کیا۔ لیکن شوی قسمت سے انگوٹھی پانی میں گر کے کھو گئی۔ کھنڈلا دربار میں حاضر ہوئی۔ دھینت پہچاننے کا بھی رولہ نہ ہوا۔ یہاں سے اس کی ماں مٹیکا اسے اپنے آشرم جنگلوں میں لے گئی جہاں 'بھرت' پیدا ہوا۔

حسن اتفاق سے وہ انگوٹھی ایک ماہی گیر کو ایک مچھلی کے پیٹ سے ملی، وہ اسے راجا کے پاس لے گیا اور انگوٹھی دیکھتے ہی دھینت کو کھنڈلا کی یاد آئی۔ غرض کھنڈلا اور اس کا بیٹا بھرت مملات میں بلائے گئے۔ یہی بھرت، دھینت کے بعد اس کا چائٹیں ہوا جس کی ولاد صدیوں تک ہندوستان کی حکمران رہی۔ مہابھارت میں عسکرہوں کی اسی نسل کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔^(۶۵)

کھنڈلا کے اس قبضے کو کالی داس نے مہابھارت سے ماخوذ کر کے سنسکرت میں ڈرامے کے طور پر لکھا تھا۔ ہندوستان اور یورپ میں اس کی بڑی شہرت ہوئی اور کالی داس کے متعدد ترجمے وغیرہ شائع ہوئے جو عام طور پر مل جاتے ہیں۔ ان میں سے کلکرسٹ اور ولیم کے ترجمے بہت مقبول ہوئے۔

کالی داس کے کھنڈلا نامک کا سب سے پہلا انگریزی ترجمہ ۱۷۸۹ء میں سر ولیم جونس نے کیا۔^(۶۶) دو سال بعد ۱۷۹۱ء میں سے اسے پروفیسر جی فورسٹر نے جرمن زبان میں منتقل کیا۔^(۶۷) A.L.Chezy کا فرانسیسی ترجمہ ۱۸۳۱ء میں

۶۵ مہابھارت، حوالہ ملاحظہ ۱۵۱

۶۶ ہنری آف دی سنکرت لٹریچر، اسے اسے سیکھلا، ص ۳

۶۷ اپنا ۳۱۷

شائع ہوا^(۶۸) اس کا شکر متن Ou Boechtling نے جرمنی میں مرتب کیا جو ۱۸۳۲ء میں منظر عام پر آیا۔^(۶۹) گنگولا کا صحیح ترین متن برلن یونیورسٹی کے پروفیسر Richard Pischel نے ہارورڈ اور نیگل سیرج کے لیے ۱۸۷۷ء میں مرتب کیا۔^(۷۰) انیسویں صدی میں ولیم مونیر کا ترجمہ یورپ میں بہت مقبول ہوا اور اس کا چھٹا ایڈیشن ۱۸۹۰ء میں لندن سے شائع ہوا^(۷۱) Edgren کا انگریزی ترجمہ نیویارک سے ۱۸۹۳ء میں چھپا۔^(۷۲) گنگولا کا سب سے اچھا انگریزی ترجمہ مشہور امریکن فاؤنڈیشن رائڈرز کا سمجھا جاتا ہے۔^(۷۳) گنگولا کے تراجم کے سلسلے میں Burkard^(۷۴) اور Cappeller^(۷۵)، Shenzler^(۷۶) اور Wilson^(۷۷) کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ ناروے کے ایک ماہر ہندیات Dr. Sten Konow نے یورپی زبانوں میں گنگولا کے تراجم کی تعداد گنوائی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ فقط جرمنی زبان میں گنگولا کا تیس بار ترجمہ ہو چکا ہے۔ اسی طرح فرانسیسی، ڈچ، لاطینی، پولش، سویڈش، ہسپانوی اور ہنگرین اسکالروں نے بھی اپنی اپنی زبانوں کو گنگولا کے تراجم سے مالا مال کیا ہے۔ روسی زبان میں اس کے چند حصوں کا ترجمہ مشہور تاریخ داں N. Karamzin نے ۱۷۹۲ء میں کیا تھا لیکن اس کا مکمل ترجمہ پروفیسر Alexei Putyata کا مرہون منت ہے، جو ۱۸۷۹ء میں ختم ہوا^(۷۸)

۶۸ مقدمہ شکوہ، قاری، علی امیر حکمت

۶۹ گنگولا، برلن ۱۸۳۲ء

۷۰ گنگولا، ہارورڈ اور نیگل سیرج نمبر ۱۶

۷۱ انسائیکلو پیڈیا امریکا

۷۲ ایضاً

۷۳ انڈین، پلی، ای، این جنوری ۱۹۶۰ء، ص ۸

۷۴ ایضاً

۷۵ ایضاً

۷۶ مقدمہ شکوہ، قاری، علی امیر حکمت

۷۷ ایضاً

۷۸ انڈین، پلی، ای، این، جنوری ۱۹۶۰ء، ص ۹

مشہور جرمن شاعر گوئٹے، اس شاہکار کے عاشقوں میں سے تھا۔ اس نے پروفسر فورسٹر کے جرمن ترجمے سے اس کا مطالعہ کیا ہے، جسے وہ اپنی ”زندگی کا عظیم ترین تجربہ“ کہا کرتا تھا۔ گھنٹلا کی تعریف میں اس نے مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:

Would'st thou the young year's blossoms and
the fruits of its decline,
And all by which the soul is charmed,
enraptured, feasted fed,
Would'st thou the Earth and Heaven itself in
one sole name combine?

I name thee, O Shakuntla! and all at
once said. (۷۹)

گھنٹلا کے قصے کو نیپالی میں ہری ہر آچار یہ دگت نے مہابھارت کے آدی پردے سے ترجمہ کیا۔ یہ کتاب بمبئی سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ (۸۰)
برج بھاشا میں کالی داس کی گھنٹلا کو سب سے پہلے نواج کبیشتر نے ترجمہ کیا۔ اس کے سنہ تصنیف کے بارے میں اختلاف ہے۔ گریرسن ”لاورن در ٹیکر لٹریچر آف ہندوستان“ میں لکھتا ہے کہ نواج دو آب کے علاقے کا برہمن تھا۔ اس نے ۱۶۵۰ء میں راجا چھتر سال بننے کے دربار میں اعظم شاہ کے کہنے پر گھنٹلا کا ترجمہ کیا۔ اس کے برعکس کاظم علی جواں، گھنٹلا نامک کے ہندوستانی ترجمے (۱۸۰۱ء) کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ نواج کبیشتر نے برج بھاشا میں گھنٹلا کا ترجمہ فرخ سیر (۱۹-۱۷۱۳ء) کے عہد میں ایک امیر مولے خاں بن فدا خاں کی فرمائش پر کیا۔ (۸۱)

۷۹ ڈاکٹر مہاجن وٹس لٹ (انگریزی) ”شکنتلا“ ص ۵۳، ڈی، ایل ایمر سخت

۸۰ ہندی، ص ۱۷۵

۸۱ علوم ہدث، صفحہ ۵۳، نمبر ۹۱

فارسی نسخے

- ۱۔ شکوہ یا خاتم مفقود (فارسی تخیل) ڈاکٹر ہادی حسن، دہلی ۱۹۵۶ء۔
تعداد صفحات ۳۳۔ (۸۲)
- ۲۔ شکوہ یا انگشت گمشدہ۔ ترجمہ منظور و منظوم از علی اصغر حکمت،
دہلی (۸۲)

اردو نثری نسخے

- ۱۔ شکستہ از کاظم علی جواں اور نقولال۔ سنہ تصنیف ۱۸۰۱ء سنہ اشاعت ۱۸۰۲ء (نثری ترجمہ از فواج) برائے فورٹ ولیم کالج کلکتہ۔ (بلوم ہارٹ، برائش کتب، فروریو ۱۶۳ نیز ضمیمہ، فروریو ۲۰۶، قلمی نمبر ۹۱)
- شکستہ (اردو) از کاظم علی جواں۔ اسے J.B. Gilchrist نے رومن رسم الخط میں مع ذیلی حکایات کے شائع کیا۔ کلکتہ ۱۸۲۶ء، کل صفحات ۱۹ + ۱۰۳ (۸۲)
- تیسرا ایڈیشن زیر اہتمام بیمن جی دوساجی، بمبئی ۱۸۳۸ء (۸۵)
- چوتھا ایڈیشن نکستو ۱۸۷۵ء، کل صفحات ۳۲ (۸۶)
- ۲۔ فراموش یاد از غلام احمد ابن غلام حیدر عزت (اشپرا نگر ص ۵۹۸)
- فراموشی یاد اردو مشق ہے، جس میں راجا دھینت اور شکستہ کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ اس کے ایک نسخے کا ذکر اشپرا نگر نے کیا ہے، جو کلکتہ سے ۱۸۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ تعداد صفحات: ۱۵۳، آغاز:
- ہزاروں شکر ہے اس بے نشان کا

۸۲ نیز ملاحظہ ہو "مجموعہ مقالات از ڈاکٹر ہادی حسن"، دہلی ۱۹۵۶ء، ص ۳۲۵۱

۸۳ یہ ترجمہ دہلی ہوئی دور سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا

۸۴ انڈیا مطبوعات، ص ۹۹

۸۵ اردو ادب، حضرت رحمانی، ص ۵۳

۸۶ انڈیا مطبوعات، ص ۹۹

- اشچرا نگر کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کٹلاگ کی تالیف کے وقت یعنی ۱۸۵۳ء میں اس شعوی کا مصنف غلام احمد، احمد کلکتہ میں بہ قید حیات تھا۔ (۸۷)
- ۳۔ کلکتہ از اختر حسین رائے پوری (از شکرست) ۱۹۳۳ء (بار دوم)
- ۴۔ کلکتہ از بیگم قدیہ زیدی (ڈراما) ۱۹۵۷ء
- ۵۔ کلکتہ (اردو نثر) از جواہر لال آگرہ ۱۸۷۳ء کل صفحات ۲۰۰ (۸۸)
- ۶۔ کلکتہ (اردو نثر) از حافظ محمد عبداللہ، آگرہ ۱۸۸۷ء صفحات ۸۸ (۸۹)
- ایڈیشن دیگر، آگرہ ۱۸۹۰ء (۹۰)
- ۷۔ کلکتہ (اردو ناول) مجبول المصطفیٰ، ابو الطحیٰ اسٹیم پریس، آگرہ، کل صفحات ۷۰
- ۸۔ کلکتہ (اردو ڈراما) از اکسیر سیالکوٹی، لاہور ۱۹۱۵ء (۹۱)
- ۹۔ کلکتہ ٹانگ (اردو) نوشیرواں جی مہربان جی آرام (۹۲)
- ۱۰۔ کلکتہ ٹانگ اردو، از پنڈت نرائن پرشاد جنتا بھاری (۹۳)
- ۱۱۔ کلکتہ (اردو ڈراما) از محمد ابراہیم محشر انہاوی (۹۴)

اردو منظوم نسخے

۱۔ شعوی رنکب گزار از مولوی سید محمد تقی۔ یہ کتاب نول کشور پریس سے شائع ہوئی تھی۔ اب نایاب ہے۔

۸۷	اشچرا نگر، م ۵۹۸، نمبر ۵۸۵
۸۸	اشچرا مطبوعات، م ۹۹
۸۹	ایضاً
۹۰	نورہ مطبوعات، جلد ۱، م ۱۳۵
۹۱	ایضاً، م ۱۳۲
۹۲	اردو ڈراما، عشرت رحمانی، م ۲۰۳
۹۳	ایضاً، م ۲۳۹
۹۴	ایضاً، م ۲۵۲

میں مثنوی غازیہ عشق از عنایت سنگھ (مملوکہ جناب مسعود حسن رضوی)
 ”مثنوی غازیہ عشق“ المعروف بہ کلکتہ، مصنفہ کنور عنایت سنگھ عنایت
 رئیس لکھنؤ حلقہ ادبی بریلی، مطبع قیصری، بریلی، سال تصنیف ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۳ء)

ابتدائی اشعار:

باری کا ہے نام لب پہ ہر بار	جس سے یہ قلم ہوا علمبر بار
ہے مالک ملک بود و نابود	ہے جملہ جہانوں کا معبود
تقریر زبان نے اس سے پائی	تحریر قلم کے ہاتھ آئی
جسے میں بتوں کے حسن آیا	رنگیں طبعوں نے عشق پلا
دریا نے صدف، صدف نے گوہر	پائی مہر نے آب یکسر

ہے یہ گل غازیہ عشق نام اس کا ہے ’غازیہ عشق‘
 تاریخ بھی نام سے ہے پیدا سال اس میں ہے عیسوی ہویدا

ہوا ستر ایک تھے جو درویش	مرتاض، خدا شناس، حق کیش
جنگل میں وہ گوشہ گیر رہے	دائم تکلیف و رنج سہتے
سردی سے جب ان کو پالا پڑتا	سردا بے میں ہوتے جلوہ افزا
لہر آجاتی مزاج میں جب	کرتے دویا میں طاعت رب
گری میں جلا کے آگ جاوید	بیٹھے رہتے تھے پیش خورشید
تھے پارہ برف ان کو انگھر	جلا اس غم سے تھا سمندر
کچھ فکر نہ تھی یہاں وہاں کی	چھوڑیں سب نعمتیں جہاں کی
جنگل میں جو برگ و بار پاتے	رزاق کا شکر کر کے کھاتے

آخری اشعار:

خالق! ملے جس طرح یہ مجبور سب اپنی مراد سے ہوں سرور
سب پائیں جہاں میں نعمتیں چار ہے، چنگ، شباب، وصل و دہار
فرقت کا نہ پائے کوئی آزار چھوٹنے نہ کبھی کسی کا دہار
کر سب کی اسی طرح حمایت دائم ہو بشارت عنایت

تعداد صفحات = $1 + 93 + 8 = 102$

تعداد اشعار تحفینا = ۱۵۰۰ (۹۵)

عنایت سنگھ کی مندرجہ بالا مشنوی ۱۸۸۳ء میں ۱۰۱ صفحات پر بریلی علی سے شائع ہوئی۔ (۹۶)

۵۔ شکنتلا مظلوم از حکیم نور تاج، جناب بریلوی۔ انھوں نے کالی داس سے براہ راست اردو نظم میں آڑو ترجمہ کیا ہے۔ (۹۷)

۶۔ سافر نکھائی نے شکنتلا کے قصے کا مکمل ترجمہ ریڈیو ڈرامے کے طور پر آڑو نظم کیا ہے۔ (۹۸)

۷۔ مشنوی نیرنگ سحر۔ اقبال درما سحر پنجابی (۱۶-۱۹۱۰ء) زمانہ پریس، کانپور، صفحات ۸۳

۸۔ شکنتلا مظلوم از محمد فاروق، وحشت بریلوی (۵۱-۱۹۵۰ء) صفحات ۶۳۔

مشنوی نیرنگ سحر

اقبال درما سحر پنجابی کی اس مشنوی کے پہلے دو باب ۱۹۱۱ء میں رسالہ ادیب، لاہور میں شائع ہوئے تھے۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۱۶ء میں یہ زمانہ پریس کانپور سے مکمل شائع ہوئی۔

۹۵ بکریہ جناب مسعود حسن رضوی لاریب، ٹھٹھو

۹۶ انڈیا مطبوعات، ص ۱۵۳

۹۷ قلمی نسخہ مملوکہ مصطفیٰ، بہاری پور، بریلی

۹۸ قلمی نسخہ مملوکہ مصطفیٰ، دہلی

سحر نے یہ قصہ کالی داس کی ٹکنتلا سے اخذ کیا ہے۔ یہ مثنوی و شواہد کی ریاضت اور ٹکنتلا کی پیدائش کے بیان سے شروع ہوتی ہے۔ روایتی قصوں میں دھیمت اور ٹکنتلا کی پہلی ملاقات کا ذکر مختلف جہازوں میں آیا ہے۔ اقبال درما سحر نے بھی اس سلسلے میں رنگ آمیزی کی ہے۔ خود ان کا بیان ہے:

”یہ نظم قریب قریب بالکل میری طبع زلو ہے۔ اصلی ڈراما سنسکرت ٹکنتلا کالی داس کی تقلید صرف اس حد تک کی گئی ہے جہاں تک محض خاص واقعات سے تعلق ہے۔ نیز قصے کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے مجھے چند ابواب کا بطور خود اضافہ بھی کرنا پڑا ہے۔“

ٹکنتلا اپنی سہیلیوں سمیت باغ میں جلوہ گر ہے۔ ایک ہنودے کو ٹکنتلا کے چہرے پر کنول کا دھوکا ہوتا ہے:

اڑ کر ہنگامہ ایک بھورا	چہرے	ٹکنتلا کے پہنچا
بھاگی وہ دوسرے ہٹ گئی پھر	بھجکی،	قحقی سٹ گئی پھر
ہاتھوں کو چمک چمک اڑایا	آپٹل کو جھک جھک اڑایا	
آخر چلائی ڈار کے مجبور	سکھو دوڑو اسے کرو دوڑ	
پھر ہائے وہ دیکھو آرہا ہے	ناحق یہ مجھے ستا رہا ہے	

سکھیں مذاق میں کہتی ہیں کہ مظلوم کا فریاد رس تو راجہ دھیمت ہے وہی تری فریاد سن سکتا ہے۔ یہ سنتے ہی دھیمت کو جو قریب ہی سے یہ سب دیکھ رہا تھا، ٹکنتلا کے سامنے آنے کا بہانہ مل گیا:

پہنچا وہیں جو قحقی جائے امید وارد ہوا سنبھلے میں خورشید
پوچھا ”اے مہوشاں خوشرو! کیوں شور ہے، کون ہے جہا جو؟
”قانع ہوا کون آشتی کا؟ دھوئی ہوا کس کو سرکشی کا؟“

قصے کے انجام میں بھی بعد کو کئی رنگ آمیزیاں کی گئی ہیں۔ سحر کے

ہاں قصہ اصلی حالت میں نہیں ملتا۔ ان کی مثنوی گلزارِ نسیم کی بحر میں لکھی گئی ہے۔ زبان میں آورد کا رنگ نمایاں ہے۔ مطالب کہیں مبہم نہیں۔ لیکن اشعار میں شکستگی اور جزالت کم ہے :

وہ عجب نظارۂ پری رو یعنی ڈھیلے شاہ خوش خو
دیکھی جو وہ شاہِ حسنِ دل سوز الفت ہوئی دل میں آتش افروز
مفتون کھلتا ہوا وہ دلدادۂ دلربا ہوا وہ
آنکھوں سے نظر نے دل اڑایا خوش چشم کے بر میں جا چمپا
سحر نے مثنوی کو نو ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ہر باب رباعی سے شروع ہوتا ہے۔ کہیں کہیں غزل بھی آگئی ہے۔ خاتمے کے اشعار یہ ہیں :

بارے جو ہوئی سرا حاصل الماس رہا گھر سے واصل
کھتے تھے ہنسی خوشی سے اوقات دن عید تو شب برات تھی رات
سامانِ طرب جو تھے فراہم سب رہنے لگے خوشی سے باہم
تھا شاہِ بھرت وہ طفلِ خوش کام مشہور ہے جس کا آج تک نام (۹۹)

محمد فاروقِ وحشت بریلوی نے مہابھارت کو اردو نظم میں لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ کھلتا مظلوم اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ ابتدا میں بجائے حمد کے ”حضرت کرشن سے التجا“ کے عنوان سے ایک نظم ملتی ہے۔ وحشت نے قصے کے واقعات انگریزی ترجموں سے لیے ہیں۔ مثنوی کی صنف سے ہٹ کر انھوں نے مسدس کا چار ایہ اختیار کیا جو کامیاب نظر نہیں آتا۔ ہندو مذہبی ناموں اور اصطلاحوں کو ردوار کیا ہے اور کہیں غیر مقامی فضا پیدا نہیں ہونے دی۔ لیکن نظم ابتدائی کوشش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے اور شاعرانہ اعتبار سے پست ہے۔ (۱۰۰)

۹۹ مثنوی تیرک سحر، اقبال دہساکر دھکا، کان پور، ۱۹۱۹ء

۱۰۰ کھلتا مظلوم، حوالہ سابق

مثنوی ستیہ وان ساوتری

ستیہ وان اور ساوتری کا قصہ بھی مہابھارت سے ماخوذ ہے۔ رشی مادکٹے نے یہ قصہ راجا بدھشطر کو خاندانِ عورت کی صفات کے بیان میں سنایا تھا۔^(۱۰۱) قصے کا پلاٹ معمولی ہے۔ لیکن ساوتری کے کردار میں جو غیر معمولی ثابت قدمی، پامردی اور جرأت ہے اس کی بنا پر یہ بہت مقبول رہا ہے۔ ہندوؤں میں ہر سال ”برہماداس“ کے تہوار پر عورتیں اس قصے کو سنتی سنانی ہیں۔ اس کا مقصد عورتوں کو پاک پاڑی اور وقاشعاری کے اوصاف سکھانا ہے۔

ستیہ وان ساوتری کا قصہ دہوی بھاکوت پران کے اسکندھ ۹ (۳۸-۲۶) میں بھی ملتا ہے۔ اس کا ہندی ترجمہ جوالا پرشاہ مصرانے بمبئی سے ۱۹۰۲ء میں ”ساوتری پاکیمان“ کے نام سے شائع کیا۔^(۱۰۲)

یورپ میں اصل قصے کو Kellner نے مع مقدمہ لہرگ سے ۱۸۸۸ء میں شائع کیا۔^(۱۰۳) ستیہ وان ساوتری کے اسی قصے کو محمد عبدالعزیز قاضی اور محمد ابراہیم محشر انبالوی نے اردو میں ڈرامے کے طور پر لکھا۔^(۱۰۴)

جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے اردو میں اس قصے کو سوائے جگر بریلوی کے کسی اور نے نظم نہیں کیا۔ جگر بریلوی کی مثنوی کا نام ”پیام ساوتری“ ہے۔ (سال تصنیف ۱۹۳۰ء، سال طبع ۱۹۵۳ء) جگر نے اپنی مثنوی میں اصل قصے سے کوئی انحراف نہیں کیا۔

مثنوی کا موضوع عشق کی موت پر فتح ہے۔ ساوتری^(۱۰۵) کا کردار

۱۰۱ مہابھارت، حوالہ سابق ۲۹۳، ۳

۱۰۲ ہندی، ص ۲۳۳

۱۰۳ ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر، اے۔ اے۔ نیگلنڈ، ص ۲۳۵

۱۰۴ اردو ڈراما، حضرت رحمانی، ص ۲۳۸ اور ۲۵۲

۱۰۵ ساوتری، دیہ کے مقدس گائے اشلوک کو بھی کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات برہما کی بیٹی ست روپ کو بھی ساوتری کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ (ہندو میٹھلوی، جہاں و لکھو، ہندی ۱۹۵۷ء، ص ۲۹۱)

مشوئی کی جان ہے۔ ساوتری مدد و نیکس کے راجا اشوپت کی اکلوتی بیٹی تھی۔ دولہہ حسن سے بالا مال اور اخلاق و اوصاف میں لائق تھی۔ جب جہن ہوئی تو حسن نظر سوز کا یہ عالم تھا:

ملتی تھی چاندنی سحر میں	طلعتی تھی شباب کے اثر میں
یا پھول کوئی گلاب کا تھا	چہرہ کہ کنول کھلا ہوا تھا
کندن سا دک رہا تھا چہرا	یونہی سا وہ قد بدن سنہرا
بھونرا سا کنول کی پتھری پر	وہ آنکھ کا حسن روح پرور
نرگس کی تھی نیم دانگی آنکھ	وہ بار حیا کہ جبک مٹی آنکھ
گل ہار کی جیسے سرخ کلیاں	تھے لعل لب اس طرح نمایاں
تھا جسم لطیف صورت راز	تھا چہان وفا حیا کا انداز
ہر بات میں قد گھولتی تھی	جب لفظ لب کو کھولتی تھی
اک سوچ شراب اٹھ کے رہ جائے	رقدہ نسیم کو بھی شرمائے

سن و سال کو دیکھ کر ماں باپ کو مشوئی کی فکر ہوئی۔ ”بر“ کی تلاش میں ہر سمت بھاٹ اور برہمن بھیجے گئے۔ ساوتری کے حسن و جمال کا چرچا عام تھا لیکن اس کے جمال و جمال کی تاب لانے کی مجال کسی کو نہ تھی۔ حکم رہی یہی تھا چنانچہ:

بڑھتا جو چلا سن جوانی	عکس ہوئے راجا اور رانی
آخر پہ ہزار رخ و صد سوز	بیٹی سے کہا پدر نے اک روز
بوڑھا ہوں، ضعیف ہو گیا ہوں	مہمان میں صبح و شام کا ہوں
غم ہے ترے ہاتھ پہلے ہو جائیں	بھری کی میری دعائیں پھل لائیں
کس طرح کہوں کہ تو سفر کر	یہ ہمارے اٹھائے اپنے سر پر
حکمن ہے کہ تیر تھوں میں جا کر	پلنے تو سری نرود پاکر

باپ کے حکم کی تعمیل ناگزیر تھی۔ سمیلیوں کو ساتھ لیے راجہ میں
سوار سادتری سیر کے پردے میں شوہر کے انتخاب کے لیے گھر سے نکلی:

گزرے کچھ روز جب سفر میں ویرانوں میں کوہ و دشت و در میں
اک شام مہارک ایسی آئی پیغام خوشی کا ساتھ لائی
اور سادتری کی نظر ستیہ وان پر پڑی:

ہونوں میں وہ سر و قد کھڑا تھا پھولوں میں گلاب سا کھلا تھا
یوں جلوہ نما تھا رنگ ناہید دامن عشق میں جیسے خورشید
چکر میں شباب بس رہا تھا غنچے کھیل کھیل کے ہنس رہا تھا
اور پھر:

حیرت سے نظر ادھر اٹھائی وہ شمع جمال کچھ لہائی
دو چار ہوئیں نگاہیں ان کی نہریں ملیں شہد و شیر کی سی
چھڑی ہوئی روچیں قصیں مقابل ملتے ہی نگاہیں مل گئے دل

ستیہ وان شاہوہ کے راجادست سین کا بیٹا تھا۔ آشوب چشم کی وجہ سے
دست سین کی سلطنت جاتی رہی تھی، اور اب وہ جنگل میں تپیا میں مشغول تھا۔
سادتری جب گھر لوٹی تو سب احوال ماں باپ سے کہا۔ اتفاقاً وہاں رشی ہرودجی
موجود تھے۔ انہوں نے سادتری کے انتخاب پر افسوس کیا اور کہا:

اک سال کے بعد آج کے دن مر جائے گا ستیہ وان کم سن
مقدور کے سامنے کس کی چلی ہے۔ باپ نے سادتری کو پھر سے انتخاب
کرنے کو کہا۔ یہ آئینہ عشق سے فردر تھا۔ سادتری بول اٹھی:

وہ زر ہو کہ قول ہو کہ دختر واپس لینا ہے کوئی دے کر
دیکھا جب انھیں سمجھ کے شوہر رشتہ مرا ہو چکا مقرر

رشتہ ہے یہ میری جان کے ساتھ میں بک چکی ستیہ وان کے ہاتھ
بیاہوں گی کسی کو تو انھیں کو عمر ان کی زیادہ ہو کہ کم ہو

بالآخر شادی ہو گئی۔ جنگل میں ستیہ وان کے پاس آکر ساوتری نے شادی
لباس اتار پھینکا اور راج کمار کی پادلیوں کی کوئی شان باقی نہ رہنے دی۔ بظاہر وہ
انتہی بولتی، لیکن شوہر کی موت کی پیشین گوئی دل میں تیر کی طرح گڑی تھی۔
آخر کار وہ منحوس دن بھی آ پہنچا جب ستیہ وان کے مقدر میں مرنا لکھا تھا۔ سوز
عشق میں جل جل کر ساوتری کندن بن چکی تھی۔ ”ترکیہ“ نفس کے لیے وہ کئی
دن سے برت رکھ رہی تھی، چہرہ زرد تھا اور بدن زار۔ ستیہ وان امید من لانے
کے لیے گھر سے لگا ہے، ساوتری روک تو نہیں سکتی، خود بھی ساتھ چل پڑتی
ہے۔ جھٹ پٹے کا سماں ہے اور بہار کے دن اذور اذور تک شفق اپنا سونا لٹا رہی
ہے۔ ستیہ وان محبت کے بول بولتا ہے۔ ساوتری کے دل میں غم اور لب پر تبسم
ہے۔ انکھیل کرتے کرتے دونوں ایک مقام پر رک جاتے ہیں۔ ستیہ وان
درخت پر چڑھ جاتا ہے اور لکڑیاں کاٹنے لگتا ہے۔ اچانک اسے شدید درد سر ہوتا
ہے، لڑکھڑاتا ہے اور درخت سے نیچے آگرتا ہے۔ ساوتری کی آزمائش کا وقت
ہے۔ وہ سنبھلتی ہے اور شوہر کے سر کو زانو پر رکھ کے دبانے لگتی ہے۔ رات کا
اندھیرا بڑھتا ہے۔ ہولناک جنگل اور درندوں کی آوازیں دل دہلائے دیتی ہیں۔
لیکن ساوتری دل کو کڑا کر، آنکھوں میں سوز یقین کی شمع جلائے، وہاں جمی ہوئی
ہے۔ موت کا فرشتہ ستیہ وان کی روح قبض کرنے کے لیے آتا ہے، ستیہ وان کی
روح قبض کرتا ہے اور چل دیتا ہے۔ ساوتری سایہ کی طرح اس کا تعاقب کرتی
ہے۔ جم راج اس کو ٹوکنا ہے اور کہتا ہے۔ ”شوہر کے حقوق تم نے ادا کر دیے،
مٹی سے دل مت لگاؤ، واپس لوٹ جاؤ۔“ لیکن ساوتری جواب دیتی ہے :

زن پر جو حقوق شوہری ہیں وہ قید زمانہ سے بری ہیں
جس عشق کے رنگ میں وفا ہے اس عشق کا مدعا خدا ہے

چمکوں کی میں مقدر اپنا پاؤں کی ضرور شوہر اپنا
بیوہ ہو کر نہ جاؤں گی میں دنیا کو نہ منہ دکھاؤں گی میں

اس نقائصے کو ٹالنے کے لیے جم راج ساوتری کو سوائے شوہر کی حیات کے کوئی سی مراد مانگنے کو کہتا ہے۔ ساوتری خسر کی آنکھیں ماتحتی ہے۔ لیکن تعاقب سے پھر بھی باز نہیں آتی۔ اس پر یکے بعد دیگرے موت کا فرشتہ اس کی قین اور مرادیں پوری کرتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے: ساوتری سو بیٹوں کی ماں بنے گی۔ اس پر بھی ساوتری جم راج کا پیچھا کرنے سے باز نہیں آتی تو وہ مھلا اٹھتا ہے۔ ساوتری عورت کی پاک بازی اور نیک شعاری کے اوصاف بیان کرتی ہے اور کہتی ہے کہ جب تک ستیہ والن زندہ نہیں ہوتا، میں سو بیٹوں کی ماں کیسے بن سکتی ہوں۔ موت کا فرشتہ قول ہار چکا ہے، بے بس ہے اور ستیہ والن کی روح کو واپس کرتا ہے۔ اس طرح ساوتری کے جذبہ عشق نے موت پر فتح پائی اور حسن عمل سے اپنی، اپنے خاوند کی اور اپنے خسر کی تقدیروں کو بھی بدل دیا۔

پورا قصہ جگر بریلوی نے نہایت رہلا و عظیم، سلاست اور صفائی سے نظم کیا ہے۔ رواں دواں، گلغلتہ اور صاف و سلیس شعروں پر کہیں کہیں سحر و اچھاڑ کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ ساوتری کا کردار قصے کی جان ہے جس سے وقا شعاری اور پاک بازی کے اعلیٰ اوصاف کا پیام ملتا ہے۔

باب دوم

قدیم لوک کہانیاں

دکھنی مثنویاں

مثنوی کدم راؤ، پدم راؤ

اس مثنوی کا ایک ناقص مخطوط نصیر الدین ہاشمی نے لطیف الدین اوربکی کے پاس دیکھا تھا۔ انھوں نے اس کا تعارف سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۳۲ء کے مجلہ معارف میں کر دیا۔ مخطوط ناقص آخر ہے اور موجودہ حالت میں اشعار کی تعداد ۸۲۵ پائی گئی۔ مصنف نے مثنوی کے نام کی صراحت نہیں کی، لیکن کہانی چونکہ کدم راؤ اور پدم راؤ سے متعلق ہے، اس لیے اسی نام سے منسوب کیا گیا۔

مثنوی کے آغاز میں ایک عنوان ہے: "سلطان علاء الدین بھمنی نور اللہ مرقدہ" اس میں مجملہ دوسرے اشعار کے دو شعر یوں ہیں:

شہنشاہ بڑا شاہ احمد کنور پرتیال سینہار کرتار اوصار
دھنیں تاج کا کون راجا بھنگ کنور شاہ کا شاہ احمد بھنگ

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی علاء الدین کے انتقال کے بعد لکھی گئی۔ "شاہ احمد" جس کا نام ان اشعار میں آیا ہے۔ خاندان بھمنی کے گیارھویں حکمران علاء الدین ہی کا جانشین تھا اور احمد شاہ جالندہ بھمنی کے نام سے ۸۶۵ھ سے ۸۶۷ھ تک حکمران رہا۔ یہ مثنوی غالباً اسی کے عہد میں تصنیف ہوئی۔

نکھائی کے حالات کسی تذکرے اور تاریخ میں نہیں ملتے چونکہ مثنوی نامکمل ہے، اس لیے سنہ تصنیف اور سنہ کتابت کا بھی پتہ نہیں چل سکا۔ ناقص ہونے کی وجہ سے قصے کی تفصیل پیش کرنا بھی دشوار ہے۔

نصیر الدین ہاشمی کا بیان ہے کہ "مثنوی حمد و نعت سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد علاء الدین بھمنی کی مدح ہے۔ زبان قدیم ہے اور عربی و فارسی کی بجائے ہندی اور مقامی الفاظ کی بھرمار ہے، جس کی وجہ سے اس کا سمجھنا وقت

طلب ہے^(۱)۔ موصوف اسے اردو کی قدیم ترین مثنوی قرار دیتے ہیں^(۲) قصے کے مرکزی ناموں سے ظاہر ہے کہ نگاری نے اپنی اس مثنوی کی بنیاد کسی مقامی لوک روایت پر رکھی ہوگی۔ اس مثنوی کا ایک مخطوط انجمن ترقی اردو، پاکستان میں محفوظ ہے۔^(۳)

مثنویات طوطی نامہ

طوطی نامہ کا سلسلہ ”شک سب تھی“ ایک سنسکرت کتاب تک پہنچتا ہے جس کے معنی ہیں توڑنے کی کھی ہوئی ستر (۷۰) کہانیاں۔ سنسکرت میں اس کے دو نسخے موجود ہیں۔ ایک مفلح اور دوسرا سادہ و سہل۔ پہلا چٹا منی بھٹ سے اور دوسرا سوتیا بھر جین سے منسوب ہے۔ قیاس ہے کہ ان دونوں نسخوں سے پہلے شک سب تھی کا اصل نسخہ سنسکرت نثر میں ہوگا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کا بیان ہے کہ شک سب تھی کی ان ستر کہانیوں میں سے بیشتر ہندوستان کے قصے کہانیوں کے قدیم ترین مجموعوں سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً چٹا منی بھٹ نے بعض کہانیاں پاردن بھدر کے شیخ تیز سے لی ہیں۔ طوطی نامہ کا بنیادی حصہ رادھا چانک ۱۳۵ اور ۱۹۸ میں ملتا ہے۔ ان کے علاوہ شک سب تھی کے کچھ حصے چال بھنگی اور ہتوا پدیش سے بھی ملتے جلتے ہیں۔^(۴)

شک سب تھی کی یہ کہانیاں زیادہ تر عورتوں کی بد چلتی سے متعلق ہیں اور انسانی فطرت کی بعض بنیادی کمزوریوں کا پردہ قاش کرتی ہیں۔ سنسکرت کے علاوہ ہندی میں بھیروں پر شاہ، گجراتی میں سائل بھٹ، مراٹھی میں کسی نامعلوم مصنف اور مشرقی راجستھانی میں دیودت کے قدیم تراجم محفوظ ہیں۔ توڑنے کی

۱ دکن میں اردو، ص ۳۰

۲ جدید تحقیق کے مطابق اردو کی ایک اور قدیم مثنوی اشرف کی ”توسرہا“ ہے (مذہب تصنیف

۹۰۹ء) مخطوط اور فارسیات، ج اول، نمبر اول

۳ دکن میں اردو، پار چہارم، ص ۳۳

۴ گیان چند جین، اردو کی نثری داستانیں، ص ۶۰، ۵۰

کہی ہوئی یہ ستر (۷۰) کہانیاں یورپ اور دوسرے ممالک میں بھی بہت مقبول رہی ہیں۔ چنانچہ ترکی، انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، یونانی اور جاوی میں ان کے متعدد تراجم یا خلاصے شائع ہوئے ہیں۔ فارسی اور اردو کے نسخوں کو ملا کر طوطی نامہ کے نسخوں کی کل تعداد ۲۸ تک پہنچتی ہے۔ جیسا کہ ملحقہ نقشے میں واضح کر دیا گیا ہے۔ طوطی نامہ کے مختلف تراجم وغیرہ کا یہ نقشہ سب سے پہلے شمس اللہ قادری نے اردوے قدیم میں بطور ضمیمہ شائع کیا تھا۔^(۵) انھوں نے کل ۱۳ نسخوں کے نام گنوائے تھے۔ ان کے بعد مرتب طوطی نامہ، (شائع کردہ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات، حیدر آباد) نے اپنے نقشے میں چار مزید نسخوں کی نشان دہی کی۔ ڈاکٹر عیسان چند جین نے اپنی کتاب کے ضمیمہ نمبر ۳ میں طوطی نامہ کے نسخوں کی تفصیل پیش کرتے ہوئے، بلوم ہارٹ اور اچھے کی فہارس کی مدد سے نو مزید نسخوں کا اضافہ کیا۔^(۶) ملحقہ نقشے میں ان سب نسخوں کے نام پیش کیے گئے ہیں۔ علاوہ بریں دو اور نسخوں کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک جاوی زبان کا ترجمہ ہے جسے ملکہ اچھی (ساترا) نے نور الدین افریدی سے کروایا تھا۔^(۷) دوسرا سید محمد قادری (فارسی) کا اردو ترجمہ ہے جسے جیون رام نارنولی نے ۱۸۷۳ء میں شائع کیا۔^(۸) اس طرح طوطی نامہ کے خلاصوں اور تراجم کی کل تعداد ۲۸ تک پہنچ گئی ہے۔ ان کے علاوہ طوطی نامہ سے ملتے جلتے قصوں پر مبنی تین اور مشعوں کا بھی پتا چلا ہے، جن کی تفصیل آگے پیش کی گئی ہے۔

قصہ

اصل شک سب تہی تک دسترس نہ ہونے کی صورت میں اس قصے کی روایت ہندی شک بہتری سے پیش کی جاتی ہے، جو سنسکرت سے براہ راست

۵ شمس اللہ قادری، اردوے قدیم ۱۲۳، ۱۳۵

۶ تہزی و استانی، ص ۵۶۵

۷ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، جلد ۳، ص ۲۰۰

۸ بلوم ہارٹ، برٹش ضمیمہ، ص ۳۳۰

ترجمہ ہے۔

قصے کا ہیرو سینہ ہر دت کا لڑکا دن سین ہے۔ ہیروئن پر بھاتی ہے۔ دن سین راجا کے لیے جو اہر خریدنے جاتا ہے اور سات دن میں آنے کا وعدہ کرتا ہے۔ پر بھاتی کی وزیر زلوے سے آنکھ لڑ جاتی ہے اور ایک کٹنی کی معرفت ملاقات طے ہو جاتی ہے۔ جانے سے پہلے پر بھاتی مینا سے اجازت چاہتی ہے۔ مینا ذاتنی ہے، جس کی وجہ سے پر بھاتی اسے مار ڈالتی ہے۔ پھر توتے سے پوچھتی ہے۔ وہ اس شرط پر ایک کہانی سناتا ہے کہ وہ آج نہ جائے۔ اس طرح وہ روزانہ اس حیلے سے پر بھاتی کو روکتا ہے۔ جب دن سین واپس آتا ہے تو پر بھاتی خود بتاتی ہے کہ توتے نے اس کی عصمت بچائی۔ دونوں خوشی سے رہنے لگتے ہیں۔ تو تا ایک پہاڑ پر جا کر اپنا قالب چھوڑ کر گندھرب ہو جاتا ہے۔ اس طرح مینا بھی گندھرب ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں اصل میں گندھرب ہی تھے جو ایک رشی کی بددعا سے حیوانی قالب میں گرفتار ہو گئے تھے۔ روایت یوں ہے کہ ناردرشی نے توتے کے روپ میں یہ کہانیاں اندر کے دربار میں سنائی تھیں اور کہا کہ جو بھی انھیں سنے گا، اس کی سراویں بر آئیں گی۔^(۹)

فارسی نسخے

(۱) طوطی نامہ، ضیاء الدین نخعی (۷۳۰ھ) انھوں نے ایک قدیم فارسی نسخے سے ہاون کہانیاں مطلق فارسی میں لکھیں۔ یہ نسخہ ہالین لاہیری میں محفوظ ہے۔^(۱۰)

شیخ ضیاء الدین نخعی (المتوفی ۷۵۱ھ)^(۱۱) نے اپنے فارسی طوطی نامہ کے

۹ نثری داستانیں، ص ۶۰، ۶۱

۱۰ ہالین، ج ۳، صفحہ ۷۷، فبر ۲۵۱، برائے شیخ دیکر، بھان اللہ ص ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱

دیباچے میں لکھا ہے کہ ایک صاحب ان کے پاس طوطی نامہ کا ایک قدیم فارسی نسخہ لائے اور فرمائش کی کہ وہ اسے پھر سے لکھیں۔ کیونکہ قدیم نسخے کی زبان اولیٰ اعتبار سے بے مزہ تھی۔ چنانچہ شخصی نے ۵۲ کہانیوں کو ”تہ تکلف اور معنی فارسی میں لکھا۔ انھوں نے وہ کہانیاں جو ان کے نزدیک غیر دلچسپ تھیں، نکال دیں اور بعض دوسری کہانیوں کا اضافہ کیا۔“ (۱۲)

شخصی کے طوطی نامہ کا ایک ایڈیشن ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ (۱۳)

(۲) طوطی نامہ، شیخ ابوالفضل بن مبارک۔ انھوں نے شہنشاہ اکبر کی فرمائش پر شخصی کے لائق اور مشکل طوطی نامے کا وسط دسویں صدی ہجری میں سلیس فارسی میں خلاصہ کیا۔ (۱۴)

(۳) منتخب طوطی نامہ، نظم از حمید لاہوری۔ سنہ تصنیف ۹۹۸ھ۔ (۳۰ کہانیاں شخصی سے اور دو گلستاں سے) (۱۵)

(۴) طوطی نامہ، سید محمد قادری۔ انھوں نے بھی شخصی کی کتاب کا روزمرہ فارسی میں خلاصہ کیا (۳۵ کہانیاں) ۱۰۹۳ھ (۱۶)

سید محمد قادری کے فارسی طوطی نامہ کا ایک مطبوعہ نسخہ ادارۃ ادبیات اردو، حیدر آباد میں موجود ہے۔ کل صفحات ۸۳ اور سنہ طبع ۱۲۸۳ھ ہے۔ اس کے سرورق پر مصنف کا نام یوں درج ہے: ”نثر من تالیف سید محمد خدوعد قادری“۔ (۱۷) ہالین کے کنیلاگ میں بھی نام ”محمد خدوعد قادری“ بتایا گیا

۱۲ اسلام، جلد ۳، ص ۸۴۱

۱۳ مکتوب ڈاکٹر مختار الدین آزاد، نام راقم المعروف

۱۴ اچھے، نمبر ۷۵۴، یوزر ج ۷۵۴

۱۵ مخدوم سب خانہ دشتیہ، نام پور مکتوب ۱۰۸۲، یوزر ہالین نمبر ۳۹۰

۱۶ اچھے، نمبر ۷۵۴، یوزر ج ۷۵۴، ہالین ۱۹۷۵ اور ۲۰۲۸

۱۷ مطبوعات ادارہ، ۲، ص ۲۱۲

ہے۔ (۱۸) نیز اٹلیا آفس فار سی مطبوعات میں بھی ”محمد خداوند“ درج ہے۔ (۱۹)

(۵) طوطی نامہ، از عبداللہ، مطبوعہ ۱۳۸۲ھ (تقریباً ۵۴ کہانیاں) (۲۰)

(۶) بیت قلی خان حسرت تخلص شاگرد میر باقر حزیں اور مرزا مظہر

جان جاناں دہلوی (وفات ۱۳۱۰ھ) نے بقول فیطن کے ایک قصہ طوطی نامہ لکھا تھا۔ (۲۱)

(۷) ”چہل طوطی“ کے نام سے ایران میں چالیس افسانوں کا جو مجموعہ

مشہور ہے، وہ طوطی نامہ ہی سے ماخوذ ہے۔ (۲۲) ایسے ہی ایک مجموعے کو V. Zhu

Kovski نے St. Petersburg سے ۱۹۰۱ء میں شائع کیا تھا۔ (۲۳)

اردو نسخے

(۱) طوطی نامہ، خواصی، ۱۰۳۹ھ (ترجمہ از تخلص، ۳۵ کہانیاں) (۲۴)

(۲) طوطی نامہ، ابن نثا ملی۔ (ماخوذ از تخلص) دہاسی نے اس کا سنہ

تصنیف ۱۰۳۹ھ بیان کیا ہے۔ لیکن اسٹوارٹ کے بیان سے ۱۰۶۳ھ میں اس کا

تصنیف ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ (۲۵) یہ نسخہ غیر حقیقی ہے۔ دہاسی اور اسٹوارٹ سے

کہا ہوا ہے۔

۱۸	پولین نمبر ۱۹۷۵ اور ۲۰۲۸
۱۹	آدربی ۵۳۲، ۵۳۵
۲۰	کہان چہل بچہ، نثری داستانیں، ص ۵۶۰
۲۱	قاضی عبدالودود، صدائے عام، مئی نمبر ص ۱۹، بحوالہ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، ص ۲۷۹
۲۲	اسلام، جلد ۳، ص ۸۴۱
۲۳	ایضاً
۲۴	کتاب خانہ سالار جنگ میں خواصی کی مشہور طوطی نامہ کے دو قلمی نسخے چھ۔ (۱) نکتہ ۱۱۳۳ (ب) نکتہ ۱۱۵۰ ص ۵۸۹۔ برٹش میوزیم کے دو نسخے ۱۷۷۰ء اور ۱۷۷۲ء کے لکھے ہوئے ہیں (لوم ہارٹ نمبر ۵۴) (آصفیہ میں ایک نسخہ ۲۸۳۱۳) اشپراگر، ص ۶۰۸
۲۵	خس لکھ نادر، اردو سے قدیم، ص ۶۹

- (۳) طوطی نامہ، دکنی زبان میں، مصنف نامعلوم، ۱۱۳۲ھ (نثری ترجمہ) مخزنہ جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد اور برٹش میوزیم^(۲۶)
- (۴) طوطی نامہ، نسخہ ابوالفضل کی ابتدائی ۳۵ کہانیوں کا دکنی ترجمہ مع فارسی متن، مصنف نامعلوم (بارہویں صدی ہجری)^(۲۷)
- (۵) طوطی نامہ، حیدر بخش حیدری، ۱۲۱۶ھ (نثری ترجمہ از سید محمد قادری) یہ ترجمہ جان گل کرائسٹ کی فرمائش پر فورٹ ولیم کالج کے لیے کیا گیا۔^(۲۸)
- کتب خانہ اٹلیا آفس میں حیدر بخش حیدری کی طوطا کہانی کے ۱۸۰۳ء سے ۱۸۸۳ء تک کے سولہ مختلف ایڈیشن موجود ہیں۔^(۲۹)
- (۶) حکایات خن سنج، انبا پرشاد رسا ۱۸۴۵ء (نثری ترجمہ از حیدر بخش حیدری)^(۳۰)
- (۷) طوطا کہانی، مصنف نامعلوم (قادری سے ترجمہ دکنی میں) اوراق ۷۸، قبل ۱۲۲۰ھ^(۳۱)
- (۸) توتا کہانی، جیون رام نارولی۔ ۱۸۷۳ء (نثری ترجمہ از سید محمد قادری)^(۳۲)

۲۶	اردو سے قدیم، ص ۱۲۵ نیز بلوم ہارٹ نمبر ۸۵، جیسے مخطوطات، نمبر ۵۹، ص ۱۸۱
۲۷	بلوم ہارٹ برٹش، نمبر ۸۵، ص ۳۹
۲۸	حیدر بخش حیدری کی طوطا کہانی کا پہلا ایڈیشن نکلنے سے ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا دوسرا ۱۸۳۶ء میں اور تیسرا ۱۸۳۰ء میں نکلا۔ چوتھا ۱۸۵۲ء میں بمقام لندن ڈی۔ قادری کی نگرانی میں چھپا۔ برٹش میوزیم میں اس کتاب کے ۱۸۵۹ء (دہلی)، ۱۸۷۶ء (دہلی) اور ۱۸۶۳ء (کان پور) کے ایڈیشن بھی محفوظ ہیں۔ بلوم ہارٹ، برٹش کتب، صفحہ ۲۳۷ اور ۲۳۸، نیز ضمیر صفحہ ۳۳۰، قلمی نمبر ۹۳، صفحہ ۵۳ (کتب خانہ اٹلیا آفس میں حیدر بخش حیدری کی طوطا کہانی کے ۱۸۰۳ء سے ۱۸۸۳ء تک کے سولہ مختلف ایڈیشن موجود ہیں)
۲۹	اٹلیا مخطوطات، ص ۱۵۱ اور ۱۵۲
۳۰	یہ ۱۸۳۵ء میں دہلی سے شائع ہوا (معلومات ۱۳۲) بلوم ہارٹ، برٹش ضمیر، ص ۳۳۰
۳۱	مخزنہ دارالادب ارجا تہ اردو، فہرست جلد اول، ص ۴۴۳
۳۲	بلوم ہارٹ، برٹش کتب، ص ۲۳۷

اردو نثر کی اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ طوطی نامہ سے متعلق اردو میں فقط ایک مثنوی لکھی گئی ہے جو غواصی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔

مثنوی طوطی نامہ غواصی

غواصی کو سلطان عبداللہ قطب شاہ، (۸۳-۱۰۳۵ھ) کے زمانے میں عروج حاصل ہوا۔ مثنوی طوطی نامہ اسی بادشاہ کے عہد میں ۱۰۳۹ھ میں لکھی گئی۔ غواصی کو شاہی دربار میں بزار سوخ حاصل تھا اور اسے ملک الشعراء کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ طوطی نامہ کے علاوہ اس کی ایک اور مثنوی ”سیف الملوک و بدیع الجمال“ بھی حیدر آباد سے شائع ہو چکی ہے۔

غواصی کی مثنوی طوطی نامہ کے قلمی نسخے یورپ اور ہندوستان کے کتب خانوں میں عام طور پر مل جاتے ہیں، جن میں سے چند کی صراحت لوہ کر دی گئی ہے۔ یہ مثنوی ۱۹۳۹ء میں مجلس اشاعت دکنی مخطوطات، حیدر آباد نے میر سعادت علی رضوی سے مرصع کردہ کے شائع کر دی ہے۔ (تقدیر صفحات ۲۹۰)

غواصی نے طوطی نامہ کا بنیادی قصہ شخصی سے لیا ہے۔ لیکن اس میں کہیں کہیں حسب ضرورت تصرفات بھی کر دیے ہیں۔ خصوصاً مثنوی کا ابتدائی اور آخری حصہ غواصی کے زور تخیل کا پتا دیتا ہے۔ شخصی نے مسکرت کی ستر کہانیوں میں سے صرف ۵۲ کو فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ان ہادوں میں شک سب ترقی کے علاوہ چند کہانیاں براہ راست بلیج شوز، جتو پدیش، چٹال بچھیری اور جاکک سے بھی لے کر شامل کر دی گئیں۔ ایک آدھ کہانی پر فارسی بختیار نامہ اور الف لیلے کے قصوں کا بھی اثر ہے۔ غواصی نے شخصی کی ان ہادوں کہانیوں میں سے فقط ۳۵ کو اپنی مثنوی میں بیان کیا ہے۔

مثنوی کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد بادشاہ وقت سلطان عبداللہ قطب شاہ کی مدح ہے۔ سب تالیف بیان کرتے ہوئے غواصی کہتا ہے :

جو دل طوطی نامہ پو دوڑائیا مناسب مری عقل کے آتیا
 سواپ میں کیا مست بن سکی وہیں ہوا بعد ازاں نظم کے پے وہیں
 ہونے کیوں نہ عالم میں مشہور ہو نہ کیوں جاوے ملکہ ملک دور ہو
 کہ ہر بیت میں ہے سائیاں جدا ہر یک بات مہاے ہے مایا جدا
 نہیں داستان ہے یو ہے یوستان محب کیا جو خوش آتے ہووے جہاں
 کہ پانی میں اپنے کچھے کوں کر کیا اس نوے بالغ شاعری کوں تر (۳۳)

نواسی نے قصے کی تمہید یوں باندھی ہے: ہندوستان کے ایک دولہندہ اور حصول سوداگر کے ہاں بڑی منتوں، مرادوں سے لڑکا پیدا ہوا۔ جوان ہونے پر باپ نے اس کی شادی ایک نہایت حسین لڑکی سے کر دی۔ سوداگر کا چٹا ایک توتے اور بیٹا کو بہت عزیز رکھتا تھا، جو اسے عقل و دانش کے عجیب و غریب نکات سے آگاہ کرتے تھے۔ نوجوان کو تجارت کی ضرورتوں سے سفر درپیش آیا اور وہ دونوں پر وعدوں کو اپنی حسین بی بی کی نگہداشت میں چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ سوداگر کی واپسی میں دیر ہوئی۔ ادھر جوان بی بی کی کسی دوسرے سے آنکھ لڑ گئی۔ کٹنی کی معرفت ملاقات طے ہوئی۔ بیٹا نے سوداگر کی بی بی کو اس ارادے سے باز رکھنا چاہا تو ہلاک کر دی گئی۔ اس کے بعد سوداگر کی بی بی نے توتے سے مشورہ کیا۔ وہ بیٹا کا حشر دیکھ چکا تھا، کہنے لگا، میں تمہیں منع نہیں کرتا لیکن اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا، ورنہ تمہارا بھی وہی حال ہوگا جو فلاں رانی کا ہوا تھا اور پھر وہ اس رانی کا قصہ سنانے لگا۔ اس میں صبح ہو گئی۔ اس طرح توتے نے ۳۵ کہانیاں سنائیں۔ ان میں عورتوں کی مکاری، فریب دہی اور بد چلتی کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ آخری رات سوداگر کا چٹا واپس آگیا اور توتے نے اپنی آزمائی کا وعدہ لے کر اسے تمام حالات بتا دیے۔ نوجوان کو سخت رنج و افسوس ہوا۔ اس نے بی بی کو قتل کر ڈالا اور مال و دولت خیرات کر کے درویش بن گیا۔ سلطنت

قیسے میں یوں نہیں ہے بلکہ خود بیوی نے اپنے شوہر کو آکھ کیا کہ تو تے کی دانس مندی کی بدولت اس کی عصمت بچ گئی۔ تو تا رہا کر دیا گیا اور میاں بیوی دونوں خوشی سے رہنے لگے۔

ترجمہ در ترجمہ میں اصل کتاب کا رنگ بہت بدل گیا ہے۔ کرداروں کے نام تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ بعض جگہ ایرانی معاشرت کی جھلک بھی ملتی ہے۔ تو تا اسلامی مذہبیات سے واقفیت رکھتا ہے۔ مثنوی سے خواصی کے قادر الکلام شاعر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ انداز بیان سادہ اور تصنع سے پاک ہے۔ لیکن زبان قدیم ہے جس کی وجہ سے کہیں کہیں جھلک ہو جاتی ہے۔ خواصی زبانی قصوں کو زیادہ طول نہیں دیتا بلکہ مختصر طور پر انھیں مربوط شکل میں پیش کرتا ہے اور شاعرانہ لطافت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ مثال کے طور پر ستائیسویں (۲۷) کہانی سنئے :

آفتاب فروب ہوتے ہی سوداگر کی نوجوان بیوی فراق کی آگ میں جلنے لگی۔ تو تے سے مخاطب ہو کر بولی کہ اگر میں عصمت کا خیال کرتی ہوں تو جیتا عذاب معلوم ہوتا ہے اور اگر غیر مرد کے پاس جاتی ہوں تو عصمت پر داغ لگتا ہے۔ تو تے نے جواب دیا کہ مکاری اور فریب دہی سے عصمت کے داغوں کو بھی چھپایا جاسکتا ہے۔ جیسے قدیم زمانے میں ایک سوداگر کی بیوی نے کیا تھا۔ وہ چند کہیں کی طرح حسین تھی، اس کا شوہر بہت بڑا تاجر تھا اور گھر میں زر و جواہر اور مال و دولت کی کوئی کمی نہ تھی لیکن عورت بد چلن تھی اور غیر مردوں سے ناجائز تعلقات رکھتی تھی۔ ہوتے ہوتے تاجر کے کالوں میں اس کی بھٹک پڑی اور اپنی بیوی کو آزمانا چاہا۔ بیوی سے بولا :

کہیا ایک دن یوں کہ اے گل عذار نہ کر میں سفر کہیں ہوئے برس چار
ہوس ہے جو میں آج جاؤں سفر تماشا دیکھوں ہوہر پھروں بگردہ

لیکن یہ ایک چال تھی، وہ رات کو بیوی کے چنگ کے نیچے چھپ رہا۔ اس کی

بے خبر بیوی نے اپنے آشنا کو بلوایا اور اس سے راز و نیاز کی باتوں میں مشغول ہوا
 ہی چاہتی تھی کہ اس نے پٹنگ کے نیچے اپنے شوہر کو چھپا دیکھ کر معاملہ بھانپ
 لیا اور فوراً نہایت مکاری سے اپنے آشنا سے کہنے لگی:

کہ اے باپ ہو اے مرے بھائی آج میں یک کام تھے پاس تجھے لپائی آج
 بری آفک سوں مچ کدھن توں نہ دیکھ بنے یوں کج لے جو بنی ہوں ایک
 کہ میں مرد کی برہ لے ہو مذہمال ستی تھی دو چار آج انھو ذہمال ذہمال
 سو یک بھر مرد آکر پہنے سنے زبان کھول مچ سوں گھیا بولنے
 ترے مرد کی عمر تو سب سری حیات آج کے دن تھی اوس کی بھری (۳۴)

مکار عورت، خواب میں بھر سے یہ سن کر کہ اس کے شوہر کے دن
 پورے ہو گئے، اس سے پوچھنے لگی، کیا اس کے زندہ رہنے کی کوئی تدبیر بھی ہے۔
 بھر نے کہا:

اگر ایک بھر مرد سوں گھر منے بھا اپنے پاک بستر منے
 دے حرمت دیانت سوں بسلائے گی تو بیٹا ترا مرد کوں پائے گی (۳۵)

فرض بد چلن بیوی نے اپنے شوہر کو اس طرح چکھ دیا اور پٹنگ کے
 نیچے چھپا ہوا شوہر بھی اس کی باتوں میں آگیا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اپنی بیوی کی
 پاکدامنی، عصمت پروری اور وفا شعاری کا قائل ہو گیا اور اس نے بیوی کے آشنا
 کو اپنا بھائی بنا کر آئندہ کے لیے گھر آنے جانے کی اجازت دے دی۔

استدراک: صفحہ ۸۱ پر درج نقشے میں طوطی نامہ کی ۲۸ روایتوں کی نشان دہی کی
 گئی ہے۔ ان کے علاوہ دو مزید فارسی روایتوں کا ذکر اوپر کیا گیا۔ ذیل میں غیر ملکی
 زبانوں کے سات اور ترجموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس طرح طوطی نامہ کے تراجم

وغیرہ کی کل تعداد ۳ تک پہنچ گئی ہے :

۱۔ قصہ طوطی نامہ بزبان از ملا گل احمد تراشی، تعداد صفحات ۲۰، مطبوعہ دہلی ۱۸۷۹ء (۳۶)

۲۔ جرمن زبان میں نغضی کے طوطی نامہ کی آخوئیں شب کا قصہ مع فارسی متن H. Bockhaus نے لیزرگ سے ۱۸۴۳ء میں شائع کیا۔ (۳۷)

۳۔ جرمن زبان کا ایک اور ترجمہ H. Blatt کا مرہون منت ہے۔ انھوں نے قصہ سید محمد خداوند قادری کے ”طوطی نامہ“ سے لیا۔ یہ ترجمہ کوچین سے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ (۳۸)

۴۔ شک سب تھی کا ایک انگریزی ترجمہ Kiel نے ۱۸۹۳ء میں کیا جو Stuttgart سے ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا۔ (۳۹)

۵۔ طوطی نامہ بزبان چک، مطبوعہ پراگ

۶۔ طوطی نامہ نغضی کا مکمل روسی ترجمہ E. Berthels نے کیا ہے لیکن یہ ابھی شائع نہیں ہوا۔ (۴۰)

۷۔ میوزک میں طوطی نامہ نغضی کے ایک دو فرانسیسی ترجمے کا قلمی نسخہ موجود ہے، جو ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ (۴۱)

طوطی نامہ کے ترکی مترجم کا صحیح نام یوں ہے: صاری عبداللہ آفندی۔ (۴۲)

۳۶	انڈیا، پنجم ۸
۳۷	E. Berthels اسلام جلد ۳، ص ۸۴۱
۳۸	آربرٹ، ص ۵۵۵
۳۹	ہسٹری آف سلطنت لٹریچر، اے۔ اے، میکڈلڈ، ص ۲۵۰
۴۰	اسلام، جلد ۳، ص ۸۴۱
۴۱	ایضاً، لڑ طلیح احمد نظامی، رسالہ زبان نومبر ۱۹۵۱ء، ص ۲۸۸
۴۲	ایضاً

طوطی نامہ سے ملتی جلتی دوسری مشنویاں

مثنوی سوداگر کی بی بی

طوطی نامہ کے طرز کی چند اور مشنویاں بھی اردو میں دستیاب ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام ”سوداگر کی بی بی“ ہے۔ اس کا مخطوطہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ سنہ تصنیف ۱۱۶۳ھ، مکتوبہ ۱۱۷۰ھ اور ۱۱۷۲ھ، اور اوراق ۱۹۶۔ اس میں بھی ایک سوداگر کی بی بی اور اس کے معاشقوں کی داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ مصنف کا نام سید عبداللہ ہے۔ مختصص بہ قیاسی۔ آغاز:

قصہ کہتا ہوں مجب ہر سخن گوہر ساد کا کیسے کری ہے چہند او دیکھو تماشا نار کا
مصنف نے کتاب کے آخر میں سنہ تصنیف، اپنا نام اور مختصص یوں ظاہر کیا ہے:

اتحاسن ایگیارا سوچہ ست دے سال	بتاریخ ایگیارا او باو شوال
سیدی عبداللہ نے جو قصہ بنا	کیا خوش سہوار کشتن بنا
سیدی عبداللہ کر کے میرا ہی ناؤں	مختصص قیاسی مگر دال (?) ناؤں (۳۳)

مثنوی قصہ طوطا و مینا

از روشن علی۔ اس کا مخطوطہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس میں بھی قوتے اور مینا کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ آغاز:

نام خداوند بخشدا شنو شرح ایں قصہ بنددا

سنہ تصنیف ۱۱۸۸ھ (۳۴)

مثنوی قصہ طوطا مینا مشہور کتاب طوطی نامہ کا ترجمہ نہیں البتہ اس میں بھی پرندوں کی زبانی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ توتا عورتوں کی بد چلتی اور مینا مردوں کی بے وفائی کے واقعات سناتی ہے۔

مثنوی روشن میاں سوداگر اور ہمسودا

یہ مثنوی گجرات کے ایک شاعر جمال الدین کی تصنیف ہے۔ اس میں توتا کہانی سے ملتا جلتا ایک قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے اس مثنوی کے علاوہ جمال الدین کی تین اور مثنویوں — (۱) سکندر ذوالقلمین، (۲) قصہ شاہجہاں و روشن زحل اور (۳) قصہ عیسیٰ گوہر دا چھو گلاب کا تفصیلی جائزہ بھی نوائے لوہ بھٹی، جولائی ۱۹۵۳ء میں پیش کیا تھا۔ ہمارا ماخذ ڈاکٹر موصوف کا یہی مقالہ ہے۔

جمال الدین کا زمانہ بارہویں صدی کا نصف آخر بتایا گیا ہے۔ اس کی مذکورہ چاروں مثنویاں مطبع کریمی بھٹی سے ۱۳۱۳ھ میں شائع ہو چکی ہیں۔ مثنوی ”قصہ روشن میاں سوداگر اور ہمسودا“ آٹھ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں عورت کے تریاچہ ترکو نظر کیا گیا ہے۔ مثنوی سے سنہ تصنیف نہیں کھنڈہ قصہ یہ ہے :

ایک سوداگر روشن میاں کو اس کی بد چلتی بی بی نے تجارت کے بہانے سفر پر بھیج دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمائش کی کہ جب تک تریاچہ ترک نہ ملے، واپس نہ آئے۔ مدتوں کے بعد جب سوداگر گھر لوٹنے لگا تو اسے تریاچہ ترک کا خیال آیا۔ اس کی تلاش کے دوران میں سوداگر کا واسطہ ایک کٹنی ہمسودا سے پڑا جو اسے زمانہ لباس پہنا کر بادشاہ کے ہاں یہ کہہ کر لے گئی کہ اس عورت، روشن کنور کا خاندان میرے پاس اسے نقد رقم کے عوض رہن رکھ گیا ہے، لہذا جب تک وہ نہ آئے، اسے محل میں رکھا جائے۔ بادشاہ نے اسے اپنے وزیر گل فیل شیر کی بیوی کے پاس بطور مصاحب کے رکھوا دیا۔ وزیر شاہی کام کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا،

پہلی ہی رات روشن میاں کا راز فاش ہو گیا۔ لیکن وزیر کی بیوی کے پھمن بھی غراب تھے۔ اس نے روشن میاں کی اصلیت کو چھپائے رکھا۔ جب وزیر آیا تو اس کی بیوی نے اسے قتل کر کے دفن کر دیا اور یہ ظاہر کیا کہ اس کا خاوند روشن کنور کے ساتھ فرار ہو گیا ہے۔ اب کتنی ہمسودا روشن میاں کو ساتھ لیے بادشاہ کے سامنے فریادی ہوئی۔ آخر بادشاہ نے طے کیا کہ روشن میاں سے وزیر کی بیوی کا عقد کر دیا جائے۔ ہمسودا نے سوداگر روشن میاں کو تریاچہ تر کا ایک اور تجربہ بھی کر لیا اور اب کی بار بادشاہ کی بیٹی حبیبہ کے ساتھ اس کی شادی کروا دی۔ غرض ایک مدت کے بعد روشن میاں اپنی نئی بیگمات کو ساتھ لیے وطن واپس آیا۔ نئی بیگمات نے کہا کہ آؤ پہلے چل کر تھماری پہلی بیوی کا حال دیکھ لیں۔ یہ رات کو چوری چھپے گھر پہنچے تو بیوی کو ایک جھنڈی کے ساتھ دلو بھیش دیتے ہوئے پایا۔ روشن میاں نے جھنڈی کا سر کاٹ لیا اور لوٹ آیا۔ صبح اپنی بیوی کو بلا بھیجا اور اس سے کہا کہ بیوی، تھماری فرمائش پر میں ”قریبا چرترا“ لایا ہوں۔ یہ صندوق کھول کر دیکھ لو۔ بیوی نے صندوق کھولا تو اپنے آشنا جھنڈی کا سر پایا۔ کچھ برسوں کے بعد روشن میاں وفات پا گیا اور اس کی بیگمات نے بھی اس کی یاد میں گھل گھل کر جان دی۔

خاتے کے اشعار یہ ہیں :

شعباں کی چاند رات کو قصہ کے تئیں چورا کیا
سینو چھیں اے دوستان کر یو مرے حق میں دُعا
آخوند جمال الدین تو قصہ کے تئیں کردے ختم
احمد نئی کے نام پر بھیجو دروداں اور سلام (۲۵)

ایک مثنوی طوطی نامہ، جعفر علی حسرت سے بھی منسوب ہے۔ لیکن

۲۵ (اکثر طبع الدین دہلی، کبریات کی مثنویاں مطبوعہ نولے ادب جولائی ۱۹۵۳ء، ص ۱۸) یہ اشعار مثنوی کی بحر میں نہیں ہیں)

مشہور خاک سب تھی ہے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کا ذکر شمالی ہندوستان کی مشنوں کے ذیل میں آگے کیا جائے گا۔

مثنوی چندا اور لورک (چینا ستونٹی) خواصی

چندا اور لورک کے اس لوک قصے کو سب سے پہلے غلام دلاور نے بعد سلطان فیروز شاہ ۷۸۹ھ میں ”چندائن“ کے نام سے نظم کیا۔ اس کی زبان اور مٹی ہے۔ لیکن اسے فارسی رسم الخط میں لکھا گیا۔ مصنف نے یہ کتاب جو ناساہ وزیر اعظم فیروز شاہ کو پیش کی تھی۔

عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے اور اس کی حیرت انگیز مقبولیت کے بارے میں ایک روایت بھی نقل کی ہے:

”در ۷۸۲ھ خانجہاں وزیر وفات یافت و پسرش جو ناساہ نام بہاں خطاب مقامی گشت و کتاب چندائن را کہ مثنوی ست بزبان ہندوی در بیان عشق لورک و چندا نام عاشق و معشوق والحق خیلی حالت بخش است، مولانا دلاور بنام او نظم کردہ و از نہایت شہرت دریں دیار احتیاج تہذیب نمود و مخدوم شیخ تقی الدین واعظ رہائی در دہلی بعضی ابیات تقریرے اورا بر منبر میخواند و مردم را از استماع آن حالت غریبہ روی میداد۔ چوں بعضے افاضل آن عہد شیخ را پر سیدند کہ سبب اختیار این مثنوی ہندوی چیست؟ جواب داد کہ تمام آن حقائق و معانی ذوقیست و موافق بوجدان اہل شوق و عشق و مطابق بہ تفسیر بعضی از آیات قرآنی و خوش آواز این ہند۔ حالاً ہم ہمسوا خوانی آن سید و لہائی نمائند۔“ (۳۶)

غلام دلاور کی اس مثنوی کا ایک ناقص نسخہ خانقاہ منیر شریف (پنڈ)، ایک کالا بھون بنارس اور ایک لاہور میں ہے۔ سبھی میوزیم کا نسخہ نسبتاً زیادہ اوراق پر مشتمل ہے۔ ان سب کو کتابی صورت میں آگرہ ہندی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ شائع کر رہا ہے۔ (۳۷)

۳۶ منتخب التواریخ جلد اول، ص ۲۵۰

۳۷ ماسر ۶۶ ص ۶۵

اس قصے سے متعلق بھاشا کی دوسری روایت سادھن نامی ایک شاعر کی ہے، جس نے اسے ”میناست“ کے نام سے قلمبند کیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ خانقاہ منیر شریف پٹنہ میں محفوظ ہے۔ حال ہی میں یہ قصہ کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔

فارسی کی اولین روایت ”ملک الشعرا حمید“ کی ہے، جس نے اسے جہانگیر کے عہد میں نظم کیا۔ اس فارسی مشق کا نام ”مینا دلورک“ ہے اور اس کا قلمی نسخہ علی گڑھ یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اغلب ہے کہ غواصی نے اپنی دکنی مشق کا قصہ اسی فارسی روایت سے لیا ہو۔

غواصی کے علاوہ دکنی اردو میں اسے ایک اور شاعر مہدوی نے بھی بطور مشق نظم کیا ہے۔ اس کا نام بھی ”مینا دلورک“ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ بمبئی یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ کل اوراق ۲۳، آغاز:

سنیا ہوں کہ یک شہر کا تاجدار

دھری مال ہوہر مملکت ہے شہر (۳۸)

مشق دلورک چندا غواصی خاصی مشہور رہی ہے۔ اس کے پانچ نسخے کتب خانہ سالار جنگ (۳۹) میں اور دو انڈیا آفس میں (۵۰) ایک کتب خانہ آصفیہ (۵۱) میں اور ایک نسخہ انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے میں موجود ہے۔ (۵۲) انجمن کے فہرست نگار نے غلطی سے اسے کسی دکنی شاعر علی دھودی کی تصنیف بتایا ہے۔ انجمن کے نسخے پر کہیں سال تصنیف یا سال کتابت درج نہیں۔ غالباً یہ ۱۶۳۰ء (۱۰۵۰ھ) سے پہلے لکھی جا چکی تھی۔

یہ مشق بنوہ زبور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ اس میں مینا نامی ایک

۳۸ بمبئی نمبر ۳۵، ص ۷۷

۳۹ سالار جنگ، صفحہ ۵۹۱

۵۰ بلوم ہاؤس، انڈیا نمبر ۷۷ اور ۷۸

۵۱ آصفیہ جلد ۲ نمبر ۳۴۴، مشق اردو

۵۲ کتب خانہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ، قلمی مشق ۷۲/۷۳

خاتون کے ستونیت یعنی عصمت پرور رہنے کی داستان بیان کی گئی ہے۔ قصے کا خلاصہ یہ ہے:

بادشاہ بالاکنور کی بیٹی چندا ایک گوالے لورک نامی پر عاشق ہو گئی اور اس کے ساتھ فرار ہونے کا ارادہ کیا۔ لورک نے اول تو انکار کیا۔ کیونکہ اس کی اپنی بیوی ستونیت، سیرت و صورت کی خوبیوں سے متصف تھی، لیکن زر و جواہر کا لالچ نہ ہوتا ہے۔ آخر ایک دن وہ چندا کے ساتھ بھاگ گیا۔ بالاکنور نے اس کا انتقام لورک کی بیوی مینا سے لینا چاہا اور بذریعہ کھنی اس کے وصال کا طالب ہوا۔ مینا بڑی باعصمت تھی، راضی نہ ہوئی۔ آخر بار کر بالاکنور نے لورک کو خط لکھا اور اسے بلا بھیجا۔ چندا کو اس کے جرم کی سزا دی اور مینا کی عزت افزائی کی۔ مینا اور کھنی کی گفتگو میں کئی حکایتیں بھی آئی ہیں اور فصاحتیں بھی۔ مثلاً والدین کو چاہیے کہ بچوں کو نیک اور شریف عورت کا دودھ پلائیں، شریفوں کی صحبت میں رہیں، اچھی تعلیم دیں، اچھے شخص سے شادی کریں وغیرہ۔

مثنوی میں اول حمد و نعت ہے۔ پھر خلفائے راشدین اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح ہے۔ مصنف نے صراحت کی ہے کہ قصہ فارسی سے لیا گیا ہے۔ قصے کی نفا سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی میں اس قصے کی بنیاد کسی ہندوستانی لوک قصے پر رکھی گئی ہوگی۔ آغاز:

کروں حمد میں پاک رحمان کا کہ او حمد ہے زیور ایمان کا
جمع حمد اس کو سزاوار ہے کہ جس جگہ کوں پیدا کرن ہار ہے
خاتمہ:

ستر عیب اس کوں یو پاشت میں کتیں عیب اس میں دیکھیں تمیں
مرحب کیا یاں سے قصہ تمام جو یو لوئی پر درود و سلام (۵۳)

کنور منوہر اور مدھومالت

اردو میں جو ہندوستانی لوک کہانیاں مثنوی کے پیرائے میں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے ایک کنور منوہر اور مدھومالت کے عشق کا یہ قصہ بھی ہے۔ اس کی اصل کسی سنسکرت کتاب تک نہیں پہنچتی۔ خیال ہے کہ یہ قصہ ان لوک کہانیوں پر مبنی ہوگا، جنہیں قدیم زمانے میں کھٹک سنایا کرتے تھے۔ اولاً کسی شخص متجنم نے اسے ہندی میں لکھا تھا۔ یہ کتاب اب تک دستیاب نہیں ہوئی۔ ”دارڈ نے لکھا ہے کہ ایک کتاب مدھومالتی بے پوری بولی میں ہے۔“ (۵۳) مانڈا وہ بھی ہے۔ بعد کے ایک فارسی نسخے میں جو ۱۰۵۹ھ میں لکھا گیا ہے، مصنف نے وضاحت کی ہے کہ اس نے یہ قصہ شیخ متجنم کی ہندی کتاب سے ترجمہ کیا۔ (ملاحظہ ہو، رولسٹ اول، فارسی اور اردو نسخے)

متجنم کی ”مدھومالتی“ کا چونکہ ابھی تک کوئی مکمل نسخہ دستیاب نہیں ہوا، اس لیے اس کا سنہ تصنیف معلوم نہیں۔ رام چندر شکل کی رائے ہے کہ یہ سنہ ۱۵۵۰ اور ۱۵۹۵ کے درمیانی زمانے میں لکھی گئی ہوگی۔ ”مدھومالتی“ کا ذکر جاکسی نے ”پداونت“ اور عثمان نے ”چڑاولی“ میں کیا ہے۔ (۵۵)

قصہ

راجا بکرم کو دنیا کے تمام میث و آزام میسر تھے۔ لیکن اس کی رانی بانجھ تھی۔ ایک دن ایک فقیر نے اس بنا پر خیرات لینے سے انکار کر دیا کہ راجا لاولد ہے۔ راجے کے دل پر چوٹ لگی اور وہ راج پاٹ رانی کو وے کر جنگلوں میں چلا گیا۔ راہ میں ایک ہارن نظر آیا، جس میں ایک حوض تھا۔ یہاں پر

۵۳ تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی لاداسی، اٹھتہ اول، صفحہ ۳۹۹، علیحدہ تہرہ از کاخی

عبدالودود، سہاسر ۱۱، صفحہ ۱۱۹

۵۵ ہندی ساجیہ کا اچاس، ص ۹۱

نہانے کے لیے آئیں۔ راجا نے ان کا لباس چھپا دیا اور اسے واپس کرنے سے پہلے پریوں سے مدد کا وعدہ لے لیا۔ پریوں نے اسے اپنے ہال دیے، جنہیں جاننے پر وہ حاضر ہو جائیں گی۔ اسی جنگل میں راجا کو ایک سادھو ملا جس نے مراد پانے کے لیے بکرم کو ایک پھل دیا۔ بکرم نے گھر آکر وہ پھل رانی کو کھلایا۔ راجا کی امید بر آئی اور کنور منوبر پیدا ہوا۔ پنڈتوں نے بتایا کہ چودہ برس کی عمر میں اس پر بھاری چتا پڑے گی۔ قسمت کا لکھا ہو کر رہا۔ پریاں سوتے میں کنور کو اٹھالے گئیں اور کھاری مدھمالتی کے پہلو میں لٹا دیا۔ نظریں چار ہوتے ہی دونوں جبر عشق سے گھائل ہوئے لیکن آنکھ لگتے ہی پریوں نے انہیں پھر جدا کر دیا۔ اب بھر و فراق اور رنج و غم کا سلسلہ شروع ہوا۔ کنور منوبر، کھاری مدھمالتی کی تلاش میں وطن سے نکلا۔ مدتوں دشت و بیاہاں کے تلکے چننے، جھگڑوں اور طوفانوں کا مقابلہ کرنے، پریوں اور جنوں سے واسطہ پڑنے، پرندوں سے مدد لینے، ہزاروں میلوں کی مسافت طے کرنے اور قدم قدم پر ہمت و شجاعت سے کام لینے کے بعد کنور منوبر نے گوہر مقصود کو پایا۔ شادی کے بعد مراجعت ہوئی۔ کنور منوبر راجا بنا اور دونوں ہمیشی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

اجھے نے نمبر ۸۰۳ پر ”قصہ مدھمالت“ کے جس نسخے کا تعارف کرایا ہے، وہ اس روایت سے مختلف ہے، جس کا ذکر ریو نے نمبر ۷۰۰ اور ۸۰۳ کے تحت کیا ہے۔ انڈیا آفس کے نسخے کا سنہ تصنیف یا سال کتابت معلوم نہیں۔ یہ فارسی نثر میں ہے اور اسی قصے پر مبنی کسی فارسی مشوی سے ماخوذ ہے۔ بقول اجھے اس کے مآخذ میں وہ مشوی بھی ہو سکتی ہے، جس کا تعارف برٹش میوزیم کی فہرست میں ریو نے نمبر ۷۰۰ اور ۸۰۳ پر کرایا ہے اور جو سنہ ۱۰۵۹ میں لکھی گئی۔

فارسی اور اردو نسخے

فارسی:

۱۔ منظوم ”قصہ مدحیات“ سے تصنیف ۱۰۵۹ھ۔ یہ منظوم برٹش میوزیم میں غشی علی رضا کی بعض دوسری تصانیف کے مجموعے میں شامل ہے۔ مصنف نے صراحت کر دی ہے کہ اس نے قصہ شیخ تنہمن کی ایک ہندی کتاب سے لیا۔ (۵۶)

۲۔ ”منظوم مہر و ماہ“ از عاقل خاں رازی عالمگیری۔ سے تصنیف ۱۰۶۵ھ۔ اس میں بھی قصہ منوہر و مدحیات بیان کیا گیا ہے۔ رازی نے منوہر کو مختصر کر کے مہر کر دیا ہے۔ اس منظوم کے قلمی نسخے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں ہیں۔ (۵۷)

۳۔ منظوم کنور منوہر و مدحیات (فارسی) برٹش میوزیم میں اس منظوم کا صرف پہلا حصہ ناصر علی کے مجموعہ منظومات کے حاشیے پر درج ہے۔ (۵۸) اس کا مکمل قلمی نسخہ یوہار لاہور بری کلکتہ میں محفوظ ہے۔ ترقیے میں اسے شیخ نور محمد کی تصنیف بتایا گیا ہے۔ سال انعام ۱۰۵۹ھ اور اشعار کی تعداد تخمیناً ایک ہزار ہے۔ کل اور اق ۳۶ (۵۹)

- | | |
|----|---|
| ۵۶ | رج، م ۸۰۳، برائے شیخ دیگر آجھے، م ۸۰۳ اور پاؤلین، م ۱۳۱۸ |
| | آجھے نے نمبر ۸۰۳ پر ”قصہ مدحیات“ کے جس نسخے کا تصانیف کر لیا ہے وہ اس روایت سے مختلف ہے جس کا ذکر رج نے نمبر ۷۰۰ اور ۸۰۳ کے تحت کیا ہے۔ انڈیا آفس کے نسخے کا یہ تصنیف ۱۰ سال کتابت معلوم نہیں۔ یہ فارسی نثر میں ہے اور اسی قصے پر علی گشی فارسی منظوم سے ماخوذ ہے۔ بقول آجھے اس کے تحت میں ۷۰ منظوم بھی ہو سکتی ہے، جس کا تصانیف برٹش میوزیم کی کمرست میں رج نے نمبر ۷۰۰ اور ۸۰۳ پر کر لیا ہے اور جو سے ۱۰۵۹ھ میں تصنیف ہوئی۔ |
| ۵۷ | رج، م ۶۹۹، آجھے، م ۱۵۳۳، م ۱۶۳۶ اور م ۱۶۳۶، شیخ راگر م ۵۴۴ |
| ۵۸ | رج، م ۷۰۰، الف |
| ۵۹ | یوہار، م ۵۸۸، نمبر ۳۹۵ |

۳۔ ”مثنوی حسن و عشق“ از حسام الدین حساری۔ سنہ تصنیف ۱۰۷۱ھ (۶۰)

۵۔ میکاؤ منوہر از ماحو داس گجراتی سنہ تصنیف ۱۰۹۸ھ، مخطوطہ انڈیا آفس۔ (۶۱)

۶۔ قصہ بد حیات، مصنف نامعلوم۔ نثری مخطوطہ انڈیا آفس۔ (۶۲)

۷۔ پرباوتی و منوہر W. Pertsch کا برلن کینالاک (ص ۹۳۹) (۶۳)

۸۔ منوہر و بدالہ قلمی، (مثنوی فارسی) از اصغری (۶۴)

۹۔ مثنوی منوہر و بد حیات، قلمی (مجموعہ المصنف) مکتوبہ ۱۲۱۸ھ (۶۵)

اردو:

اردو میں اس قصے کو نصرتی نے ”گلشن عشق“ کے نام سے ۱۰۶۸ھ میں نظم کیا ہے۔ اس کے مخطوطات برٹش میوزیم (۶۶) پاولین لاہوری (۶۷) اور انڈیا آفس (۶۸) میں محفوظ ہیں۔

مثنوی گلشن عشق کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ نیچ سلطان میں بھی تھا۔ اس میں مصنف کی تصویر بھی شامل تھی، جس میں وہ بقول اسٹوارٹ ”معلم معلوم ہوتا ہے اور اسے دراز ریش دکھایا گیا ہے“۔ مثنوی گلشن عشق کے ساتھ

۶۰ بحوالہ عبدالحق، مقدمہ مثنوی گلشن عشق، ص ۱۱

۶۱ ایضے ۸۲۳، نیز پاولین ۳۷۸

۶۲ ایضے ۱۳۲۱

۶۳ بحوالہ پاولین، ص ۱۳۱۹

۶۴ اسٹوارٹ، فارسی مخطوطات، ص ۷۳

۶۵ آصفیہ، جلد ۲، ص ۱۳۹۰

۶۶ علوم ہدایت، برٹش فیر ۵ ص ۲۱

۶۷ پاولین، ص ۲۹۱، فیر ۲۳۲۰

۶۸ انڈیا فیر ۸۶، ۲۳۲۱، ۲۳۲۲، نیز اشپراگر ۶۳۰

اسی محفوظے میں ”مکھدستہ عشق“ کے نام سے مصنف کے قصائد اور غزلوں کا ایک مجموعہ بھی شامل تھا۔^(۶۹)

مشنوی گلشن عشق کے آٹھ قلمی نسخے کتب خانہ سالار جنگ میں اور پانچ اور ادبیات اردو حیدر آباد میں محفوظ ہیں۔^(۷۰) حال ہی میں (۱۹۵۳ء) یہ مشنوی پتھنجی و حواشی مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو، کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ موصوف نے اسے ایک قدیم نسخہ مکتوبہ ۱۰۹۳ھ کی بنا پر مرتب کی ہے۔ دہاسی نے لکھا ہے کہ میکھزی کے پاس بھی قصہ مہمالتی کا ایک نسخہ فارسی مع ہندوستانی تھا۔^(۷۱)

خواجہ عشرت لکھنوی کا بیان ہے کہ بھگونت رائے راحت کا کوردی مصنف مشنوی تل و من اردو نے ”مشنوی مہمالتی“ اردو میں بھی لکھی تھی۔^(۷۲)

مشنوی گلشن عشق

کنور منوہر اور مہمالتی کے قصے پر مبنی نصرتی کی یہ مشنوی اس کے لڑکے کارناموں میں لوناچا مقام رکھتی ہے۔ نصرتی کا پورا نام محمد نصرت تھا۔ اس نے تین عادل شاہی بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا اور بڑی عمر پائی۔ گلشن عشق کے علاوہ دو اور مشنویاں — علی نامہ اور تاریخ اسکندری اور غزلیات، قصائد وغیرہ کا ایک مجموعہ بھی اس کی تصانیف میں سے ہے۔ وفات ۱۰۹۵ھ۔^(۷۳)

نصرتی نے قصہ کہاں سے لیا۔ اس سلسلے میں اس نے کوئی صراحت نہیں کی۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ یہ قصہ اس نے اپنے ایک دوست مسکنی بنی ابن

۶۹ اشعار، ص ۷۹، نمبر ۳، ۴

۷۰ اردو ادبیات جلد ۵، ص ۳۱

۷۱ تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی اشاعت اول (مخلص لڑکاشی عبدالودود) معاصر، ص ۱۱۹

۷۲ ہندو شعراء، ص ۶۸

۷۳ عبدالجبار کلچر، ری، تذکرہ شعرائے دکن، ص ۱۰۹۰

عبدالصمد کی ترغیب سے لکھا ہے۔ مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ اگرچہ سب کہانیوں میں قصہ ایک ہے، لیکن ہر مصنف نے کسی قدر رد و بدل یا اختصار سے بیان کیا ہے۔ ان سب میں گلشنِ عشق بہت جامع اور ضخیم ہے۔ نصرتی نے اصل قصے میں چند ہفتی اور چند سین کی داستانِ ضمنی طور پر بڑی خوبی سے ملائی ہے۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ کس نے کس سے اس قصے کو لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں یہ قصہ بہت مقبول اور مشہور تھا اور ہر مصنف نے اسے اس طرح بیان کر دیا جیسا کہ مقامی طور پر مشہور چلا آرہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ عاقل خاں کو بھی قصہ دکن ہی میں ملا ہے۔ جب عالمگیر برہان پور میں تھا تو وہ بھی وہیں تھا اور غالباً وہیں اس نے اپنی مثنوی لکھی۔ یہ ممکن ہے کہ نصرتی کی نظر سے عاقل خاں کی ”مثنوی مہر و ماہ“ گزری ہو۔ اور اس نے تعریف کر کے زیادہ پُر لطف بنا دیا ہو۔ یا جس طرح اس نے اپنے وطن میں یہ داستان سنی ہو، اسی کو کسی قدر درست کر کے نظم کر دیا ہو۔ (۷۷)

عام لوک قصوں کی طرح اس قصے میں بھی فوقِ فطرت اور غلشی باتیں پائی جاتی ہیں۔ قصہ خالص ہندوستانی ہے اور مصنف نے اپنے ذاتی اعتقادات کی بنا پر اس میں کوئی رنگ آمیزی نہیں کی۔ اس مثنوی کی تہذیبی اہمیت تو ہے ہی، بعض خصوصیتوں کی بنا پر یہ مثنوی دکن کی بہترین لوہی مثنویوں میں بھی شہر کی جاسکتی ہے۔ مثنوی کی ابتدا حسبِ معمول حمد و نعت و مناجات سے ہوئی ہے۔ کچھ اشعار حضرت ہندو نواز کی تعریف میں ہیں۔ علی عادل شاہ کی طویل مدح ہے۔ چند شعر اپنے حسبِ حال ہیں۔ پھر عقل کی تعریف کی ہے اور قصہ شروع ہو جاتا ہے۔ عنوانات بھی شعروں میں قائم کیے ہیں۔ ہر شعر میں پورے باب کا خلاصہ آجاتا ہے۔ ان سارے شعروں کو اگر ملا دیا جائے تو ایک قصیدہ بن جاتا ہے۔ بعد کے شاعروں نے اس روش کی پیروی کی ہے۔ نصرتی کو قدرتی نگاروں کے بیان میں خاص قدرت حاصل ہے۔ ہندوستانی قصہ پھر ہندوستان ہی کے نگارے، جب

لطف پیدا ہو گیا ہے۔ سردی گرمی کی کیفیت، باغوں، پھولوں اور پرندوں چرندوں کا حال، کشمکش کی روانی، کھانوں، ترکاریوں، پکوانوں اور پھلوں کی تفصیل اور چاندنی کا سماں جگہ جگہ خوب بیان کیا ہے۔ مثنوی کے ہر باب کا خاتمہ اخلاقی اشعار پر ہوتا ہے۔ صہرتی کو انسانی جذبات کی کیفیت دکھانے میں بھی کمال حاصل ہے۔ یہ قول مولوی عبدالحق: ”مکالم میں طول ضرور ہے لیکن وہ ایک اُبلتا ہوا چشمہ ہے، جس کا روکنا مشکل ہے۔“ اس مثنوی میں ضمنی طور پر ہندوستانیوں کے آداب و اطوار، طعام، لباس اور شادی بیاہ کی رسموں کا جو ذکر آگیا ہے، بہت اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں اپنے وطن اور اس کے تہذیبی اُواروں سے کتنی گہری دلچسپی اور محبت ہے۔ ایک جگہ شادی کی مجلس میں راگ رنگ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مقام سے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں: (۷۵)

سرد و بخش مطربوں نے میٹھی تانیں	مطرب بخش مطرب جیسے تان اُچائیں
یعنی شروع کیوں اور گیانی لوگوں نے	سو گیانی بھاگیان سوزگن سے گائیں
گیان اور گن سے گانا بھانا شروع کیا۔	

ہزار ہا خدیجوں سے عاشق کا دل چھینے	ہزار ہا خدیجوں سے عاشق کا دل چھینے
والیاں تھیں۔	والیاں تھیں۔

جب وہ ناز و ادا سے ملتی چلتی تھیں	لکھتیاں چلیں صہب کی جب چاکسوں
تو جو بن کے بار سے ان کے قد خم	تھیں قد جو بن کے بار کے چاکسوں
ہو جاتے تھے۔	

جب بیٹھا سیلا راگ گایا تو سب میر	کیا یوں بیٹھا راگ تک رس بھرا
----------------------------------	------------------------------

ہر سہ سیر چند ہر چاند کی بھی محل کم ہو گئی۔
مالتی کا سراپا ملاحظہ ہو

سکھیں نرم کیس اس کے منقول سیام
اس کی زلفیں نرم اور سیاہ ہیں اور وہ
شہنشاہ زلفاں سوں بادل پہ دام
ان لمبی زلفوں سے بادل پر دام پھینکتی
ہے۔

سرنگ مانگ یوں جس میں دیوے شہر
ہوا پیا ہے جوں صبح صادق نمود
بالوں میں سیدھی مانگ یوں معلوم
ہوتی ہے جیسے صبح کے وقت پو پھٹ
رہی ہو۔

سدرگ دھار کھنڈے کی نامک نول
چپے کی کلی درد زو جس اگل
نازک ناک سیدھی تلوار کی طرح
ہے، جس کے آگے چپے کی کلی کا
حسن بھی ماند ہے

کلائی دیکھت نرم جس بات کچھ
کنول وال ڈوبے جھلوں جل کے بچ
نرم نرم کھائی پہ انگلیاں یوں معلوم
ہوتی ہیں جیسے پانی میں ڈوبی ہوئی وال
پر کنول کا پھول۔

دیے رنگ کا پیٹ نہ پیٹ ڈھال
بہتا نیر سوتس میں چوٹی کے بال
اس کی پیٹہ گنگا کے پیٹ کی مثل ہے
(جب پانی کم رہ جاتا ہے تو کہتے ہیں
کہ پیٹ نک ہے) مطلب یہ کہ اس
کی زلف کے بال جو پیٹہ پر بکھرے
ہوئے ہیں، مثل آب جاری ہیں۔

مثنوی ظفر نامہ عشق (قلمی) از سید مظفر تخلص بہ مظفر (۷۶)

شاعر کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ البتہ مثنوی سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف اورنگ زیب کے زمانے میں موجود تھا اور اس کے والد کا نام سید ایوب شاہ تھا۔

شاعر نے صراحت کر دی ہے کہ وہ فارسی قصہ ”مہر و ماہ“ دکنی میں ترجمہ کرنا چاہتا تھا تاکہ ایک ایسی یادگار قائم ہو سکے، جسے پڑھ کر عاشق بے قرار ہو جائیں۔ لیکن فارسی قصہ غلط لکھا ہوا تھا۔ اس لیے شاعر نے اسے اپنے ذوق کے مطابق صحیح طور پر نظم کیا۔ مثنوی کے متعلقہ شعر یہ ہیں:

وہا قصہ فارسی مہر و ماہ	منگیا کرنے دکنی سوں میں ترجمہ
موسے میں دل مجھ دیا یوں خبر	نہ کر ترجمہ فارسی کا ظفر
لکھا ہے غلط قصہ فارسی	تو پڑھ دیکھ دل ہے ترا آری
لکھا ہوں غلط قصہ سراپا صحیح	ہے معنی بلبل و مہارت فصیح
لکھا ہوں میں یہ قصہ میر و ماہ	مطالعہ کریں تا گدا ہو ر شاہ
رکھیا تو ظفر نامہ عشق نام	تجے عشق یاں عقل کا نہیں ہے کام

ان اشعار میں جس فارسی قصے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ غالباً عاقل خاں رازی کی فارسی مثنوی مہر و ماہ (۱۰۶۵ھ) ہے۔ اس مثنوی میں کنور منوہر اور مدح و مبالغہ کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہی کہانی تقریباً اسی طرح، جیسے اسے رازی نے نظم کیا ہے، چھ فارسی مصنفین اور ایک اردو شاعر (نصرتی) نے بھی بیان کی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی اسے غلط نہیں بتایا۔ خیال ہے کہ سید مظفر کو قصہ کنور منوہر اور مدح و مبالغہ کا ہندی رنگ پسند نہیں تھا اور وہ اسے اسلامی داستان کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ مگر ایسا کرنے کے لیے قصے میں بنیادی تبدیلیاں کرنا ضروری تھا، جن کے نتیجے کے طور پر سید مظفر کا قصہ کنور منوہر کی

اصل کہانی سے مختلف ہو گیا۔ چنانچہ اسے مستند اور معتبر تسلیم کرانے کے لیے اس نے عاقل خاں رازی کی روایت کو غلط قرار دیا۔ حالانکہ اس قصے کی صحیح روایت وہی ہے جو رازی کے ہاں یا معمولی اختلاف سے نصرتی کے ہاں ملتی ہے۔ سید مظفر نے قصے کے مقامی رنگ کو تبدیل کر دیا ہے۔ راجا کے بجائے بادشاہ، سادھو کے بجائے زاہد اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ راجا کی ابتدائی خشکیوں پر یوں کی مدد سے نہیں، بلکہ غیب کی آواز کے ذریعے آسان ہوتی ہیں۔ سترہ برس کی عمر میں شاہزادہ دریا کے سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ اسی سفر کے دوران میں وہ عشق میں مبتلا ہوتا ہے اور کامیابی کی منزل تک پہنچتا ہے۔

اس مثنوی کے دو ناقص نسخے کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہیں۔^(۷۷) ان میں سے ایک نسخہ ۱۳۲۰ھ میں لکھا گیا۔ اسی مثنوی کا ایک مکمل خطی نسخہ ۱۳۱۳ھ کا لکھا ہوا ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔^(۷۸) انھیں سید مظفر نے قصہ آفتاب بھی لکھنا شروع کیا تھا، لیکن مکمل نہ کر سکے۔^(۷۹)

مثنوی سندھ سنگار

دشاد علی گجراتی، مکتوبہ ۱۹۷۱ء، کتب خانہ پائیسٹر، ہندوستانی خطوطات^(۸۰)

مثنوی عود صندل

اس مثنوی کا خطوط انجمن ترقی اردو کے کتب خانے کی ملکیت ہے۔^(۸۱) دکنی اردو میں یہ خالص ہندوستانی قصہ ہے۔ مثنوی آخر سے ناقص ہے اور قصہ

۷۷ اپنا

۷۸ ادارہ ادبیات جلد ۵، ص ۳۹

۷۹ ادارہ ادبیات جلد ۵، ص ۲۰۲

۸۰ بحوالہ فائز نظام الدین احمد آرزو، معاصر نمبر ۵۰، ص ۷۲

۸۱ مثنوی عود صندل (فہمی) کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، صفحات ۸۵ / ۶۳

نا تمام ہے (اوراق ۸) مصنف نے بعض جگہ اپنا حلقہ امیری استعمال کیا ہے۔ مصنف کے بارے میں کوئی تفصیل حاصل نہیں ہو سکی۔ مشنری سے سال تصنیف بھی نہیں کھلا۔ زبان قدیم ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشنری شروع سترھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی ہوگی۔ سبب علم کتاب :

جلاؤں عود تیں اب ہاں آوے کجسوں صندل جو بک خنڈیک پاوے
جلے نہ عود اگر صندل گھسے نا کدر ہے کلی جوں گل خنڈے نا

ہندوستان میں ایک برہمن بادشاہ تھا اس کی بیوی نہایت حسین و جمیل تھی اور اس رعایت سے وہ صندل کہلاتی تھی۔ یہ برہمن زادی ایک نوجوان ”عود“ پر عاشق ہو گئی۔ چنانچہ :

نظر صندل کی جب ہوئی دیک پر عود گلی چلے اگر مانند ہوئی دود
اس کے بعد کے اوراق نہیں ہیں۔ آخری مصرع یہ ہے :

عجب بہانوں چلے مل صندل و عود

مشنری لعل و گوہر

قصہ لعل و گوہر کو حسین علی باشعہ سرکا ہنٹم نے فارسی میں نظم کیا تھا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ نیچے سلطان میں تھا۔ اسٹوارٹ کا بیان ہے کہ یہ ۱۷۷۸ء میں نیچے سلطان کو پیش کرنے کے لیے لکھا گیا۔^(۸۲) اس مشنری کا ایک محفوظ انڈیا آفس لندن میں بھی محفوظ ہے۔ سنہ تصنیف ۱۱۹۲ھ ہے۔ اس نے مصنف کا نام ”حسن علی عزت“ لکھا ہے۔^(۸۳)

اردو میں یہ مشنری ۱۱۲۹ھ سے قبل ایک دکنی شاعر عارف الدین خاں

۸۲ اسٹوارٹ۔ فارسی محفوظات، ص ۷۴

۸۳ اچھے نمبر ۷۱ء، ص ۹۳

عاجز (۸۳) نے لکھی۔ اس کا قصہ اندر سبھا کی طرز کا ہے۔ شہزادہ لعل بنگال کے بادشاہ زمر درد کا بیٹا تھا۔ ایک رات جب وہ سو رہا تھا تو لوہے سے پر یوں کا تخت گزر رہا پر یوں کے بادشاہ کی لڑکی گوہر شہزادے کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گئی۔ بچک اٹھوا منگولیا۔ مدتوں پریشان رہنے اور مشکلیں سہنے کے بعد آخر دونوں کی شادی ہوئی اور لعل، گوہر کو لے کر وطن واپس آیا۔

اس مثنوی کے مخطوطے یورپ اور ہندوستان کے کتب خانوں میں عام ملتے ہیں۔ (۸۵) یہ مثنوی مدراس سے ۱۸۷۳ء اور بمبئی سے ۱۸۷۷ء میں شائع ہو چکی ہے۔ (۸۶)

عارف الدین خاں عاجز کی مثنوی کا ایک قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، مکتوب ۱۲۳۱ھ، اور اوراق ۱۶ (۸۷) نیز ملاحظہ ہو، اشیرانگر ص ۵۹۹۔ آغاز:

الہی دے مجھے رنگیں بیانی (۸۸)

اس مثنوی کا ایک ایڈیشن مصطفائی پریس، مظفر نگر سے بھی شائع ہوا تھا۔ یہ ہماری نظر سے گزرا ہے۔ اس پر سال طباعت کہیں درج نہیں۔ مثنوی کا

۸۳ عارف الدین خاں عاجز، نورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ آصفی مہد میں فوج میں ملازم تھے۔ مثنوی لعل و گوہر کے علاوہ ایک دیوان بھی یادگار ہے۔ ۱۷۶۳ء (۸۷۱ھ) میں انتقال کیا۔ (ہندستان شعرا اور گل گلاب) دیوان کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ (فہرست مخطوطات اردو سالار جنگ۔ صفحہ ۶۳۶) نسخہ دیگر نادرہ ادبیات اردو، مخطوطہ نمبر ۱۲۸ پ

۸۵ بلوم ہارٹ اٹلیا نمبر ۱۱۰، مکتوب ۱۱۰۴۹ اور اوراق ۳۰ نیز نادرہ ادبیات نمبر ۵۸۳، آصفیہ میں تین اور سالار جنگ میں آٹھ مخطوطات محفوظ ہیں۔ سالار جنگ ص ۶۳۶

۸۶ یورپ میں دو مخطوطات ص ۵۲۵، ۵۲۹ نیز سالار جنگ، ص ۶۳۶

۸۷ نمبر ۲۶/۵۸۱

۸۸ اشیرانگر نمبر ۵۹۰ نیز گار سان، ۵۳۱، تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی جلد اول، ص ۱۶۹ اور ۶۱۹ بحوالہ بلوم ہارٹ اٹلیا نمبر ۱۱۰، استوارٹ، ہندی اور دکنی مخطوطات، ص ۸۰ نمبر ۱۲

نام بھی لعل و گوہر کے بجائے لال و گوہر لکھا ہوا ہے۔^(۸۹) شاعر کا نام سرور قی یا خاتمے پر کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ البتہ بعض اشعار میں عارف الدین خاں عاجز نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے:

اے عاجز یہاں تو لال کو چھوڑ سخن کے سنگ سے ہیرے کا سر پھوڑ

اے عاجز یہ کیا ہے گا نکمیزا کہ تو ہیرا کا پھر افسانہ چھیڑا

یہ مثنوی ۳۲ مثنویوں پر شائع ہوئی ہے اور ہر صفحے میں ۱۷ اشعار ہیں۔

اس مثنوی کے جتنے قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں ان میں خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے:

الہی عاشقوں کی آبرو رکھ انوں کوں دو جہاں میں سرخو رو رکھ^(۹۰)

لیکن زیرِ نظر مطبوعہ نسخے میں اس شعر کے بعد ”معرفت“ کے عنوان سے کسی

دوسرے شاعر کے ۳۲ شعر از انکہ ملتے ہیں۔ اس شاعر کا تخلص امین تھا جو یوں

استعمال ہوا ہے:

اٹھا اب تو اپنا قلم اے امین دعا اپنے خالق سے بس ہے یہی (کذا)

عاجز نے مثنوی کا خاتمہ عاشق و معشوق کی کامیابی اور کامرانی پر کیا

ہے۔ امین خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ دونوں میں ایک بار پھر جدائی ہو جائے۔

بہر و فراق کے ایسے ایسے صدے اٹھانے پڑیں کہ روح جسم سے الگ ہو جائے۔

قبر و حشر کے مراحل کامیابی سے ملے ہوں اور اس کے بعد ”قاضی حاجات رب

العلیٰ“ عاشق سے اس کا معشوق ملاوے اور دونوں کو بہت نصیب ہو۔ اس حالت

میں مثنوی کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے:

میں چاہوں ہوں جو در سے تیرے ملے مرا بھی کہیں فتنہٴ دل کھلے

۸۹۔ چشتیان شعر ۱: ”لعل و گوہر“ ص ۳۶۶، قلمی نسخہ نرود و حیات ”لال و گوہر“ جلد سوم ص ۱۷۶

۹۰۔ علامہ نرود و حیات ۳ ص ۱۷۷، برپ میں دکنی مخطوطات ص ۵۲۸، سالار جنگ ۶۳۶

ہوئی مشکوی اب (یہ) بالکل قدامت ترا شکر پیہر کو حیرے سلام (کنڈا)
عارف الدین خاں عاجز کا قصہ کلام یہ ہے :

گئی جب رات گھٹ گھٹ کر عدم سے کھلا غنچہ ضمیمہ محمد سے
جنگی گوہر نہ دیکھا یاد سونس اور آنکھوں کو جو کھولے مثل فرس
حکایت رات کی کر یاد روئی کہے میں نیند پا کر لال کھوئی

اس مشکوی کے قصے کو نوشیرواں جی مہربان جی آرام نے اردو میں
منظوم ڈراما کے طور پر لکھا ہے، جو بمبئی سے شائع ہوا۔ اس سے پہلے ڈھاکہ میں
یہ کسی دوسرے ڈراما نگار کے نام سے اسٹیج کیا جا چکا ہے۔ بعد ازاں آرام نے اس
کو اپنے نام سے حتمیل کیا اور طبع کر لیا۔^(۹۱) اسی قصے کو بنیاد بنا کر محمد مراد علی مراد
لکھنؤی شاگرد حسینی مہاں ظریف نے بھی ایک اردو ڈراما لکھا۔^(۹۲)

مشکوی نیہ درپن

یہ قصہ سید احمد بنر نے ۱۷۳۱ء (۱۱۴۳ھ) میں لکھا۔ بنر سید محمد عشرتی
کے فرزند اور سرکار آصفیہ کے منصب داروں میں شامل تھے۔ اس مشکوی کا
قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ بنر نے اسے ابن
نشاطی کی پھول بن کے جواب میں لکھا تھا:

مجھے ابن نشاطی کا سخن خوب لکھا دل میں بہت محبوب و مرغوب
کتاب اس کی جو ہے نام اس کا بھلن نزاکت کی ہے وہ گلشن کا گلشن
مجھے جو دھانوں اس کا خوب آیا قلم کوں بھی اسی حکمت پر نہایا
وہ گلشن کا رکھیا جو نانوں بھلن رکھیا میں ناؤں اس کا یہ درپن

۹۱ اردو ڈرامہ عشرت رحمانی، ص ۲۰۰ اور ۲۰۳

۹۲ ایضاً ص ۲۴۱

بقول شمس اللہ قادری اس مثنوی میں راجہ راج کتور اور رانی کلتا دیوی (کام لک دیوی) کا قصہ مذکور ہے۔ ہنر نے صراحت کر دی ہے کہ یہ قصہ اس نے کسی فارسی داستان سے لیا۔ لیکن اس کے ہندوستانی الاصل ہونے میں شک نہیں۔ ملاحظہ ہو :

”ایک بادشاہ تھا جس کے پاس زر و جواہر، خزانے اور افواج کبھی کبھ تھا، مگر اولاد نہ تھی۔ ایک فقیر سے وہ دعاؤں کا طالب ہوا۔ دن رات اسی فکر میں بسر ہوتے۔ آخر فقیر کی دعا قبول ہوئی اور اس کے لڑکا پیدا ہوا۔ لڑکا بڑا ہو کر سیر و شکار میں مصروف رہنے لگا۔ بالآخر خواب میں ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر وہ اس پر عاشق ہو گیا۔ عشق سے اس کی حالت دگرگوں ہونے لگی۔ علاج معالجہ کیا، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آخر ایک برہمن آیا۔ اس نے شہزادے کے دل کا بھید معلوم کرنے کی کوشش کی اور شہزادے کے عشق سے واقف ہو گیا۔ شہزادہ لڑکی کی تلاش میں روانہ ہوا۔ اس کے بعد صدا بہا مصائب اور ظلم کشائی وغیرہ کے بعد مقصد حاصل ہوا اور شہزادہ خواب کی معشوقہ کے وصل سے شاد کام ہو کر وطن واپس آیا۔“

آغاز :

الئی، یا الئی، یا الئی تجے ساجے بھکت کی بلو شای
تکبر ہو رہنم ہے تج سزاوار کہ نہیں کوئی دوسرا تج سا کر بار

النتام :

خداوند! خلیل اپنے نبیؐ کے نبیؐ کے ہو رشہ مرداں علیؑ کے
دنیا اور دین کے گاماں بنے سب مرا کر خاتمہ پالگیر پادبؑ (۹۳)

مثنویات کا مروپ اور کلا کام

یہ ہندوستان کا نہایت قدیم اور ہر دلچیز قصہ ہے۔ گارساں دتاسی اس کے بارے میں کہتا ہے: ”یہ عجیب قصہ ہے اور ہندوستانی نظم و نثر میں بہت سے مصنفوں نے اسے لکھا ہے۔... کہتے ہیں کہ سندباد کا قصہ جو الف لیلا میں ہے اور سن بران دین کا قصہ جو میری دی فرانس کی تالیف ہے، ان کی اصل یہی ہے۔“ (۹۴) دتاسی اس قصے کے عاشقوں میں سے تھا۔ اس نے اپنے خطبات میں اس کی بار بار تعریف کی ہے اور وہ اسے Ulysses سے تشبیہ دیتا ہے۔ (۹۵) اس کی نظر سے اس قصے کے فارسی اور اردو کے کئی نسخے گزرے تھے۔ لیکن وہ ان سب میں سے حسین الدین کی مثنوی کو بہترین قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس نے اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں Les Adventures de Kamrup کے نام سے کیا جو پیرس سے ۱۸۳۲ء میں شائع ہوا۔ (۹۶) اس کے ساتھ ساتھ ۱۸۳۵ء میں دتاسی نے حسین الدین کی مثنوی کا دکنی متن بھی شائع کیا۔ (۹۷) یہ نسخہ الی برٹن کی فرہنگ کے ساتھ ۱۸۵۹ء میں پھر شائع ہوا۔ (۹۸) کامروپ کے فرانسیسی ترجمے سے تقریباً چالیس برس پہلے ویلیو فرہنگن اس قصے کو انگریزی میں ترجمہ کر کے ۱۷۹۳ء میں لندن سے شائع کر چکا تھا۔ (۹۹) ویلیو فرہنگن کا انگریزی ترجمہ پہلے ہیچ و تھیہ مہابھارت دت، بردوان سے دوبارہ ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا۔ (۱۰۰) انگریزی کا

۹۴	دتاسی، خطبات، ص ۱۵۵
۹۵	ایضاً، ص ۲۹۱
۹۶	ایضاً، برٹن سب، ص ۸۸
۹۷	ایضاً، ص ۳۳۰، قصہ کامروپ کے ایک تار نخے کی نقل موسیور اور سکرٹری ہندو کالج کلکتہ نے دتاسی کو بھجوائی تھی (زور، گارساں دتاسی، ص ۳۷)
۹۸	ایضاً، برٹن سب، ص ۳۳۱
۹۹	بھولہ باگی پار، VIII، ص ۱۸۳
۱۰۰	آر بری، ص ۳۱۷

ایک مختصر ایڈیشن ۱۸۸۹ء میں نکلتے سے شائع ہوا۔^(۱۰۱) جرمنی زبان میں قصہ کامروپ کی تسمیہ کا ترجمہ پروفیسر Rose Garten نے کیا تھا جسے نامور گوئے نے دیکھا اور بے اپنا لطف اظہار۔ گوئے نے اس نظم کی تعریف میں لفظ — Unschätzbare استعمال کیا ہے۔^(۱۰۲)

کامروپ کے قصے کو پنجابی زبان میں احمد یار نے نظم کیا۔ یہ قصہ ۱۸۷۵ء میں امرتسر میں اشاعت پزیر ہوا۔^(۱۰۳) ہندی میں اسے ”کھانی کا کام کی“ کے نام سے شیام لال چکرورتی نے نظم کیا۔ یہ کتاب اعظم غڑج سے ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی۔^(۱۰۴) یہی قصہ ہندی نثر میں فیروز آباد کے کشیتر پال شرمانے بھی لکھا جو نکلتے سے ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا۔^(۱۰۵)

کامروپ کے فارسی لور اردو نسخوں کی تفصیل یہ ہے :

فارسی نسخے

- ۱۔ قصہ کامروپ (نثر) از میر محمد کاظم حسینی، مختلص بہ کریم۔ یہ عبداللہ قطب شاہ (۷۲-۱۶۳۶ء) کا ملازم تھا۔ راج کا بیان ہے کہ کریم نے قصہ سنسکرت سے لیا۔^(۱۰۶) میر محمد کاظم حسینی کی فارسی مثنوی قصہ کامروپ، دہلی سے ۱۸۳۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ مطبوعہ نوز انڈیا آفس لندن میں موجود ہے۔^(۱۰۷)
- ۲۔ قصہ کامروپ (نثر) از ہمت خاں میراں بن اسلام خاں

۱۰۱	علوم ہدایت، برٹش میوزیم، ص ۴۳۶
۱۰۲	تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی (دوسری) جلد پنجم، دہلی، معاصر شاہد، ۱۱، ص ۱۴۴
۱۰۳	انڈیا پنجابی، ص ۴۱
۱۰۴	انڈیا ہندی، ص ۶۸
۱۰۵	ایضاً، ص ۱۶۴
۱۰۶	راج، ص ۷۶۳، برائے فتح دہلی، ایچ۔ ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸، ۱۵۱۹، ۱۵۲۰، ۱۵۲۱، ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ۱۵۲۶، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸، ۱۵۲۹، ۱۵۳۰، ۱۵۳۱، ۱۵۳۲، ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۳۶، ۱۵۳۷، ۱۵۳۸، ۱۵۳۹، ۱۵۴۰، ۱۵۴۱، ۱۵۴۲، ۱۵۴۳، ۱۵۴۴، ۱۵۴۵، ۱۵۴۶، ۱۵۴۷، ۱۵۴۸، ۱۵۴۹، ۱۵۵۰، ۱۵۵۱، ۱۵۵۲، ۱۵۵۳، ۱۵۵۴، ۱۵۵۵، ۱۵۵۶، ۱۵۵۷، ۱۵۵۸، ۱۵۵۹، ۱۵۶۰، ۱۵۶۱، ۱۵۶۲، ۱۵۶۳، ۱۵۶۴، ۱۵۶۵، ۱۵۶۶، ۱۵۶۷، ۱۵۶۸، ۱۵۶۹، ۱۵۷۰، ۱۵۷۱، ۱۵۷۲، ۱۵۷۳، ۱۵۷۴، ۱۵۷۵، ۱۵۷۶، ۱۵۷۷، ۱۵۷۸، ۱۵۷۹، ۱۵۸۰، ۱۵۸۱، ۱۵۸۲، ۱۵۸۳، ۱۵۸۴، ۱۵۸۵، ۱۵۸۶، ۱۵۸۷، ۱۵۸۸، ۱۵۸۹، ۱۵۹۰، ۱۵۹۱، ۱۵۹۲، ۱۵۹۳، ۱۵۹۴، ۱۵۹۵، ۱۵۹۶، ۱۵۹۷، ۱۵۹۸، ۱۵۹۹، ۱۶۰۰، ۱۶۰۱، ۱۶۰۲، ۱۶۰۳، ۱۶۰۴، ۱۶۰۵، ۱۶۰۶، ۱۶۰۷، ۱۶۰۸، ۱۶۰۹، ۱۶۱۰، ۱۶۱۱، ۱۶۱۲، ۱۶۱۳، ۱۶۱۴، ۱۶۱۵، ۱۶۱۶، ۱۶۱۷، ۱۶۱۸، ۱۶۱۹، ۱۶۲۰، ۱۶۲۱، ۱۶۲۲، ۱۶۲۳، ۱۶۲۴، ۱۶۲۵، ۱۶۲۶، ۱۶۲۷، ۱۶۲۸، ۱۶۲۹، ۱۶۳۰، ۱۶۳۱، ۱۶۳۲، ۱۶۳۳، ۱۶۳۴، ۱۶۳۵، ۱۶۳۶، ۱۶۳۷، ۱۶۳۸، ۱۶۳۹، ۱۶۴۰، ۱۶۴۱، ۱۶۴۲، ۱۶۴۳، ۱۶۴۴، ۱۶۴۵، ۱۶۴۶، ۱۶۴۷، ۱۶۴۸، ۱۶۴۹، ۱۶۵۰، ۱۶۵۱، ۱۶۵۲، ۱۶۵۳، ۱۶۵۴، ۱۶۵۵، ۱۶۵۶، ۱۶۵۷، ۱۶۵۸، ۱۶۵۹، ۱۶۶۰، ۱۶۶۱، ۱۶۶۲، ۱۶۶۳، ۱۶۶۴، ۱۶۶۵، ۱۶۶۶، ۱۶۶۷، ۱۶۶۸، ۱۶۶۹، ۱۶۷۰، ۱۶۷۱، ۱۶۷۲، ۱۶۷۳، ۱۶۷۴، ۱۶۷۵، ۱۶۷۶، ۱۶۷۷، ۱۶۷۸، ۱۶۷۹، ۱۶۸۰، ۱۶۸۱، ۱۶۸۲، ۱۶۸۳، ۱۶۸۴، ۱۶۸۵، ۱۶۸۶، ۱۶۸۷، ۱۶۸۸، ۱۶۸۹، ۱۶۹۰، ۱۶۹۱، ۱۶۹۲، ۱۶۹۳، ۱۶۹۴، ۱۶۹۵، ۱۶۹۶، ۱۶۹۷، ۱۶۹۸، ۱۶۹۹، ۱۷۰۰، ۱۷۰۱، ۱۷۰۲، ۱۷۰۳، ۱۷۰۴، ۱۷۰۵، ۱۷۰۶، ۱۷۰۷، ۱۷۰۸، ۱۷۰۹، ۱۷۱۰، ۱۷۱۱، ۱۷۱۲، ۱۷۱۳، ۱۷۱۴، ۱۷۱۵، ۱۷۱۶، ۱۷۱۷، ۱۷۱۸، ۱۷۱۹، ۱۷۲۰، ۱۷۲۱، ۱۷۲۲، ۱۷۲۳، ۱۷۲۴، ۱۷۲۵، ۱۷۲۶، ۱۷۲۷، ۱۷۲۸، ۱۷۲۹، ۱۷۳۰، ۱۷۳۱، ۱۷۳۲، ۱۷۳۳، ۱۷۳۴، ۱۷۳۵، ۱۷۳۶، ۱۷۳۷، ۱۷۳۸، ۱۷۳۹، ۱۷۴۰، ۱۷۴۱، ۱۷۴۲، ۱۷۴۳، ۱۷۴۴، ۱۷۴۵، ۱۷۴۶، ۱۷۴۷، ۱۷۴۸، ۱۷۴۹، ۱۷۵۰، ۱۷۵۱، ۱۷۵۲، ۱۷۵۳، ۱۷۵۴، ۱۷۵۵، ۱۷۵۶، ۱۷۵۷، ۱۷۵۸، ۱۷۵۹، ۱۷۶۰، ۱۷۶۱، ۱۷۶۲، ۱۷۶۳، ۱۷۶۴، ۱۷۶۵، ۱۷۶۶، ۱۷۶۷، ۱۷۶۸، ۱۷۶۹، ۱۷۷۰، ۱۷۷۱، ۱۷۷۲، ۱۷۷۳، ۱۷۷۴، ۱۷۷۵، ۱۷۷۶، ۱۷۷۷، ۱۷۷۸، ۱۷۷۹، ۱۷۸۰، ۱۷۸۱، ۱۷۸۲، ۱۷۸۳، ۱۷۸۴، ۱۷۸۵، ۱۷۸۶، ۱۷۸۷، ۱۷۸۸، ۱۷۸۹، ۱۷۹۰، ۱۷۹۱، ۱۷۹۲، ۱۷۹۳، ۱۷۹۴، ۱۷۹۵، ۱۷۹۶، ۱۷۹۷، ۱۷۹۸، ۱۷۹۹، ۱۸۰۰، ۱۸۰۱، ۱۸۰۲، ۱۸۰۳، ۱۸۰۴، ۱۸۰۵، ۱۸۰۶، ۱۸۰۷، ۱۸۰۸، ۱۸۰۹، ۱۸۱۰، ۱۸۱۱، ۱۸۱۲، ۱۸۱۳، ۱۸۱۴، ۱۸۱۵، ۱۸۱۶، ۱۸۱۷، ۱۸۱۸، ۱۸۱۹، ۱۸۲۰، ۱۸۲۱، ۱۸۲۲، ۱۸۲۳، ۱۸۲۴، ۱۸۲۵، ۱۸۲۶، ۱۸۲۷، ۱۸۲۸، ۱۸۲۹، ۱۸۳۰، ۱۸۳۱، ۱۸۳۲، ۱۸۳۳، ۱۸۳۴، ۱۸۳۵، ۱۸۳۶، ۱۸۳۷، ۱۸۳۸، ۱۸۳۹، ۱۸۴۰، ۱۸۴۱، ۱۸۴۲، ۱۸۴۳، ۱۸۴۴، ۱۸۴۵، ۱۸۴۶، ۱۸۴۷، ۱۸۴۸، ۱۸۴۹، ۱۸۵۰، ۱۸۵۱، ۱۸۵۲، ۱۸۵۳، ۱۸۵۴، ۱۸۵۵، ۱۸۵۶، ۱۸۵۷، ۱۸۵۸، ۱۸۵۹، ۱۸۶۰، ۱۸۶۱، ۱۸۶۲، ۱۸۶۳، ۱۸۶۴، ۱۸۶۵، ۱۸۶۶، ۱۸۶۷، ۱۸۶۸، ۱۸۶۹، ۱۸۷۰، ۱۸۷۱، ۱۸۷۲، ۱۸۷۳، ۱۸۷۴، ۱۸۷۵، ۱۸۷۶، ۱۸۷۷، ۱۸۷۸، ۱۸۷۹، ۱۸۸۰، ۱۸۸۱، ۱۸۸۲، ۱۸۸۳، ۱۸۸۴، ۱۸۸۵، ۱۸۸۶، ۱۸۸۷، ۱۸۸۸، ۱۸۸۹، ۱۸۹۰، ۱۸۹۱، ۱۸۹۲، ۱۸۹۳، ۱۸۹۴، ۱۸۹۵، ۱۸۹۶، ۱۸۹۷، ۱۸۹۸، ۱۸۹۹، ۱۹۰۰، ۱۹۰۱، ۱۹۰۲، ۱۹۰۳، ۱۹۰۴، ۱۹۰۵، ۱۹۰۶، ۱۹۰۷، ۱۹۰۸، ۱۹۰۹، ۱۹۱۰، ۱۹۱۱، ۱۹۱۲، ۱۹۱۳، ۱۹۱۴، ۱۹۱۵، ۱۹۱۶، ۱۹۱۷، ۱۹۱۸، ۱۹۱۹، ۱۹۲۰، ۱۹۲۱، ۱۹۲۲، ۱۹۲۳، ۱۹۲۴، ۱۹۲۵، ۱۹۲۶، ۱۹۲۷، ۱۹۲۸، ۱۹۲۹، ۱۹۳۰، ۱۹۳۱، ۱۹۳۲، ۱۹۳۳، ۱۹۳۴، ۱۹۳۵، ۱۹۳۶، ۱۹۳۷، ۱۹۳۸، ۱۹۳۹، ۱۹۴۰، ۱۹۴۱، ۱۹۴۲، ۱۹۴۳، ۱۹۴۴، ۱۹۴۵، ۱۹۴۶، ۱۹۴۷، ۱۹۴۸، ۱۹۴۹، ۱۹۵۰، ۱۹۵۱، ۱۹۵۲، ۱۹۵۳، ۱۹۵۴، ۱۹۵۵، ۱۹۵۶، ۱۹۵۷، ۱۹۵۸، ۱۹۵۹، ۱۹۶۰، ۱۹۶۱، ۱۹۶۲، ۱۹۶۳، ۱۹۶۴، ۱۹۶۵، ۱۹۶۶، ۱۹۶۷، ۱۹۶۸، ۱۹۶۹، ۱۹۷۰، ۱۹۷۱، ۱۹۷۲، ۱۹۷۳، ۱۹۷۴، ۱۹۷۵، ۱۹۷۶، ۱۹۷۷، ۱۹۷۸، ۱۹۷۹، ۱۹۸۰، ۱۹۸۱، ۱۹۸۲، ۱۹۸۳، ۱۹۸۴، ۱۹۸۵، ۱۹۸۶، ۱۹۸۷، ۱۹۸۸، ۱۹۸۹، ۱۹۹۰، ۱۹۹۱، ۱۹۹۲، ۱۹۹۳، ۱۹۹۴، ۱۹۹۵، ۱۹۹۶، ۱۹۹۷، ۱۹۹۸، ۱۹۹۹، ۲۰۰۰، ۲۰۰۱، ۲۰۰۲، ۲۰۰۳، ۲۰۰۴، ۲۰۰۵، ۲۰۰۶، ۲۰۰۷، ۲۰۰۸، ۲۰۰۹،

ہمت خاں کا چوراہا نام یوں ہے :

”میر بیہی بن اسلام خاں مشہد فی الخطاب بہ ہمت خاں“ (۱۰۸)

ہمت خاں میراں کے قصہ کامروپ و کام لہا (فارسی نثر) کا ایک قلمی نسخہ ادارۃ ”ادبیات اردو“ حیدر آباد کے کتب خانے میں بھی ہے۔ سن کتابت ۱۲۶۱ھ بمقام حیدر آباد، اور اوراق ۱۳۵ (۱۰۹)

ہمت خاں عہد عالمگیری کے ایک میر فشی تھے (وفات ۱۰۹۲ھ) نسخہ باگی پور مکتوبہ ۱۱۵۹ھ (۱۱۰) میر بیہی، میراں مختص کرتے تھے۔

۳۔ مشکوی دستور ہمت از مراد۔ تذکرہ شمع انجمن میں میر محمد مراد کا مختص لائق بتایا گیا ہے۔ (۱۱۱) مشکوی دستور ہمت کے ایک شعر میں بھی یہ مختص موجود ہے :

بیا لائق سخن را مختصر کن
نزد اندر خط و دگر بدر کن (۱۱۲)

مشکوی دستور ہمت کا ایک قلمی نسخہ ادارۃ ادبیات اردو، حیدر آباد کے کتب خانے میں بھی محفوظ ہے۔ یہ مخطوطہ ناقص الطرفین ہے اور موجودہ حالت میں ۱۱۳ اوراق پر مشتمل ہے۔ (۱۱۳)

مراد ہمت خاں کا ملازم تھا۔ اپنی مشکوی میں اس نے وضاحت کر دی ہے کہ میرے مربی ہمت خاں نے قصہ کامروپ کو فارسی نثر میں لکھا۔ چونکہ یہ قصہ اسے بہت پسند تھا، اس لیے اس نے مراد سے اس کے نظم کرنے کی فرمائش

۱۰۸۔ کٹر المار، جلد ۳، ص ۹۳۶

۱۰۹۔ ادارۃ ادبیات، جلد ۵، ص ۳۶

۱۱۰۔ باگی پور VIII نمبر ۷۳۳، ص ۱۸۲، پائین: ۱۱۳۲، اشپراگر ۳۵۶

۱۱۱۔ شمع انجمن، ص ۳۱۱

۱۱۲۔ پنجابی قصے فارسی زبان میں، ص ۱۰۰

۱۱۳۔ ادارۃ ادبیات، جلد ۵، ص ۳۷

کی۔ مگر افسوس کہ مشنوی کی تکمیل سے پہلے ہی خاں کا انتقال ہو گیا۔ اظہر انگر
اسے بہت خاں، لائق بن اسلام خاں کی مشنوی قرار دیتا ہے^(۱۱۳) جو غلط ہے۔ سنہ
تصنیف ۱۰۹۶ھ (۱۱۵)

دہاسی نے بھی مشنوی دستور بہت کو غلطی سے بہت خاں سے منسوب
کیا ہے۔^(۱۱۶)

۳۔ مشنوی ملک اعظم، از انجب، بدیع العصر، حاکمی ربیع، سنہ تصنیف
۱۱۵۷ھ۔ مکتوبہ ۱۱۷۳ھ (۱۱۷)

۵۔ مشنوی کامروپ از فشی علی رضا، مکتوبہ ۱۱۹۲ھ (۱۱۸) کیپٹن —
John Ritchie کی فرمائش پر ”ہندوی“ سے ترجمہ کیا گیا۔

۶۔ قصہ کامروپ از کوڑا مل (التوفی ۱۸۳۸ء) یہ کتاب مصنف کے
فرزند کالی رائے ڈپٹی کلکٹر نے دہلی سے ۱۲۶۵ھ میں شائع کی۔ صفحات ۱۳۶ (۱۱۹)

قصہ کامروپ فارسی کے دو نثری نسخے دہاسی کے پاس تھے۔ اس کا بیان
ہے کہ اس قصے کا ایک مصور نسخہ موسیو Jomard نے شاہی کتب خانہ پور میں
جمع کر لیا تھا۔^(۱۲۰) مشنوی کامروپ فارسی کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ،
حیدر آباد میں بھی محفوظ ہے۔^(۱۲۱)

۷۔ بندر امین داس ٹوٹنگو سے روایت ہے کہ قصہ کام روپ و کام لہا

۱۱۳	اظہر انگر، ص ۲۷۵
۱۱۵	رج، ص ۶۹۷
۱۱۶	دہاسی، قطعات، ص ۱۵۵
۱۱۷	رج، ص ۷۸
۱۱۸	رج، ص ۸۰۳
۱۱۹	اظہر انگر، ص ۲۶۰
۱۲۰	تاریخ نویات ہندی و ہندوستانی (دہاسی)، بکھارہ مسامر شہزادہ، ص ۱۳۲
۱۲۱	کتب خانہ سالار جنگ، فنِ نظم فارسی، نمبر ۶۹۵

کوٹر بخش حضوری شاگرد بیدل نے مثنوی شیریں خسرو کے انداز پر لکھا تھا۔ (۱۲۲)
اس تذکرے کی تصنیف کے وقت یہ مثنوی مکمل نہیں تھی۔ یہ تذکرہ ۱۱۳۷ھ
سے ۱۱۳۷ھ تک زیر تصنیف رہا ہے۔

تذکرہ گل رعنا (قلبی، مکتوبہ ۱۱۸۶ھ) میں بھی اس مثنوی سے متعلق یہ
عبارت ملتی ہے: "مگر بخش حضوری ... تربیت یافتہ مرزا بیدل ... قصہ ہندی
تعلیق کامروپ و کام لہا در زمین شیریں خسرو گفتہ ... هنوز ناتمام است"۔ (۱۲۳)

۸۔ قصہ کامروپ و کام لہا کو شیخ حسام الدین حسای (پدر سراج الدین
آرزو) نے بھی نظم کیا تھا۔ شیخ اورنگ آبادی نے ان کے ترجمے میں لکھا ہے۔
"قصہ کام روپ و کام لہا از انسانہائے مشہور ہند است، مضمون ساختہ"۔ (۱۲۴)

۹۔ قصہ کامروپ و کام لہا رام (فارسی نثر) مجہول المصنف۔ اس کا ایک
قلبی نسخہ شیخ سلطان کے کتب خانے میں تھا۔ (۱۲۵)

۱۰۔ مثنوی کامروپ و کام لہا (فارسی) از علی شیر جانغ حضوری
(پیدائش ۱۱۳۰ھ) انھوں نے اپنی فارسی تاریخ تختہ انکرام کے دیباچے میں اپنی
مضمون اور نثری تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے یہ مثنوی جو
تقریباً ۳۰۰۰۰ ابیات پر مشتمل ہے، ۱۱۶۹ھ میں لکھی۔ (۱۲۶)

۱۱۔ مثنوی کنور کام و کلا کام (قلبی) از پریا داس۔ یہ فارسی مثنوی بمقام
لہا آباد تصنیف ہوئی اور ۷ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ کو الہ آباد کے انگریز ڈپٹی کمشنر
کی خدمت میں پیش کی گئی۔ کل صفحات ۱۰۱ ہیں اور ہر صفحے میں تقریباً ۱۳ شعر
ہیں۔ ترقیمہ: "نسخہ قصہ کنور کام و کلا کام من تصنیف بابو پریا داس از دستخط خام

۱۲۲ تذکرہ سفینہ طوق (۳) درق ۲۳ الف، بحوالہ ہانگی پرنس ۸، ص ۱۱۳

۱۲۳ گل رعنا قلبی درق ۵۶ الف

۱۲۴ تذکرہ گل رعنا قلبی درق ۸ الف

۱۲۵ استوارت، فارسی قصص، ص ۸۵

۱۲۶ ربیع، الف ۸۳۶ اور الف ۸۳۸

ہندو نیاہ خصال کشمیا لعل بتاریخ پانزدہم شہر محرم الحرام ۱۲۳۰ھ باقلم رسید۔

برپشت بیاض ی نویسم ایں قطعہ زبیر یاد نگاری
شاید کہ بایں بہانہ روزے برخط نگری و یازم آری (۱۲۷)

۱۲۔ اڈیا آفس لاہوری میں ایک مجہول الاسم اور مجہول المصنف
قلمی فارسی مجموعے میں سترہویں قصے کا عنوان یہ ہے:

”ذریعان راجہ سدھر ماوالی ملک کامرو (پ)“ (۱۲۸)

۱۳۔ کامروپ و کام (فارسی) مجہول المصنف، تعداد صفحات ۷۳،
مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۸۹ء (۱۲۹)

اردو نسخے

۱۔ مشنوی کام روپ اور کلا کام از حسین الدین۔ گارساں دتاسی کے
پاس حسین الدین کی مشنوی کے دو قلمی نسخے تھے، ان میں مشنوی کا آٹھ تصنیف
۱۱۷۰ھ بتایا گیا ہے، جس کے اعداد ”نکل و خوش بہار“ سے حاصل کیے گئے
ہیں۔ (۱۳۰) حسین الدین کی مشنوی کا سراو کی فارسی مشنوی دستور ہست سے ترجمہ
ہونا خلاف قیاس ہے۔ کیونکہ سراو کی مشنوی میں شہزادی کا نام ”کام D“ آیا
ہے۔ (۱۳۱) اس کے برعکس حسین الدین کے ہاں محبوبہ کا نام ”کلا کام“ بتایا گیا
ہے۔ حسین کی مشنوی کے دو مخطوطے اڈیا آفس میں (۱۳۲) ایک کتب خانہ

۱۲۷۔ قصہ، ص ۲۵ نمبر شہر ۱۹۵۔ یہ شکر یہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

۱۲۸۔ مجھے نمبر ۱۹۹۳

۱۲۹۔ آر بری، ص ۱۳۷

۱۳۰۔ بلوم پراٹ اڈیا نمبر ۱۲۶

۱۳۱۔ ہاگی پور، جلد ۸، ص ۱۸۳

۱۳۲۔ بلوم پراٹ اڈیا نمبر ۱۲۶ اور ۱۲۷

مانچسٹر میں، (۱۳۴) اور ایک انجمن ترقی اردو، علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ (۱۳۴) سال
تصنیف ۱۱۷۰ھ ہے۔

- ۲۔ کامروپ، نظم اردو، از ضیف (۱۳۵)
- ۳۔ کامروپ، نظم اردو، از آرزو (۱۳۶)
- ۴۔ کامروپ، نظم اردو، از حسن (۱۳۷)
- ۵۔ کامروپ، نظم اردو، از سراج (۱۳۸)
- ۶۔ مرغوب الطبع (نثر) از سید حسین علی خاں حیدر آبادی (قلمی)
اورادہ ادبیات اردو، حیدر آباد، سنہ تصنیف ۱۲۳۸ھ ہے۔ (۱۳۹)
- ۷۔ نسخہ نثر (دکھنی اردو) مصنف نامعلوم (سنہ تصنیف غائب)
۳۸-۲۱۱ھ) مخدوم کتب خانہ سالار جنگ، حیدر آباد۔ (۱۴۰)
- ۸۔ قصہ کامروپ (نثر) از کندن لال (سنہ تصنیف ۱۸۳۹ء)
یہ کتاب مراد کی فارسی شتوی "دستور ہمت" کے پہلے باب کا ترجمہ
ہے۔ (۱۴۱)

۹۔ قصہ کنور کام روپ از کمال خاں عرف سنے خاں (قلمی) یہ مخطوط
۱۹۱۳ء میں کتب خانہ آصفیہ میں موجود تھا اور اس کا ذکر کتب خانے کی دستاویزی

۱۳۲	حوالہ بخارالدین آرزو، کتب خانہ مانچسٹر کے بعض مخطوطات، مشمولہ معاصر ۱۰، ص ۷۲
۱۳۳	شتوی کام روپ اور کاکام (قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ، نشان ۱۳/۵۹۶ نیز دیکھو اشراف نگر، ص ۶۳۹
۱۳۵	دکائی، غلبات، ص ۱۵۵
۱۳۶	ایضاً
۱۳۷	ایضاً
۱۳۸	ایضاً
۱۳۹	اورادہ ادبیات، جلد اول، ص ۱۶۳
۱۴۰	سالار جنگ، نمبر ۷۱، ص ۷۳۳
۱۴۱	علوم ہارت، برٹش جیسر، ص ۱۷۱

فہرست مطبوعہ ۱۳۳۳ھ میں ملتا ہے۔ (۱۳۲) لیکن اب معلوم کرنے پر پتا چلتا ہے کہ اسے ۱۹۳۷ء میں کتب خانہ ہذا کے ذخیرے سے خارج کر دیا گیا۔

۱۔ مثنوی کام روپ و کام (۱) (تلمی) بمجلد المصنف، اور اق ۸۱، فی صفحہ ۱۵ سطریں، ادارۃ ادبیات اردو، حیدر آباد۔ (۱۳۳)

زیر نظر مثنوی میں محمد پ کا نام ہر جگہ کام (۱) لکھا ہوا ہے نہ کہ گھاکام۔ اس نسخے میں ابتدائی چند ابیات محفوظ نہیں ہیں۔ یہ مخطوط اس طرح شروع ہوتا ہے:

کہا حق میں ان کے خدائے کریم یہ لولاک و یسین و طہ عظیم
جو ہائے لال کے ہیں سردار وں بہار لب ان پہ ہے جاوداں
ذکر احوال پدر کام روپ

تو سن بعد اس کے ارے خوش سروپ قصہ کام (۱) اور کنور کام روپ
اول سن تو اس کے پدر کا بیاں میں دیتا ہوں حالت سے اس کے نظاں
اتھا گرد میں ہند کے آشکارا اودہ نامی اک ملک رنگیں بہار
یہ نسخہ نہایت عمدہ دہلی کاغذ پر شکستہ آمیز خط نستعلیق میں غالباً ۱۳۰۰ھ کے قریب نقل کیا گیا ہے۔ ابتدائی ایک ورق اس میں محفوظ نہیں۔ بحالت موجودہ اس میں دو ہزار چار سو ابیات ہیں۔ اس کا اختتام ان ابیات پر ہوتا ہے:

کہا اپنی خدمت میں اس کوں اے شاہ رکھو سایہ میں اپنی بے شک و شاہ
دیا خوش رضا سے میں اس کوں تچے توں کر خوش رضا سے مگر رخصت مجھے (۱۳۴)

اس مخطوطے میں چونکہ ابتدائی اور آخری اشعار نہیں ہیں، اس لیے مصنف کا نام اور سنہ تالیف معلوم نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ یہ

۱۳۲ آصفیہ جلد ۲، ص ۱۳۸۳، قصص اردو نمبر ۶۳

۱۳۳ ادارۃ ادبیات جلد ۵، ص ۳۳، نمبر ۹۰۲

۱۳۴ ایضاً، ص ۳۵، ۳۴

مثنوی حسین الدین کی تصنیف ہے (۱۳۵) حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ حسین الدین کی مثنوی مطلوبہ جرم کا ایک نسخہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ (۱۳۶) ان دونوں کے اشعار کا تقابلی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ اورادہ اویات کا نسخہ حسین الدین کی مثنوی سے بالکل مختلف ہے۔ نیز حسین کے ہاں محبوب کا نام ”کلا کام“ ہے اور نسخہ اورادہ کی مثنوی میں اسے ہر جگہ ”کام لا“ لکھا ہے۔ ممکن ہے یہ مثنوی کمال خاں عرف منے خاں کی تصنیف ہو یا ان چار شاعروں میں سے کسی ایک کا نتیجہ فکر ہو، جن کا ذکر نگار ماں دتاسی نے کیا ہے۔ (۱۳۷) لیکن ان مثنویوں میں سے کسی کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں۔ اس لیے نسخہ اورادہ کے مصنف کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

میر داستان کا نام مختلف روایتوں میں ”کنور کامروپ“، ”راج کنور“، ”کنور“، ”کامرو“ مختلف طرح سے آیا ہے۔ اسی طرح کسی نے محبوب کو ”کلا کام“ کسی نے ”کام کلا“ کسی نے ”کام لا“ کسی نے ”لا رام“ کسی نے ”کلتا دیوی“ اور کسی نے فقط ”کلا“ لکھا ہے۔

۱۔ مثنوی نے درپن از سید احمد ہنر (قلمی) ۱۱۳۳ھ کتب خانہ سالار جنگ، حیدر آباد (۱۳۸) (اس مثنوی کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے) فی الاصل یہ مثنوی بھی قصہ کامروپ پر مبنی ہے۔ شہزادے کا نام ”راج کنور“ اور شہزادی کا ”کلتا دیوی“ بتایا گیا ہے۔ باقی قصہ وہی ہے جسے حسین نے ہنر کی مثنوی کے ۲۶ برس بعد ۱۱۷۰ھ میں نظم کیا۔ ہنر نے صراحت کردی ہے کہ اس نے یہ قصہ فارسی روایت سے لیا۔

۲۔ مثنوی کامروپ اور کلا کام (اردو) کے ایک ناقص الآخر قلمی نسخے

۱۳۵	اورادہ اویات جلد پنجم، ص ۴۴
۱۳۶	آصفیہ جلد ۳، ص ۵۲۶، قصص اردو نمبر ۱۸۹
۱۳۷	طبقات، ص ۱۵۵
۱۳۸	نہرست سالار جنگ، ص ۶۲۹

کا ذکر پروفیسر اختر اور بیوی نے بھی کیا ہے۔ یہ مخطوط پٹنہ کے ایک سپاہی پیشہ شخص کی ملکیت تھا۔ (۱۴۹)

۱۳۔ قصہ کامروپ و کام کلا اردو (قلمی) ذخیرہ چنڈت لودے شکر شاستری۔ یہ مخطوط اردو نمائش پٹنہ منعقدہ ۱۹۵۹ء میں پیش کیا گیا۔

مثنوی کام روپ اور کلا کام از تحسین الدین

تحسین الدین کی یہ مثنوی یورپ میں بہت مشہور رہی ہے۔ دہاسی اس کے قصے کو عجیب و لا جواب کہتا ہے۔ اس کا بیان ہے: "ایک اعتبار سے اس قصے میں ہمارے لیے علم الانسان کی معلومات پوشیدہ ہیں۔ ممکن ہے کہ اس مضمون کی خاص کتابوں میں ہمیں اس قدر مواد نہ ملے جتنا کہ اس قصے سے۔ اس قسم کی خیالی کہانیاں ہمیں اہل مشرق کی زندگی سمجھنے میں بہت مدد دے سکتی ہیں۔" (۱۵۰)

یورپ میں تحسین الدین کی اس مثنوی کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ ہندوستانی متن ۱۸۳۵ء میں، فرانسیسی ترجمہ ۱۸۳۳ء میں اور متن مع فرہنگ ۱۸۳۹ء میں شائع ہوا۔ دہاسی نے اس مثنوی کا خلاصہ اپنے دسویں خطبے میں بیان کیا ہے۔ (۱۵۱)

اس مثنوی کا ایک نسخہ نوابان اودھ کے کتب خانے میں تھا۔ (۱۵۲) انڈیا آفس میں اس کے دو مخطوطے ہیں۔ ایک کا سنہ کتابت ۱۱۹۳ھ ہے (اوراق ۳۸)۔ (۱۵۳) کتب خانہ مانچسٹر کا قلمی نسخہ ۱۲۲۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔ (۱۵۴) ہندوستان میں اس مثنوی کا صرف ایک مخطوط دستیاب ہوا ہے جو انجمن ترقی اردو ہند، علی

۱۴۹ بہار میں اردو زبان و ادب کا مرکز، ص ۳۱۸

۱۵۰ دہاسی، خطبات، ص ۳۰۲

۱۵۱ دہاسی، خطبات، ص ۲۹۱

۱۵۲ اشپراجر، ص ۶۳۹

۱۵۳ علوم ہارت، انڈیا نمبر ۱۲

۱۵۴ بحوالہ معاصر، ص ۷۲

گزشتہ کی ملکیت ہے۔ (۱۵۵) سنہ کتابت ۱۲۲۱ھ ہے اور اوراتی ۲۸ ہیں۔ مثنوی میں مصنف نے کہیں اپنا نام اور تخلص نہیں لکھا۔ اس مثنوی سے متعلق محمد ابراہیم حسین فاروقی ازہری کا ایک مضمون رسالہ معاصر شمارہ ۳ میں شائع ہوا تھا (ص ۱۳۵) اور موصوف نے درخواست کی تھی کہ ناظرین معاصرہ مصنف کے نام، تخلص اور سال تصنیف کا پتا چلائیں۔ دتاسی نے اس مثنوی کا جو متن شائع کیا تھا، وہ ہندوستان میں دستیاب نہیں، نہ ہندوستان کے کسی کتب خانے میں اس مثنوی کے کسی دوسرے مخطوطے کا ہمیں علم ہے۔ اس لیے قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ فیضہ انجمن حسنین ہی کی تصنیف ہے۔ البتہ قرائن اس کے حق میں ہیں۔ دتاسی کا بیان ہے کہ یہ مثنوی دکنی زبان میں ہے۔ (۱۵۶) فیضہ انجمن کی زبان بھی دکنی ہے۔ دتاسی نے قصے کا جو خلاصہ اپنے دسویں خطبے میں بیان کیا ہے (۱۵۷) وہ بنیادی طور پر نسخہ 'انجمن' سے ملتا جلتا ہے۔ دونوں نے کامروپ کے باپ کا نام مہاراجہ پت لکھا ہے۔ دونوں اسے اودے پور کا حکمران بتاتے ہیں۔ شہزادے کی پیدائش دتاسی بھی فقیر کے دیے ہوئے پھل کا نتیجہ جانتا ہے۔ دونوں کہانیوں میں چھ وزیروں اور ان کے چھ بیٹوں کا ذکر آیا ہے جو شہزادے کے بھوکے تھے۔ دونوں کے ہاں کامروپ بارہ برس کی عمر میں عشق کا شکار ہوتا ہے اور دونوں کے ہاں بیروٹن سراندیپ کی شہزادی ہے۔ اس گہری مطابقت کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ نسخہ 'انجمن'، حسنین الدین ہی کی تصنیف ہے۔ اگر یہ مثنوی کسی دوسرے مصنف کا نتیجہ فکر ہوتی تو قصہ بالکل یہی نہ ہوتا۔ کیونکہ قدیم زمانے میں جب ایک ہی روایت پر مختلف شاعر طبع آزمائی کرتے تھے، تو قصے کو تازہ اور رنگین بنانے کے لیے مرکزی کرداروں اور مقامات کے ناموں اور بعض جزئیات میں تغیر و تبدل ضرور کر لیتے تھے۔ ایسی کسی تبدیلی کی غیر موجودگی میں 'انجمن'

۱۵۵ کتاب ۳/ ۵۶۶

۱۵۶ دتاسی، خطبات، ص ۲۹۱

۱۵۷ ایضاً، ص ۲۹۲/ ۳۰۳

کے نسخے کو حسین الدین سے منسوب کرنا قرین قیاس ہے۔

حسین الدین کی مشوئی کا وہ مطبوعہ نسخہ جسے گارساں دتاسی نے ۱۸۳۵ء میں پیرس سے شائع کیا تھا، بعد میں مجھے اسٹیٹ سنٹرل لائبریری، حیدرآباد میں دستیاب ہو گیا۔^(۱۵۸) انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ کے قلمی نسخے^(۱۵۹) سے اس کے مقابلے کے بعد اب یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ نسخہ انجمن حسین ہی کی مشوئی ہے اور حسین کی مشوئی کا یہ واحد مخطوط ہے جو ہندوستان کے کسی کتب خانے میں محفوظ ہے۔

قصے کا خلاصہ

اودے پور کے راجا (اصل مشوئی میں اودھ پور^(۱۶۰)) لکھا ہوا ہے۔ گارساں دتاسی نے اسے ”ملک اودھ“ بتایا ہے^(۱۶۱) (جو غلط ہے) ”راج پت“ کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے سادھوؤں، سنیاسیوں کی دعوت کی۔ ایک درویش نے اسے ”شری“ پھل دیا، جسے کھانے سے رانی سندھ روپ کا پاؤں بھاری ہو گیا۔ چونکہ راجا کے چھ وزیر بھی لادہ تھے، ان کی بیگمات نے بھی یہ پھل چکھا اور مقررہ میعاد کے بعد سکھوں کے ہاں لڑکے پیدا ہوئے۔ شہزادے کا نام کامروپ (کامروپ دراصل دریائے برہم پتر کی وادی میں صوبہ آسام کے ایک علاقے کا نام ہے۔ اس کے شمال میں بھوٹان اور جنوب میں کھوسی کی پہاڑیاں واقع ہیں جو جنگلات سے ڈھکی ہوئی ہیں) رکھا گیا۔ پندرہویں نے جنم پترا دیکھ کر بتایا کہ بارہ برس کے بعد شہزادے کے گرہ بھاری ہیں اور بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ شہزادے کو ایک عالی شان محل میں وزیروں کے جیسے بیٹوں کے ساتھ رکھا گیا اور ان کی تربیت اور نگہداشت کے بہترین انتظامات کیے گئے۔

۱۵۸ اصلہ، جلد ۳، ص ۵۲۶، قصص اردو، نمبر ۱۸۹

۱۵۹ مشوئی کام روپ اور کام کام (قلمی)، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، سال ۱۳/۵۶۶

۱۶۰ مشوئی حسین الدین، مخطوط، علی گڑھ، اردو ۳ الف

۱۶۱ خطبات، ص ۲۹۲

لیکن ہوتی ہو کے رہی۔ بارہ برس کی عمر میں ایک روز کامروپ نے خواب میں ایک شہزادی کو دیکھا، جو حسن و جمال میں یکساں روزگار تھی۔ اس کا چہرہ کنول کا سا، آنکھیں ہرنی جیسی اور گردن ہنس کی سی تھی۔ حسن اتفاق کہ اسی روز شہزادی کلا کام نے بھی شہزادے کام روپ کو خواب میں دیکھا اور اس پر دل و جان سے فدا ہو گئی۔

کام روپ کی آنکھ کھلی تو اس کی دنیا بدل چکی تھی۔ اس پر ہی چہرہ بہت ظاہر کی یاد اسے وہ رہ کے ستانے لگی اور وہ ہزار کوشش کے باوجود بھی اسے بھلا نہ سکا۔ شہزادے کے دن پریشانی اور راتیں بے خوابی میں گزرنے لگیں۔ آخر وزیر زلے کے ذریعے بادشاہ پر یہ راز کھلا تو وہ بہت سٹ ہنپا۔ ملک ملک کے پردیسیوں، جوگیوں اور فقیروں کو دعوت دی گئی کہ کوئی شہزادی کا پتا بتا سکے۔ آخر سست نامی ایک برہمن نے جو سرائندپ کا رہنے والا تھا، کلا کام کا پتا بتا دیا۔ یہ برہمن دراصل کلا کام ہی کا بیٹا ہوا تھا۔ غرض شہزادہ کام روپ مع چھ رفیقوں کے، سست کے ہمراہ سرائندپ کو روانہ ہوا۔

دور دراز کا سفر تھا، سمندر پار کرتے ہوئے طوفان کا سامنا ہوا، اور جہاز پاش پاش ہو گیا۔ ایک کو ایک کی خبر نہ رہی۔ کامروپ تختے کے سہارے بہتا ہوا کنارے پر آگیا۔ رات جنگل میں گزری۔ یہ قریب راج رانی راونتا کا مقام تھا جو شہزادے پر عاشق ہو گئی اور دونوں مل جل کر رہنے لگے۔ شہزادہ کلا کام کو بھول چلا تھا کہ ایک رات وہ خواب میں آئی اور کام روپ کو سخت سست کیا۔

اس واقعے کے بعد کامروپ راونتا کے جنگل سے نکل بھاگا۔ لیکن ایک پری کی ہوس کا شکار ہوا۔ یہاں سے ایک حامد راکشس نے اسے سمندر میں پھینک دیا اور وہ سرائندپ کے کنارے جا گیا۔ اس جزیے میں قسم پارہتے تھے، جو کامروپ کے کانٹے پر سوار ہو کر اسے مار مار کر ہاتھتے لگے۔ کامروپ نے انگوڑوں کا رس نکال کر شراب بنائی، جسے پی کر قسم پارہ ہوش ہو گئے۔ کامروپ اور دوسرے گرفتار لوگوں نے اس موقع کو فہیمت سمجھا اور قسم پاروں

کو چن چن کر قتل کیا اور بھاگ نکلے۔ ان آزاد ہونے والوں میں وزیر کا بیٹا مترچند بھی تھا۔ اسے ایک دیو نے گرفتار کر لیا تھا، جو بعد میں اس کا بھروسہ بن گیا اور اپنے بالوں کے ذریعے ضرورت کے وقت مدد دینے کا مدعی ہوا۔ ابھی مترچند اور کامروپ باتیں کر رہے تھے کہ ان کا تیسرا ساتھی بھی آگیا۔ یہ تو تے کی شکل میں تھا اور پاؤں کا دھکا کھولنے پر انسان بن گیا۔ وہ ایک پری کا شکار رہا جس کی قید سے آخر وہ اڑ نکلا تھا۔ اسی اثنا میں انھیں وہ برہمن بھی ملا، جس کے پر اسرار پھل کی بدولت کامروپ اور اس کے چھ اچھوتی پیدا ہوئے تھے، اس نے انھیں سنگ کیسیا دیا تاکہ شہزادہ غربت اور افلاس کے عالم میں پریشان نہ ہو۔

چند دنوں بعد شہزادے کے باقی ساتھی بھی مل گئے۔ ان میں سے ایک نقاش تھا اور ایک طبیب۔ دونوں بادشاہ کامراج کے دربار میں ملازم ہو گئے تھے۔ نقاش نے شہی محل میں نقش و نگار بنائے اور طبیب شہزادی کا کام کا علاج کرتا رہا۔ اس نے بادشاہ کو بتایا کہ شہزادی مرض عشق میں مبتلا ہے۔ بادشاہ نے نقاش سے شہی محل میں جگہ جگہ کامروپ کی تصویریں بنوائیں، جنھیں دیکھ کر کامراج کے مرض میں کچھ کمی ہوئی۔ آخر سوئسر منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ کامروپ نے اپنے ایک ساتھی کو تو تاجا کر شہزادی کے پاس بھیجا کہ وہ اس رسم کے موقع پر فقیر کے بجیس میں آئے گا۔ چنانچہ جب شہزادی نے سوتیوں کا ہار بجائے راجا، مہاراجوں کے ایک فقیر کے گھر میں ڈالا تو اس کے باپ کامراج کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ لیکن دیو کے بالوں اور سنگ کیسیا کی مدد سے کامروپ نے آٹا قانا شہزادوں کی سی دولت و حشمت اور شان و شوکت پیدا کر لی۔ کامراج کو جب شہزادے کی اصلیت معلوم ہوئی تو بڑا خوش ہوا۔ غرض اس طرح مدتوں کی جدوجہد کے بعد کامروپ اور کامراج اپنے ارادوں میں کامیاب ہوئے۔

حسین الدین کی مثنوی حسب معمول، حمد و نعت سے شروع ہوتی ہے۔

اٹھی جتن توں ہی کرتا رہے دو عالم کا پیدا کرن ہر ہے
نہ کوئی کرے تیری قدرت بیاں نہیں علم تیرا کسی پر عیاں

اس کے بعد چند اشعار عشق کی تعریف میں ہیں۔ مثنوی کی زبان دکھنی ہے لیکن
ادبی اور مشکل نہیں۔ شاعر کے انداز بیان میں سادگی، لطافت، روانی اور صفائی
ہے۔ وہ قصے کی دلچسپی ہر جگہ قائم رکھتا ہے اور مناظر و واقعات کو اچھوتے اور
دکھش انداز میں بیان کرنے پر قادر ہے۔ بعض تشبیہات جدت و ندرت کا بچا
دیتی ہیں۔ شہزادی کا کام کے سراپا سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کچھ چلے چال وہ چپ اٹھائے ہمیں چپ میں تھکے دھن چمن چھائے
بھریں ہاتھ مہندی کے وہ لعل لال بھریں کیس موتی کندھے ہال ہال
دو نیوں میں کاہل دیے من ہرن کسی مل کے ٹیلی پھرے وہ پر ن
شرح دیکھ صورت کھڑا تھر تھرائے چند رماں بدن دیکھ کر کھ چھپائے

کامروپ کے کاروان و کامیاب واپس آنے پر:

سنی فوج کی راج پت نے خبر کہا اپنے دیوان کو دیکھ کر
بلا کر کرم چند دیوان کوں کہا فوج میں جا کے پیچان توں
کہاں کا مہاراج کیا نام ہے لوہے پور میں آیا ہے، کیا کام ہے
کہو جا کے کس دیں میں تم رہو کنور کامرد کی خبر کچھ کہو

یہ دراصل کامروپ کی فوج تھی، بد توں کے چھڑے طے، کامروپ نے اپنی
دشت نور دی اور کامیابی کی داستان سنائی، بالآخر:

بھاتا سن مہاراج نے جب کہا کرم میں ترے تھا بھی ڈکھ پدا
بہت دھیان کر کے کیا تھا جتن کہ تجھ پر نہ آئے ہمہ کی کھن
کبھی فکر اور عقل سے کچھ نہ ہوئے بدھاتا جو چاہے کرے سوئی سوئے
رہو سکھ میں خوش ہو کے اپنے گھر کرو راج اب بیٹھ کر بے فکر

خاتمہ:

کے عشق اس طرح میں جو کوئی نہیں ٹک یقین لولیا وہ جو ہوئی
مقرر ہے محنت میں راحت ملے ورے ٹیک تلخی پہ طاعت ملے^(۱۶۲)
لنڈ جرس میں مشنری کا نام "قصہ کامروپ وکلا" درج کیا گیا ہے۔
مقدمہ اور متن ۵۸ + ۹۶ صفحات میں شائع ہوا ہے۔ اس کے دائیں جانب کے
سرورق کی بجھہ نقل یہ ہے:

قصہ کامروپ وکلا
کہ جو
حمید الدین نے
تصنیف کی
اب
فرسین ونامی کا
تصحیح کیا ہوا
شہر پاریز کی
پادشاهی چھاپی خانہ میں چھاپا گیا
سنہ ۱۸۳۵ عیسوی
مطابق سنہ ۱۲۵۱ ہجری کی

آغاز:

اچھی بھن تو کرتا رہے دو عالم کا پیڑا کرہار ہے
کوئی کرے تیری قدرت بیاں نہیں علم حیرا کسی پر بیاں
عنوانات فارسی میں ہیں۔ پہلا باب یوں شروع ہوتا ہے: "در ذکر

۱۶۲ مشنری کام روپ اور نکاح نام (نقصی) ۱۱ مجن ترقی نرود، علی گڑھ، کلکتہ ۱۳/۵۶۶

نمودن سدا برت و آمدن فقیر چرم پوش و دلاں سری پھل و خوراندین رانی و تولد شدن کنور کامروپ۔"

سنو اب کھٹا عشق کے نام کی کنور کام رو اور کلا کام کی اودھ پور رکھتا تھا وہ راج پت کہیں نام اس کا مہاراج پت رہے راج پت نت اسی فکر سے کہ دیوے خدا ایک فرزند اسے کنور کامروپ کے ماں باپ سے چھڑنے اور سفر پر روانہ ہونے کا منظر:

سند روپ نے تب گئے سے گا گئے سیں گا کر کنور سے کہا
تو جاتا ہے مانا (۱۶۳) کے تیں چھوڑ کر کنور جاشتابی سیں پھر ایہ
بلا کر سند روپ نے تب کہی لپاریں کنور کے تھکن (۱۶۴) کی دہی
دہی لے کے مانا نے ٹیکا دیا تھکن میں کنور کوں بداب تب کیا
کنور نیں (۱۶۵) کیا کوچ (۱۶۶) اودھ پور سوں چلا اب غوشی ہو سراندپ کوں

کنور کوں خبر کچھ نہ دن رات کی اُسے تھی دہی دھن اسی بات کی
کنور تب وہ بانہن (۱۶۷) سے بولا بچن کلا کام کا اب کہاں ہے وطن
کنور کچھ نہ آرام پر بچیں (۱۶۸) کرے کلا کام کا نام سرن کرے
کلا کام کی بات بھلاے اسے کلا بن نہ کچھ بات آدے اُسے
چلا کوچ در کوچ دیاں سے کنور گیا چند مدت میں بھلی (۱۶۹) مگر
تھسین الدین نے مثنوی کا خاتمہ دعائے اشعار پر کیا ہے، چند ملاحظہ ہوں:

۱۶۳	۵۱	۱۶۳	تھن
۱۶۵	نے	۱۶۶	کوچ
۱۶۷	برہمن	۱۶۸	بچن
۱۶۹	بھلی		

مری آل اولاد کو شاد رکھ مرے دوستوں کو تو آباد رکھ
میں کھاتا ہوں جس کا شک اے کریم سدا رحم کر اس پہ تو اے کریم
جیوں آبد اور حرمت کے ساتھ رہوں میں عزیزوں میں عزت کے ساتھ
بر آویں مرے دین و دنیا کے کام بحق محمد علیہ السلام (۱۷۰)

شمالی ہندوستان کی مثنویاں

مثنویات سنگھاسن بتیسی

سنگھاسن بتیسی ۳۲ کہانیوں کے اس مجموعے کا نام ہے جو راجا بکرماجیت کے جو دوستوں اور بہت دشمنوں کے بارے میں زمانہ قدیم سے مشہور رہی ہیں۔ ان کی اصل سنسکرت ہے۔ اچھے سنسکرت نسخے کا نام "سنگھاسن اوواہر نشتی" جاتا ہے۔ (۱۷۱) لیکن وہابی نے سنگھاسن بتیسی کا ماخذ سنسکرت کتاب "وکرماچرترم" کو قرار دیا ہے۔ (۱۷۲) سنسکرت میں تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی کے لکھے ہوئے متعدد نسخے ملتے ہیں۔ ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں، خصوصاً پنجابی، مراٹھی میں بھی سنگھاسن بتیسی کے تراجم ملتے ہیں۔ برج بھاشا میں سنگھاسن بتیسی کو سندھ داس کبیشتر نے ۱۶۳۱ء کے لگ بھگ لکھا۔ (۱۷۳) فارسی میں اس کے ۹ اور اردو میں ۸ نسخوں کا علم ہے، جن کی وضاحت آگے کر دی گئی ہے۔ جرمن، فرانسیسی اور انگریزی میں بھی ان کہانیوں کے تراجم شائع ہوئے ہیں۔ جرمن ترجمہ جنگ (۱۸۶۸ء) سے منسوب ہے۔ فرانسیسی زبان میں ترجمہ Boron Lescallier نے کیا۔ یہ ۱۸۱۷ء میں نیویارک سے شائع ہوا۔ (۱۷۴) R. Roth

۱۷۰ مثنوی کام روپ دکھاکام از حسین الدین، مطبوعہ بیس ۱۸۳۵ء، ص ۶۶

۱۷۱ اچھے، ص ۱۸۸

۱۷۲ تاریخ لطایف ہندوی، ہندوستانی (تہذیب و تعلیم) سانس ۱۱، ص ۱۲۸

۱۷۳ بلوم ہارٹ، برٹش کتب، ص ۱۶۳

۱۷۴ رج، ۷۶۳، یزدانی، تاریخ لطایف، حوالہ ماسٹی، ص ۳۱۰

نے سنگھاسن بیتی کا خلاصہ فورٹال (۱۸۳۵ء) میں پیش کیا تھا۔ (۱۷۵) دہاسی نے اپنے دسویں خطبے (۱۸۶۰ء) میں کہا ہے کہ "Fitz E. Hall نے حال ہی میں سنگھاسن بیتی کا ایک ایڈیشن شائع کیا ہے۔" (۱۷۶) انگریزی کے دوسرے ترجمے Miss Busk اور ایڈگرٹن کے ہیں۔ (۱۷۷) فرینکلن ایڈگرٹن نے چار مختلف سنسنوں کی مدد سے سنگھاسن بیتی کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا۔ یہ ترجمہ سنسکرت متن کے ساتھ ہارورڈ اور نیشنل میریز کے تحت دو حصوں میں ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ منگولی زبان میں سنگھاسن بیتی کا ترجمہ ارجی پورجی خاں کے نام سے کیا گیا (۱۷۸)۔

سنگھاسن بیتی کو سنسکرت کی ایک مستقل تصنیف پر مبنی ہے، لیکن اس کی کئی کہانیاں، چٹال بکچھی، جانک کہانیوں اور کھاسرت ساگر سے ملتی جلتی ہیں۔ (۱۷۹) روایت ہے کہ یہ کہانیاں مہادیو جی نے گوری یعنی پارہتی جی کو سنائی تھیں۔ قصے کی تمہیدیوں ہے :

چندر کرن ایک آسمانی بادشاہ نے ایک زریں سنگھاسن (تخت) بنوایا جو اس نے مہادیو جی کی نذر کر دیا۔ مہادیو جی نے اسے راجہ اندر کو دیا اور راجہ اندر نے اجین کے راجہ بکراجیت کی کسی بات سے خوش ہو کر یہ سنگھاسن اسے بخش دیا۔ بکراجیت کے بعد اس کا لڑکا کرم سین بادشاہ ہوا اور اس تخت پر بیٹھنا چاہا۔ لیکن تخت میں لگی ہوئی ۳۲ پتلیوں نے اسے منع کیا۔ تخت زمین میں دفن کر دیا گیا اور کرم سین اسی حسرت میں دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کی موت کے بعد یہ سنگھاسن راجہ بھوج کے ہاتھ آیا۔ اس نے بھی اس پر بیٹھنے کی کوشش کی۔ سنگھاسن میں لگی ہوئی ۳۲ پتلیاں ہر روز راجہ بھوج کو بکرم کی شہادت اور

۱۷۵	دہاسی حوالہ، سابق، ص ۱۷
۱۷۶	دہاسی خطبات، ص ۲۷۹
۱۷۷	تذری دہاسی، ص ۵۹۱
۱۷۸	ایضاً
۱۷۹	تذری دہاسی، ص ۷۷

سفارت کا ایک واقعہ سنائیں اور اس طرح اسے سنگھاسن پر بیٹھنے سے باز رکھتی تھیں۔ ستائیسویں دن راجہ بھوج نے ان کے روکنے کے باوجود تخت پر بیٹھنا چاہا تو اندھا ہو گیا۔ بکرم کا نام لینے ہی اس کی آنکھیں ٹھیک ہو گئیں۔ لیکن بعد کے پانچ دن اس نے پھر سنگھاسن پر بیٹھنے کی کوشش کی۔ آخری دن یہ راز کھلا کہ اس سنگھاسن پر بیٹھنے کا حق صرف بکرماجیت کو تھا۔ اور یہ چٹلیاں راجہ اندر کی پریاں تھیں جو اپنے اعمال کی وجہ سے جہنم کے منت بن گئی تھیں۔ راجہ بھوج کو بکرم کی سفارت کے قصے سنانے کے بعد انھیں واپس اپنی اصلی حالت میں آجاتا تھا۔ چنانچہ یہ سب پریاں بن کر اڑ گئیں اور تخت دفن کر دیا گیا۔

فارسی نسخے

- ۱۔ ”شاہنامہ“ از ”پتر بیج داس بن مہر چند کاکیت (کا۔ستھ) ساکن درہم سون (سوتی) پت“ مہمد اکبر اعظم (۱۸۰۰)
- ۲۔ ”نمائے خرد افرا“ (۱۸۱۱) از عبدالقادر بدایونی۔ انھوں نے ایک عالم برہمن کی مدد سے سنگھاسن بتی کو فارسی نظم و نثر میں ترجمہ کیا۔ مہ تصنیف ۹۸۲ھ منتخب التواریخ (ج ۱، ص ۶۷) میں لکھا ہے کہ ۱۰۰۳ھ میں اس پر نظر جانی کر کے نیا نسخہ مرتب کیا گیا۔ (۱۸۲۶)
- ۳۔ ”مگل انشاں“ مصنف نامعلوم (۱۸۲۶) خلاصہ التواریخ میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے ”مگل انشاں“ نام کی ایک مشنوی کو قاسم کاشی کی تصنیف بتایا ہے۔ (۱۸۲۶)

۱۸۰ ہالین ۱۳۲۳، راج، ص ۷۶۳

۱۸۱ منتخب التواریخ، دکن کام از حسین الدین سلوہ، ج ۵، ۱۸۳۵، ص ۹۶

۱۸۲ راج، ص ۷۶۳

۱۸۳ بکرما، راج، ص ۲۳۰۰

۱۸۴ منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۷۴

نجان رائے بھنڈاری نے مصنف کا نام نہیں بتایا، فقط اتنا لکھا ہے :
 ”..... گل افشاں ترجمہ سنگھان بیتی“ مختصن احوال راجہ کرمابیت کہ
 مقرر آں برج چنڈت وزیر راجہ بھوج است۔“ (۱۸۵)

۴۔ سنگھان بیتی از بھڑاٹل بن راج مل کھتری۔ سنہ تصنیف ۱۰۱۹ھ (۱۸۶)
 سنگھان بیتی از بھڑاٹل کا ایک قلمی نسخہ بودا لائبریری میں محفوظ ہے۔ مکتوبہ
 ۱۸۲۶ء اس میں مصنف کا نام ”بہار مل“ لکھا ہوا ہے۔ (۱۸۷) نسخہ آصفیہ میں نام
 یوں درج ہے۔ ”بھڑاٹل ابن راج مل اولاد ملک ساکھو ساکن عہدہ بیتا پور سرکار
 صوبہ پنجاب۔“ (۱۸۸)

۵۔ سنگھان بیتی از ابن ہر کرن۔ (۱۸۹) برٹش میوزیم کے ایک محفوظ
 میں یوں دیا ہوا ہے: ”مہب رائے ابن ہر کرن بداس کا۔“ یہ قوتج کا باشندہ تھا۔
 اس نے یہ ترجمہ شاہجہاں کے عہد میں ۶۲-۱۰۶۱ھ میں کیا۔ (۱۹۰)
 ۶۔ سنگھان بیتی از کشن داس ابن مول چند تنولی، باشندہ لاہور،
 بعد جہانگیر۔ (۱۹۱)

۷۔ سنگھان بیتی از چاند ابن ملاحو رام نسخہ کوہن نیکن (لہرست
 ص ۲۹) (۱۹۲)

۸۔ سنگھان بیتی از ”سید امداد علی اور شیو سہائے کدسھ باشندگان
 گڑھی، بلند شہر، ضلع میرٹھ“ انھوں نے یہ ترجمہ براہ راست منسکرت سے

۱۸۵	علامہ ابوریح، ص ۶
۱۸۶	۱۸۸۸ء
۱۸۷	بودا، ص ۳۶، نمبر ۲۳۶
۱۸۸	آصفیہ ج ۳، ص ۵۲۶، نمبر ۲۲۹
۱۸۹	پارلین، ۱۳۳۵
۱۹۰	۱۹۹۰ء، تاریخ ۷۶۳
۱۹۱	۱۹۸۹ء
۱۹۲	کرمابیت، ص ۷۶۳

Edward Clive Bayley (۱۹۳) کے تحریری حکم مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۳۵ء کی تعمیل میں کیا۔ مکتوبہ ۱۸۳۵ء (۱۹۳)

۹۔ سنگھاسن بتیسی (نظم) مسکمی بہ "مکان وجود" مخزنہ سالار جنگ میوزیم (۱۹۵)

۱۰۔ مدار القلوب ترجمہ سنگھاسن بتیسی (فارسی) معنفہ مہاراشہ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جس میں "مہااٹل ابن راج مل" کی سنگھاسن بتیسی (سنہ تصنیف ۱۹۰۱ھ) خط ملے ہوئے ہے، اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ ابتدائی سطور جن میں کتاب کا نام اور سال تصنیف درج ہے، یہ ہیں:

"بندہ کترین مہاراشہ جنس گوید کہ میل خاطر طبع زلو عزیزاں را در اخبار قدیمی داسامانی مایل بود۔ بنا براین چند کلمہ را آراستہ بزبان فارسی در آورده و قبل ازاں این مجموعہ را سنگھاسن بتیسی ہندوی می گفتند..... اکون بتائید رہائی داز عاقلست سبحانی مسکمی مدار القلوب معروف شد۔ تاریخ این ز ہجرت یکھزاروسی و پنچست....." (۱۹۶)

۱۱۔ فارسی نثری ترجمہ (قلمی) مہجول المصنف، (مخطوطے میں چونکہ دیباچہ وغیرہ نہیں ہے، مترجم، کاتب کا نام اور سنہ تالیف معلوم نہیں ہو سکا) سنہ کتابت ۱۲۲۵ھ۔ آغاز: "یک وقت سری مہادیو برکیلاش پرہت....." (۱۹۷)

۱۹۳ E.C.Bayley حکومت ہند کے قانون نگارستان میں "نذر سرکاری" تھے۔

جلوم پارت، ص ۵۹

۱۹۳ راج ۱۰۰۶

۱۹۵ سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد، فن نظم فارسی، نمبر ۵۷۳

۱۹۶ اصلہ ج ۲، ص ۵۲۹، نمبر ۲۲۹

۱۹۷ بمبئی نمبر ۱۲، ص ۲۷۷

نثر:

- ۱۔ سنگھاسن بتیسی۔ مصنف نامعلوم۔ یہ نسخہ قدیم دکنی اردو میں ہے۔ مصنف نے صراحت کر دی ہے کہ اس نے قصہ چتر بھج واس کی فارسی سنگھاسن بتیسی موسوم بہ ”شاہ نامہ“ سے ترجمہ کیا ہے۔ سنہ تصنیف قبل ۱۲۰۰ھ ہے۔ (۱۹۸)
- ۲۔ سنگھاسن بتیسی کو کاظم علی جواں اور للو لال نے ۱۸۰۳ء میں سندھ واس کیشور کی برج تصنیف سے فورٹ ولیم کالج کے لیے ترجمہ کیا۔ اس کے جو ایڈیشن شائع ہوئے، ان میں سے دہلی ۱۸۶۶ء اور کلکتہ ۱۸۶۸ء کے ایڈیشن کتب خانہ برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔ سنگھاسن بتیسی از کاظم علی جواں اور للو لال کے مندرجہ ذیل ایڈیشن کتب خانہ انڈیا آفیس، لندن میں ہیں:
- کلکتہ ۱۸۰۵ء، کلکتہ ۱۸۷۰ء، کلکتہ (دیگر) ۱۸۷۰ء، کلکتہ ۱۸۷۳ء، دہلی ۱۸۷۵ء اور کلکتہ ۱۸۷۷ء (۲۰۰) اسی کتب خانے میں دیوناگری رسم الخط کے ۱۳ اور گورکھی رسم الخط کے ۵ ایڈیشن محفوظ ہیں۔ (۲۰۱) برٹش میوزیم لندن میں بھی بارہ بجلی سے ۱۹۰۳ء کا چھپا ہوا ایک ایڈیشن محفوظ ہے۔ (۲۰۲)
- ۳۔ سنگھاسن بتیسی (اردو نثر) راجا درگا پرشاد، آگرہ ۱۸۶۲ء (۲۰۳)
- ۴۔ سنگھاسن بتیسی مصور (اردو نثر) محبوب المصنف نول کشور کلکتہ ۱۸۷۰ء، تعداد صفحات ۱۳۲ (اسی مطبع سے اس نسخے کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں)۔

۱۹۸ سالار بنگ، ص ۷۱۸، نمبر ۹

۱۹۹ بلوم ہدث، برٹش کتب، ص ۱۶۴

۲۰۰ انڈیا سلیو ہاٹ، ص ۱۵۰

۲۰۱ انڈیا ہندی، ص ۶۵، ۶۴

۲۰۲ ہندی ۳۴۴

۲۰۳ بھجلی، ص ۲۷۷

- ۵۔ سنگھاسن بیتی (اردو نثر) از عبد اللہ فرضی (۲۰۳)
 ۶۔ سنگھاسن بیتی (آسان اور عام فہم اردو نثر) از مجنوں گورکھپوری،
 نکستہ ۱۹۳۱ء (۲۰۵)

نظم:

- ۱۔ سنگھاسن بیتی بکرا بیت (قلمی) مصنف نامعلوم (شاکر د میر درد)
 سنہ کتابت ۱۲۶۷ھ، اوراق ۹۱ (۲۰۶)
 ۲۔ دیے بکرم (قلمی) اس کا مصنف اور سنہ تصنیف بھی معلوم نہیں۔
 اوراق ۹۲ (۲۰۷)
 ۳۔ سنگھاسن بیتی از غنشی مبارام ناتواں، خفق کلیت رائے، خفق
 رائے ہر دے رام کھتری سرہندی، باشندہ دہلی۔ بٹاش سے روایت ہے کہ ناتواں
 نے سنگھاسن بیتی کا ترجمہ اردو مثنوی میں کیا تھا (۲۰۸)
 ۴۔ سنگھاسن بیتی از غنشی رنگ لال چمن۔ یہ مثنوی ۱۸۶۹ء میں شائع

۲۰۳	صدیقی، ص ۱۹۶
۲۰۵	مکتوب پنجاب مجنوں گورکھپوری نام سولف۔ "فہرست کتب خانہ" میں اس کتاب کی جائے اشاعت گورکھپوری بتائی گئی ہے (ص ۳۳)
۲۰۶	لٹن لاجپوری، علی گڑھ، ذخیرہ سر شاہ سلیمان، نکستہ ۵۵
۲۰۷	کتب خانہ، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، نکستہ ۶۰۳ / ۲۹
۲۰۸	ناتواں کی سنگھاسن بیتی اب نایاب ہے۔ انھوں نے ساتھ ستر کتابیں فارسی، اردو، بھاکا میں لکھیں۔ پہلی کتابیں جن کے فروغ دہکا پر شاہ دار سولف خنجد العلوم نے شائع کر دیں۔ ناتواں کا انتقال سنہ ۱۹۳۵ء میں ہوا۔ (بٹاش، آکارد اشرفیہ، جنور، ص ۱۲۷)
	دہکا پر شاہ دار کی تصنیف کا پورا نام "تخت العلوم فی مصطلحات المنظوم" خطاب "مکتبہ سے دارالافتادہ" اور حرف "تذکرہ شعراء دکن" ہے۔ انھوں نے "تذکرہ شعراء" کے ہم سے شاعرت کا ایک تذکرہ بھی لکھا، جس کا تاریخی نام "مرآۃ خیالی" اور لقب "گلشن مرآت دار" ہے۔

ہو چکی ہے۔ (۲۰۹)

۵۔ سنگھاسن بتیسی، از رکتیں لال مختصس بہ رکتیں۔ یہ مثنوی مطبع
اودھ اشبار لکھنؤ سے چھپی تھی۔ (۲۱۰)

۶۔ سنگھاسن بتیسی۔ از غشی مکسن لال (۲۱۱)

مثنوی سنگھاسن بتیسی، بکرماجیت

لٹن لاہوری کا یہ نسخہ ”یاقوت“ اور ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ سے
شروع ہوتا ہے۔ پہلے صفحے پر یہ عنوان درج ہے:
”از اصل کتاب لالہ بھوری مل برائے دلچسپی خود در چھاپ خانہ گنام
تخریج شد۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصل نسخے کی نقل ہے۔ مصنف کا نام
اور نہ تصنیف کہیں درج نہیں۔ البتہ مثنوی کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ
یہ شاہ عالم کے زمانے میں لکھی گئی تھی، اور مصنف خواجہ میر درد کا کوئی شاگرد
تھا۔ حمد کے پہلے دو شعر ملاحظہ ہوں:

دآرام جہاں رزاق مطلق بنائی آسمان کی جس نے جو حق
مہ و خورشید کر روشن دکھائے رکھا اپنے تئیں سب سے چھپائے

تعریف حضرت خواجہ میر درد قدس سرہ:

جناب پاک درد عشق بلازاں اثر جان مہر سازاں (کذا)
ہر اک دم عنایب و گل کا دم ساز کرے ہے عرش پر درک اس کا پرواز
زمین و آسمان تک اس پہ روشن نمایاں اس کی فکر دں سے ہو گلشن

۲۰۹ سنگھاسن بتیسی، مطبع نول کشور، کانپور، تعداد صفحات ۱۲۹

۲۱۰ یہ مثنوی بھی اظہار خیاب ہے۔ تذکرہ آجر اشعار، جنور، ص ۶۸

۲۱۱ نثری داستانیں، ص ۵۹۱

میا ہے اس کے در تک جو کوئی یاں بھر آیا جمع کر جان پریشاں
کوئی عقدہ جو لا غل رہے ہے او نہیں کے ہاتھ سے آخر کھلے ہے
محب توحید کا رنگیں چمن ہے وہی سجے کھلا یاں جس کا من ہے
نہیں دیکھا کوئی انسان ایسا جہاں میں آپ ہی ہے آپ جیسا
کہاں تعریف بندہ کر سکے ہے
کہ عقل کل سخن کہتی تھکتے ہے

تعریف شاہ عالم بادشاہ:

شہنشاہ زماں شاہ عالم کہ جس کے عدل سے آباد عالم
دکن سے لے کے تائیں ہے محکوم نہیں اس عہد میں کوئی بھی مظلوم
فلک نے اس کا جو دشمن اٹھایا نظر نے خاک و خون میں ہے ملایا
عدالت سے ہے اس کی امن میں خلق تلے مخبر کے ہے بدخواہ کا خلق
مثنوی کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے:

اے ساقی ذری پیتا ہے مئے سوئے اب کب تکافل کی جگہ ہے (۱۷)
غموں سے کروں ہوں گرم صحبت سخن گوئی سے تا کے مہر و الفت
ترتیب: تمام شد کتاب سنگھاسن تہسی در تعریف راجہ بکرا جیت
۱۲۶۷ھ بتاریخ ۱۹ ذی قعدہ مطابق ۱۶ ستمبر ۱۸۵۱ء، یعنی سوچ بدلی جینٹھ ۱۹۸۹ روز
سہ شنبہ یوکت یک گھڑی روز باقیامند، پاس خاطر عزیز القدر از جان لالہ کھیت
رائے (۲۱۲) تحریر یافت، خطائے و سببے اگر شدہ باشد، پوشیدہ ساختہ اصلاح
باید و نہ " (۲۱۳)

۲۱۲ غالب یہ کھیت رائے دی ہیں جن کا ذکر اوپر صفحہ ۳ کے ضمن میں آیا ہے۔

۲۱۳ سنگھاسن تہسی (تہسی) قلم لاہوری (لاخیرہ شاہ سلیمان) نمبر ۱۵

مثنوی ویرے بکرم

سنگھاسن بیتیسی کا یہ قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہے۔ اس کا مصنف بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ دیباچے میں مذکور ہے کہ یہ فارسی مثنویوں کا ترجمہ ہے۔ مخطوط ناقص الآخر ہے۔ اس لیے کوئی ترقیمہ نہیں جس سے مصنف کا نام، سال تصنیف یا زمانہ کتابت کھل سکے۔ یہ نسخہ مصنف کا ذاتی معلوم ہوتا ہے۔ حاشیے پر اصلاحی الفاظ دیے ہوئے ہیں اور پورا مسودہ جگہ جگہ کٹا چھتا ہے۔ زبان دکھنی ہے۔ آغاز:

زباں سے نہ ہو حق کا حمد و سپاس کہ بے چون قدرت وہ ہے بے قیاس
زمیں آسماں اس نے پیدا کیا مہر پرویں ہویدا کیا
غلاب غراب بنایا جہاں بشر کو کیا خاک سے پھر میاں
خاتمہ:

یہ سن کر بنایا نکلیں شاد شاد لگایا خدا پر او رکھ اعتقاد
.....
زبیں دیکھ کر وہ انھا خواب سے گمیا تیر سو قار سے پار او
(۲۱۳)

مثنوی سنگھاسن بیتیسی، چمن

رنگ لال چمن کی مثنوی کا سال تصنیف ۱۸۶۳ء ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل قطعہ تارخ سے ظاہر ہے:

ہوا آراستہ یہ بارغ نو جب ہر اک کشور میں پہنچی ہوئے تریف
کئی میں نے سریر دیں سے تارخ ہوئی یہ قلم نو کیا مدد تصنیف

مثنوی کے شروع میں چند شعر واجد علی شاہ کی مدح میں درج ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کی ابتدا ۱۸۵۶ء سے پہلے ہوئی۔ ورنہ معزول بادشاہ کو ”باہ و ماہی کا فرماں روا اور انسر شاہان عالم“ کے خطابوں سے نوازتا ہے معنی ہے۔ مدح کے آخری اشعار سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے:

لکھیں اب مدح سلطان عالم کہ ہے وہ انسر شاہان عالم
فرماں ہے اس کے باہ و ماہی شہنشاہ جہاں، ظل الہی
بچی میری دعا شام و سحر ہے کہ جب تک جلوء عرش و قمر ہے
رہے واجد علی دنیا میں قائم فزوں ہو شوکت و اقبال دائم

یہ مثنوی سب سے پہلے مطبع نول کشور کانپور سے ۱۸۶۹ء میں طبع ہوئی۔^(۲۱۵) دوسرا ایڈیشن کانپور سے ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا۔

غشی رنگ لال چمن، غشی رام سہائے رونق کے شاگرد اور روشن لال ولد غشی بلکن ناتھ خوشتر صاحب رائے، اردو منظوم کے ہم عصر تھے۔^(۲۱۶) چمن نے سہبہ تالیف بتاتے ہوئے صراحت کر دی ہے کہ سنگھاسن بیتی کا مشہور قصہ انھوں نے اپنے احباب کی فرمائش پر نظم کیا۔ ماخذ کے بارے میں مثنوی خاموش ہے۔

لوح پر بسم اللہ الرحمن الرحیم درج ہے۔ واجد علی شاہ کی مدح اور سہبہ تالیف کے بعد نول کشور اور ان کے مصنف کی تعریف ہے۔ چند اشعار اپنے استاد رام سہائے رونق کے بارے میں ہیں۔ پھر ساتی نامہ ہے اور مہادیو جی اور کیلاش پر بت کی مدح ہے۔ اس کے بعد بکراجیت کی پیدائش اور راجہ اندر کے ذکر سے کہانی چل نکلتی ہے۔ راجہ بھوج کو سنگھاسن پر جینے سے باز رکھنے کے لیے چتلیاں جو کہانیاں سناتی ہیں، ان میں سے اٹھائیسویں کہانی یوں ہے:

۲۱۵ بلوم ہاٹ، پرنس کتب، ص ۲۹۷

۲۱۶ تذکرہ آجودا شاعرانہ ہندو، ص ۲

اٹھائیسویں دن صبح ہوتے ہی راجا بھوج نے پھر سنگھاسن پر قدم رکھنا چاہا۔ اٹھائیسویں رات کی زہرہ بولی۔ ”اس تخت پر وہ بیٹھے جو انصاف کی خاطر جان قربان کر سکے۔“ بھوج نے پوچھا، یہ کیسے؟ رات بولی، ”ایک مرتبہ بکراجیت اندر لوک میں مدعو تھے۔ تمام فرشتوں کے سامنے راجا اندر نے بکراجیت کے انصاف کی تعریف کی۔ اس پر دو فرشتوں نے مارے حد کے بکراجیت کو نیچا دکھانے کے لیے چال چلی۔ ایک گائے بن گیا اور ایک شیر۔ چنانچہ:

میاں راہ بیٹھے بن کے دیوار	نظر تھی آمد بکرم پہ ہر بار
شہنشاہ اس طرف جس وقت آئے	ہوئے ہشیار دونوں چار پائے
کہا لو آج بکرم کا مضا (کذا)	نہ جانے دو انھیں میداں سے املا
کرامات ان کی دیکھو آج بکسر	کہ ہیں مداح لون کے شاہ بکسر
کیا یہ گاؤں نے اک مرتبہ زور	کہ بھاگی شیر نر کے پاس سے دور
ہوئی پوشیدہ زلی ش میں جا کر	لہان جان چاہی ان سے بکسر
وہ دامن میں شہنشاہ کے چھپی جب	یہ شیر نر حضور ش گیا تب
کہا یہ گاؤں مادہ مجھ کو دو تم	خوشی سے راہ اپنے گمر کی لو تم
شہنشاہ نے کہا اے شیر عیار	نہ پائے گا یہ گاؤں مادہ زہار
ہمیں تو کیا نہیں پہچانتا ہے	ہمارا نام عالم جانتا ہے

اس حکمران کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ شیر گائے پر بھٹ کر اسے ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بکراجیت نے یہ سوچ کر کہ کزور کی حفاظت نہ کر سکتے سے مرنا بہتر ہے۔ تنجر اپنے سینے میں گھونپ لیا۔

جو دیکھا شیر نر نے ش کا یہ رنگ	حکم اپنا بھی پھاڑا ہو کے دل تنگ
ہوئے جب تین تن اک دشت میں ڈیر	بکراجیت و گاؤں مادہ و شیر
سری شہ اور سری گور اقتدار	ہوئے اس دشت و بر میں جلوہ آرا

چنانچہ سری شو (مہادیو جی) کی نظر نہایت سے قیوں پھر زندہ ہوئے اور:

حاکم نے جو دیکھا یہ تھا تا رہے حیرت میں وہ آئینہ آسا
کہا بے جا یہ ان کا احتماں تھا ہمیں بے فائدہ وہم و گماں تھا
بہ لطف پیش جب شیو پیش آئے ہمیں کیونکر تصور میں وہ لائے
ہوئے نام بہت وہ قصہ کوتاہ ہوئے حاضر حضور شاو زیہا

جیسا کہ ظاہر ہے یہ کہانیاں بھائے خود مکمل نہیں ہیں۔ ان سب کا مقصد بکرم کی عظمت، سخاوت یا شجاعت کا بیان ہے۔ بکرمائیت کو انصاف پسند، حق پرست اور نہایت جری و بہادر دکھایا گیا ہے۔ وہ ہر مشکل کا سامنا کرتا ہے اور اپنی غیر معمولی طاقت کی وجہ سے کامیاب رہتا ہے۔ وہ کمزوروں کا مددگار اور بے توانوں کا سہارا ہے اور سچائی کی خاطر جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اردو کے دوسرے مترجموں کی طرح رنگ لال چمن نے بھی مرکزی کردار یعنی بکرمائیت کے علاوہ دوسرے بہت سے نام بدل دیے ہیں۔ مثلاً وہ چٹوں کو زمرہ، جواہر، یا قوت، زہرہ، مشتری، نادر، نسرین، صنوبر، رحمان وغیرہ ناموں سے یاد کرتا ہے۔ اس کے باوجود ان کہانیوں میں ہندوستانی فضا نہایت گہری ہے۔ دراصل ان کی بنیاد ہندو دیوتا لا پر ہے اور اندر، اندر لوک، پاتال، امر لوک، چٹال، برہمن، یوگی، یکیش، یکیشی وغیرہ کا ذکر بار بار آتا ہے۔ جس سے کہانیوں کی قدیم فضا برابر قائم رہتی ہے۔

رنگ لال چمن نے کہانیوں کو بے جا طول نہیں دیا۔ گو کلام استقامت سے خالی نہیں۔ لیکن زبان صاف اور سلیس ہے اور قصے کی دلچسپی میں مزامنہ نہیں ہوتی۔

مثنوی مورنامہ

اسٹیٹ لائبریری رامپور میں کلیات میر کے دو قلمی نسخے ہیں۔ مخطوط نمبر ۳۸۳ میں ایک مثنوی مورنامہ شامل ہے، جو عہد الہاری آرمی کے مرجع نول

کشتور اینڈیشن میں نہیں۔ اس کا متن ڈاکٹر گیان چند جین نے رسالہ اردو ادب، جون ۱۹۵۷ء میں شائع کر دیا ہے۔ اس کا قصہ غیر فطری اور سیدھا سادہ ہے جس میں ایک رانی کا مور سے عشق کرنا اور اس پر جان دینا دکھایا گیا ہے۔ قصے کے مرکزی کردار راجا رانی اور مور خنیرہ مقامی نضا کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ہندوستانی قصوں میں اس سے ملتے جلتے واقعات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً پداوت میں سنہل دیپ کے راجا گندھرو سین کی بیٹی پداوتی ایک تو تاہیرامن پالتی ہے جو اُسے روز عشق و عاشقی کے قصے سنانا ہے۔ راجا اسے ہلاک کرنے کی تدبیریں سوچتا ہے، لیکن شاہزادی اس کی جان بچانے کے لیے اسے گھر سے لڑاوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رانی اور مور کے عشق کا کوئی عوامی قصہ میر تک کسی مقامی روایت کے ذریعے پہنچا ہو، مگر اس کا تحریری ثبوت نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ قصہ میر علی کی تخلیق ہو۔ بہر حال اس میں دو باتیں ایسی ضرور ہیں جنہیں میر کی ذہنی افتاد سے خاص مناسبت ہے۔ ایک تو یہی عشق کی عالم گیر ہنگامہ آرائی یعنی انسان تو کیا چاند پر نہ بھی عشق کے سودا زدہ ہیں۔ دوسرے کہانی کا درو انگیز اور الم ناک انجام جس میں عاشق و معشوق دونوں جان سے جاتے دکھائے گئے ہیں۔

قصے کا خلاصہ یہ ہے: ایک مور جنگل سے بستی میں آیا۔ یہاں کی رانی حسن و خوبی میں لاثانی تھی۔ مور اس کے دیدار کے لیے شاہی محل پہنچا۔ رانی کا سامنا ہوا تو مور حیرت کی تصویر بنا، جہاں کھڑا تھا، وہیں کا وہیں رو گیا۔ رانی نے اک بے زبان پرندے کو اپنے غم کا ایسا گرویدہ پایا تو وہ بھی اُسے پیار ڈلار کرنے سے رو نہ سکی اور مور وہیں محل میں رانی کے پاس خوشی خوشی رہنے لگا۔ لیکن:

حلقہ رہنے سے بعد از چند روز شور بدنامی اٹھا اک سینہ سوز
کھل گئی غلام لوگوں کی زباں سب پہ ظاہر ہو گیا راز نہاں
راجا لوگوں کے لگانے بھانے سے حسد کے انگاروں پر لوٹنے لگا اور مور کی جان

کالا کو ہو گیا۔ رانی نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو دل پتھر کر کے سود کو چوری چھپے محل سے نکال دیا۔

حزن کے ساتھ اک حزیں آواز کی گرتے پڑتے دو قدم پرواز کی دم سر دیوار سے مارا کیا صبر سے تاجدار پھر چارہ کیا پاس سے کچھ دور ہی رہنے لگا جو رہ پھر یاد کے سہنے لگا لیکن راجا تو اس کی جان کے درپے تھا۔ اس نے جگہ جگہ سود کی تلاش میں جاسوس دوڑائے۔ رانی تاسف سے اندر ہی اندر گھٹلنے لگی۔ لوحر سود کا حال بھی درہم تھا۔ اس نے جنگل میں جا کر دلہ پانی ترک کر دیا اور صبا کے ہاتھوں رانی کو پیغام دینے لگا:

جائے تو رانی سے کہج واشکاف پھیکے خط کے حرف ساغتہا ہوں صاف اب تلک بیتا تو ہوں پر زندگی دور تھے سے ہو گئی شرمندگی آنکھیں رہتی ہیں لگی تیری ہی اور کرتا ہوں اندھا سا میں فریاد و شور اب کوئی اس راہ سے جاتا نہیں آگاہ ہے تو پھر آتا نہیں شور کرتے کرتے پھاتا ہے گلا اب جو نالے کرتا ہوں سو تھلا

جاسوس سود کا اتا پتالے آئے کہ وہ اڑد ہوں کے ایک تیرہ و تار جنگل میں پناہ گزیں ہے۔ راجا نے فوراً فوج کشی کا حکم دیا اور خود سود کو ہلاک کرنے چلا۔ لوحر اس جگر سوختہ کے سوزدروں سے جنگل میں آگ لگ گئی اور سینکڑوں مارداڑد اور شیرد گردن جل کر راکھ ہو گئے۔ سود بچا رہ بھی اسی آگ میں جل مرا اور راجا کو فقط اس کالا شہ ہاتھ آیا۔ غرض:

پھر چڑی جو آگ سب فکھر جلا اور راجا کا بھی لوحر گھر جلا یعنی رانی نے سنی جو یہ خبر آتش غم سے جلا اس کا جگر کیا لگی دل کو کہ دانی جل گئی خاک ہو کر خاک ہی میں زل گئی

عشق ہی کی ہیں یہ تازہ کاریاں عشق نے پردے میں جانیں ماریاں
عشق سے کیا میر اتنی گفتگو خاک اڑا دی عشق نے ہر چار سو
طائر و طاووس و حواں اڑدے سب کچے کیا عشق کی کوئی کبے
یہ فسانہ رہ گیا عالم کے سچ باز ماندہ اُن کے ہیں سب فہم کے سچ

یہ مثنوی میر کے مذکورہ بالا کلیات کے دیوانہ جہم میں شامل ہے، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ اسے انھوں نے اپنی آخری عمر میں لکھنا میں لکھا ہوگا۔
بظاہر اس مثنوی کا قصہ غیر فطری معلوم ہوتا ہے، لیکن ہمارے نزدیک میر نے اسے حتمیل Allegory کے انداز پر نظم کیا ہے۔ مثنوی کے مرکزی کرداروں کا اگر غور سے تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ راجا رانی اور سور محض نام ہی نام ہیں۔ میر نے انھیں حسن و عشق کی بنیادی قوتوں کی حتمیل بنا کے پیش کیا ہے۔ مثنوی میں ایک جگہ وہ خود کہتے ہیں:

قتلہ در سر عشق کے یہ کام ہیں
سور اژدر رانی راجا نام ہیں
عشق ہے ہنگامہ ساز شور و شر
قے قصبے عشق سے ہیں مختصر

سور دراصل عشق ہے، رانی حسن ہے اور راجا حسد کی نمائندگی کرتا ہے۔ میر نے حسن و عشق کے سوز و ساز اور حسد و رقابت کی آویزش و پہکار کے لڑی افسانے کو ایک نئے حیرائے میں بیان کرتے ہوئے عشق کی اہمیت و عظمت کے اسی مقدمے کو پھر دہرایا ہے، جسے وہ اپنی عشقیہ مثنویوں میں اس سے پہلے بھی کئی بار پیش کر چکے تھے۔ یعنی کائنات کی بنیادی قوت عشق ہے۔ یہاں زمین سے آسمان تک عشق ہی عشق بھرا ہے۔ بوستانہ باز کی بہار اور لیل و نہار کی گردش، دنیا میں سبھی کچھ عشق ہی کے دم قدم سے ہے۔ زیرِ نظر مثنوی کا

آغاز بھی حسب معمول عشق کی تعریف سے ہوا ہے اور میر نے اس پر ۳۱ اشعار صرف کیے ہیں۔ البتہ ایک لحاظ سے یہ مشوی میر کی دوسری مشعوں سے مختلف ہے۔ یعنی اس سے پہلے میر عشق کی شورا نگیزی افسانوں میں دکھاتے آئے تھے، اب وہ خاص طور سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ذی عقل تو کیا، بطور ود وحشی بھی اس کی ہنگامہ آرائی سے نہیں بچ سکتے۔ مشوی کے آغاز میں کہتے ہیں:

وہ حقیقت سب میں یاں ساری ہوئی ہے گی ہر شے عشق کی ماری ہوئی
چار سو ہنگامہ آرا عشق ہے عشق کیا کہے کہ کیا کیا عشق ہے
عشق زور آور سے سب ہیں ہر شاہک کہتے اس کے ہو گئے عالم سے پاک
کیا درندہ کیا چرندے کیا پرند دل ہے جن کے عشق ہے ان کا کھنڈ
دوسری جگہ پھر اسی بات کو دہرایا ہے:

طائر و ملاوس و میواں اثر ہے سب کہے کیا عشق کی کوئی کہے
پال ہاروے کا بیان ہے کہ تمثیل میں مجازی سلح کے نیچے کوئی نہ کوئی
مقصد ضرور کار فرما رہتا ہے۔ میر نے بھی اپنی اس تمثیلی مشوی میں سب سے
زیادہ زور اس بات پر دیا ہے کہ کائنات کی بنیادی قوت عشق ہے۔ یہ فقط انسانوں
کی جاگیر نہیں، پرندے بھی اس کے شراروں سے اپنا نشیمن چھوٹ سکتے ہیں۔
ملاحظہ ہو وہ مورد کی شورش عشق کا ذکر کن الفاظ میں کرتے ہیں:

دل گئی تو اک خدا کا ہے غضب اس سے بھر یاد ہے لب پر روز و شب
دل گرفتہ دل شکستہ دل زدہ ان نے مارے مرد کیا کار آمدہ
ہے گی یہ دل بے گئی خانہ خراب در بدر پھرنے کا کر دیوے ہے باب
کیا اڑایا ہے تجھے اے مشعر پر خاک سے لے کر گیا افلاک پر
وہاں سے چٹکے دیکھیے کیونکر تجھے ساتھ آوارہ کرے کیدھر مجھے

راجا کے حسد اور بدگمانی کو بھی میر نے پوری توجہ سے اجاگر کیا ہے۔ کسی انسان کا پرندے کو اپنے پاس رکھنا یا اسے چاہنا ایسا جرم نہیں کہ گردن مارنے کی نوبت آئے۔ لیکن غیرت عشق کے بھی کچھ تھخنے ہیں۔ رشک و رقابت اور عشق میں چوٹی دامن کا ساتھ ہے۔ عشق دوسرے کی شرکت کہاں گوارا کرتا ہے خواہ وہ چرند و پرند ہی کیوں نہ ہو! ملاحظہ ہو، بدگمانی کے زور سے راجا کا دماغ بوز ہو جاتا ہے اور معقول بات بھی اسے نامعقول معلوم ہوتی ہے:

کلن راجا کے بھرے دشمن ہوا	بدگمان و بدبر و بدظن ہوا
کار ظن بد کھنچا اک طول کو	سبھا نامعقول وہ معقول کو
آنا جانا گھر میں اب کا ہو چکا	پاس ربط و رابطہ سب ہو چکا
گھر میں لاتے ہیں کبھو تو گھیر کر	بات کہتا ہے تو منہ کو پھیر کر
راہ میں ہے یا کبھو پھر جائے ہے	پھر گیا تو دیر میں پھر آئے ہے

دشمنی کی بات ہی کچھ اور ہے بے ترتم ہے نہ مطلق غور ہے
جانور کا افس کچھ ثابت نہیں انس انسان کی سی یہ تہمت نہیں

اب رانی کا کردار ملاحظہ کیجیے۔ میر نے اسے بھی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ رانی کی خوبی اور خوب صورتی کا ایک عالم میں شور مچا۔ میر اگر کسی انسان کو رانی پر دیوانہ وار قربان ہوتے ہوئے دکھاتے تو کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ کیونکہ انسان کا انسان پر فریفتہ ہونا کون سی نئی اور چونکا دینے والی بات ہے۔ چنانچہ میر نے ایک پرندے کو رانی پر والد و شیدا ہوتے دکھا کر حسن انسانی کی غیر معمولی کشش کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ چونکہ قصے کا مقامی رنگ پر قرار رکھنا چاہتے تھے، انھوں نے پرندوں میں سے بھی مور کا انتخاب کیا تاکہ اس کے ہال و پر کی رنگین و لٹاویزی قصے کی روایت کا ساتھ دے سکے۔ بحسن یوں تو بے مہر

اور سگدل ہوتا ہے، لیکن اگر عشق صادق ہو تو اثر کے بغیر نہیں رہتا۔ ملاحظہ ہو
مور کے اضطراب سے رانی کا کلیجہ کیسا بھرتا ہے:

اضطراب عشق نے تاثیر کی دل وہی کرنے اٹھی دل گیر کی
چار سے کہنے لگی مت ہو اداس پاس رہ میرے کروں گی میں بھی پاس
تو ہے وحشی اس قدر مانوس ہے انس انساں کو نہ ہو افسوس ہے
پاس رہنے سے ترے ہے دل خوشی ہے بلا اس ہال و پر میں دل کشی

میر رانی کو عشق میں ثابت قدم دکھانا چاہتے ہیں۔ ہندوستانی روایت
کے مطابق یہ تبھی ممکن تھا جب رانی کو ستی ہوتے ہوئے دکھایا جائے۔ میر کو
اس مرحلے کا شروع ہی سے احساس تھا۔ چنانچہ وہ مثنوی کے ابتدائی حصے میں اس
کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

عاشق و معشوق رفت عشق کے یعنی دونوں سینہ تفت عشق کے
بھر کے آتش عشق کی دونوں چلے ڈوبے دریا میں ہوں گو پانی تلے
یا جلایا ایک ہندوستان کے طور جا چلے ہے زن بھی اس بے جاں کے طور
جل چکے کو ہندی کہتے ہیں ستی ست بہمنی استقامت واقعی
آگ میں جا بیٹھے زن کا عارف کیا عشق ہی کا جاؤ بہ وے ہے جلا

عورت کا خاوند کی لاش کے ساتھ ستی ہو جانا محبت کی انتہا ہے۔ لیکن
کسی عورت کا پرندے کے غم میں ستی ہونا انتہائی وابستگی اور وفا شعاری کی
غیر معمولی مثال ہے۔ میر رانی کے مور پر قربان ہو جانے کی فضا تو پہلے ہی تیار
کر چکے تھے۔ آخر میں اسے خاک سیاہ ہوتے دکھا کر کردار نگاری کے فرائض سے
بطریق احسن سبک دوش ہو گئے:

یعنی رانی نے سنی جو یہ خبر آتش غم سے جلا اس کا جگر
کھینچ آہ سرد یہ کہنے لگی عشق کی بھی آگ کیا بنے لگی

بن جلا کر بستیوں میں آ گئی پھیل کر یاں دل جگر کو جا گئی
 جمع کر خاشاک و خار و خس شتاب جل گئی دے آگ وہ بھی بس شتاب
 کیا گئی دل کو کہ رانی جل گئی خاک ہو کر خاک ہی میں دل گئی

غرض قصے میں تمثیلی رنگ کو بھانے اور عشق کو فتح مند ثابت کرنے میں میر کامیاب رہے ہیں۔ گو تمثیل نگاری کے جدید نظریے کی رو سے اس قصے میں ایک کمزوری ہے۔ تمثیل کی جدید تعریف کے مطابق اس میں اندرونی معنویت کے باوصف اس کا مجازی مطلب بھی منظم و مربوط ہونا چاہیے۔ مورنامہ کا قصہ اس شرط پر پورا نہیں اترتا۔ ایک انسان سے مور کا عشق بظاہر غیر عقلی بات ہے، لیکن یہ خصوصیت مشرقی ادب کی ان تمام تمثیلیوں میں ملتی ہے، جن میں بعض کردار انسان ہیں اور بعض حیوان مثلاً شک سپتی میں تو تا ہی داستانوں کے پیرائے میں عقل کے رموز و نکات بیان کرتا ہے۔ پدموات میں فقط تو تا غیر انسانی کردار ہے جو دراصل عقل سلیم کی تشکیل ہے اور راجا رتن سین یعنی نفس انفرادی کو پدمنی یعنی عرفان حق کی طرف راغب کرتا ہے۔ اسی طرح مورنامہ میں مور حیات و کائنات کے بنیادی جذبہ عشق کی تجسیم ہے، جس کی تائید قصے کے واقعات اور انجام سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

مثنوی کا قصہ مختصر اور دلچسپ ہے۔ کردار نگاری کے اعتبار سے مثنوی خاصی دلچسپ ہے، لیکن میر کا ”شعر شور انگیز“ والا انداز اس میں نہیں ملتا۔ حالانکہ کہانی کا الیہ انجام میر کے مزاج سے پوری مناسبت رکھتا ہے اور اس میں درد انگیز اور بُرے تاثر اشعار لگانے کے بڑے مواقع تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مثنوی کے اکثر مقامات طویل ہو گئے ہیں اور میر کا لب و لہجہ بجا بجا اور افسردہ معلوم ہوتا ہے۔ جسے دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ بڑھاپے اور علالت کے باعث یا کسی دوسری وجہ سے میر اس مثنوی میں اپنی طبیعت کا پورا زور صرف کرنے اور نطق کا اعجاز دکھانے سے قاصر رہے ہیں۔

مثنوی گلشن عشق یعنی قصہ راجا بلوان مل وچتر سین

اس مثنوی میں ہدایوں کے عنایت اللہ روشن نے راجا بلوان مل اور چتر سین کا قصہ بیان کیا ہے۔ آغاز قصہ کے اشعار یہ ہیں:

اب سنے خامہ کی زبانی تازہ قصہ نئی کہانی
تھا ہند میں ایک صاحب تخت راجا بلوان مل، جواس بخت
کرتا یہ دعا ہے آہ و زاری اک لال دے دے جناب ہاری

ہزار مثنوی مرادوں سے بنایا پیدا ہوا۔ چتر سین نام رکھا گیا۔ چودہ سال کے بعد تخت و تاج کا وارث ہوا۔ حسن اتفاق سے سنگل دیپ کی ایک پری کو دل دے بیٹھا۔ پری کے اقربا کو خبر ہوئی تو اسے پایہ زنجیر کر دیا۔ نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہوا۔ چتر سین سنگل دیپ پہنچا۔ دلیہ کی مدد سے پری کے والدین کو ہموار کرنے میں کامیاب ہوا اور شادی کر کے گھر لوٹا۔

اس روایتی قصے میں شاعر نے قدرت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ ایک پست مثنوی ہے۔ شاعر کی زبان غیر صاف اور ناموثر ہے اور مثنوی میں دلکشی پیدا نہیں ہو سکی۔ (۲۱۷) مثنوی گلشن عشق (قصہ راجا بلوان مل وچتر سین) کے مصنف عنایت اللہ روشن ہدایوں کی ایک اور مثنوی نور شید روشن بھی ہماری نظر سے گزری ہے۔ سال تصنیف ۱۳۱۷ھ ہے۔ مطبع نامی لکھنؤ سے دوسری بار ۱۹۰۳ء میں ۱۶ صفحوں پر مع غزلیات مصنف طبع ہوئی۔ اس میں عشق کا ایک عامیانہ قصہ بیان کیا گیا ہے۔ لیکن زبان و بیان کے لحاظ سے یہ، مثنوی گلشن عشق پر فوقیت رکھتی ہے۔

مثنوی افسانہ غم یعنی قصہ روپ بسنت

اردو میں اس قصے کو غشی ہر چند رائے ہر چند (سر رشتہ دار محکمہ

ہندوہست ساگر دلا رائے سنگھ، قوم اگر وائل ساکن قصبہ سرحدہ ضلع میرٹھ) نے نظم کیا ہے۔ مثنوی کا نام "افسانہ غم" اور تاریخ تصنیف ۱۸۵۳ء ہے۔ یہ مثنوی مطبع نول کشور، کانپور سے شائع ہوئی تھی۔ ہر چند رائے، ہر چند (حلف رائے سنگھ) نے مثنوی افسانہ غم (قصہ روپ ہنسنت) کے علاوہ چار اور مثنویاں بھی لکھیں۔ گلزار بے خار (۱۸۴۶ء) ستم نامہ (۱۸۵۵ء) نامہ عشق (۱۸۵۶ء) کشف الدقائق (۱۸۶۷ء) وہ آٹھ ضخیم دواوین کے مصنف بھی تھے۔ (۱) رشک گلشن ۱۸۶۳ء، (۲) شریستہ پانچ ۱۸۶۹ء، (۳) محبت مظہر ۱۸۷۰ء (دو جلدیں)، (۴) گلہستہ انجمن ۱۸۷۱ء، (۵) بہار شفیق ۱۸۷۲ء (دو جلدیں)، (۶) مرغوب طبعیت ۱۸۷۳ء، (۷) دریائے غن ۱۸۷۵ء اور (۸) مخزن شوق ۱۸۷۷ء۔ ان میں سے دوسرا دو ایوان ناخ کے جواب میں، تیسرا بہادر شاہ ظفر، پانچواں میر تقی میر، چھٹا جرات اور آٹھواں ذوق کے جواب میں لکھا گیا۔ ان کا بیان ہے کہ انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ (۲۱۸)

مثنوی بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع ہوتی ہے۔ حمد و مناجات کے بعد سبب تالیف ہے۔ شاعر نے صراحت کر دی ہے کہ یہ قصہ کبت اور دوہرہ کی شکل میں موجود تھا۔ بعض لوگ اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے اسے اردو میں مفصل لکھا گیا:

کبت اور دوہرہ میں تھا وہ مرقوم نہ ہوتا تھا مفصل حال معلوم
ہر چند رائے ہر چند نے قصہ روپ ہنسنت مجلس رائے بھال کی ہندی
روایت سے لیا۔ ہندی کی دوسری روایت لکھنؤ سنگھ اور ہردیو سہائے کی ہے جو
میرٹھ سے ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی۔ (۲۱۹)

راجہ رتن سین کے ہاں بڑھاپے میں بڑی مثنویوں سے دو بیٹے پیدا

۲۱۸ دو ایوان ہر چند، محبت مظہر، عقدہ، ص ۵۴

۲۱۹ ہندی کتب پرش، کالم ۹۰۰

ہوئے۔ روپ اور ہنسنت نام۔ بچپن ہی میں ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ماں مرتے وقت راجہ سے کہہ گئی کہ بیٹوں کو خود سے جدا نہ کرنا۔ بیٹوں کے نوجوان ہونے پر راجہ نے دوسری شادی کی۔ سوہ اتفاق نئی رانی بڑے لڑکے روپ پر مائل ہو گئی، لیکن روپ نے اتفاقات نہ کیا۔ رانی نے الٹا روپ پر بد چلتی کا الزام لگا کر لڑکوں کو گھر سے نکلوا دیا۔ دونوں بھائیوں کی پہلی رات ایک جنگل میں بسر ہوئی۔ ہنسنت کے سانپ ڈس گیا اور روپ حسن اتفاق سے ریاست بھوپاولی کے لالہ راجہ کا جانشین بن گیا۔ لالہ ایک جوگی نے ہنسنت کے جسم سے سانپ کا زہر اتار دیا۔ کچھ مدت بعد ہنسنت نے ایک سوداگر کی مدد کی اور سوداگر نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔ اسی دوران میں محل پوری کے راجہ کی بیٹی مالتی ہنسنت پر عاشق ہوئی اور دونوں کی شادی کر دی گئی۔ ہنسنت سوداگر کے ساتھ جہاز میں سفر کر رہا تھا کہ سوداگر مالتی پر عاشق ہو گیا اور اس نے ہنسنت کو سمندر میں پھینک دیا۔ جہاں اسے ایک مگر بچھ نکل گیا۔ یہ مگر بچھ ایک ماہی گیر کے جال میں پھنسا۔ ماہی گیر نے مگر بچھ کا پیٹ چیر کر ہنسنت کو زندہ باہر نکالا اور بھوپاولی شہر میں جہاں کا راجہ روپ تھا، فروخت کر دیا۔ اس دوران میں سوداگر کے جہاز بھی بھوپاولی پہنچ گئے۔ ہنسنت نے ایک ماہن کے ذریعے مالتی کو اپنے حال سے آگاہ کیا۔ لالہ سوداگر مالتی کو شادی کے لیے مجبور کر رہا تھا۔ ہنسنت کا اشارہ پا کر مالتی نے سوداگر سے شادی کرنے کی یہ شرط رکھی کہ وہ اسے راجہ اور امراء شہر کی موجودگی میں روپ ہنسنت کا قصہ سنوائے۔ ڈھنڈورا اٹھایا گیا۔ ہنسنت نے بھییں بدل کر راجہ روپ کے دربار میں سب کے سامنے یہ قصہ سنایا۔ بالآخر دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا اور مالتی ہنسنت کو واپس مل گئی۔

خاتمہ :

یقین ہے جو پڑھے ہو چشم نہ نم تو رکھا نام میں افسانہ غم
گئی میں نے جو کہہ کر شوق کے سات ہو نہیں چودہ سو پوری جملہ احیات

مثنوی میں تسلسل موجود ہے۔ اختصار سے کام لیا ہے۔ اعداد بیان زیادہ
دکھائے نہیں۔ ہنست کے سانپ سے ڈسے جانے کی کیفیت ان اشعار میں ملاحظہ ہو:

چنگا جب روپ رشکِ باد پارا ہنست کو پیار سے اس نے پکارا
کہ ہو بیدار تو زہرہ جہیں اب مگنی نور سحر سے ظلمت شب
طاہت تن پہ جو دیکھی نمودار تو جانا ڈس گیا ہے مار غونوار (۲۲۰)

اردو نثر میں اس قصے کو "فسانہ روپ ہنست" کے نام سے کشوری لال
رکن نے لکھا۔ یہ کتاب دہلی سے ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی۔ کل صفحات ۸۰ ہیں۔ (۲۲۱)

اب شمالی ہندوستان کی بعض ایسی مثنویوں کا ذکر کیا جاتا ہے، جن کے
بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں اور جن سے براہ راست استفادے کا موقع
نہیں ملتا۔

مثنوی قصہ راجا رام اور کنول دی

بہار کے قصبہ پھولاری شریف کے ایک بزرگ حضرت آیت اللہ
جوہری (۱۷۰۷ء - ۱۸۰۱ء) نے راجا رام اور کنول دی کے مقامی قصے کو نظم کیا
تھا۔ سنہ تصنیف ۱۷۳۸ء ہے۔ مثنوی کا نام "گوہر جوہری" ہے، جس کا ذکر ایک
شعر میں یوں آیا ہے:

کیا ریختہ سچ یہ مثنوی رکھا نام میں "گوہر جوہری"

حضرت آیت اللہ جوہری کے معاصرین میں سے تھے۔ مثنوی کی
زبان صاف ہے، لیکن اسلوب پر بارہ ماہے کا اثر نمایاں ہے:

۲۲۰ مثنوی افسانہ نام، برچہ، مطبع نول کشور، گھنٹہ، ۱۳۸۲ء صفحات ۳۰

۲۲۱ افسانہ کتب، ص ۱۳۰

اساتذہ آیا لگا ہاول مگر جنے اندھیری رات میں بجلی چمکنے
گھٹا سادوں کی کاری جب پڑی جھوم مرے جی بچ برہا آکرے دھوم
اکارت جائے ہے میری جوانی بیا پردیس، یہ کیا زندگیانی (۲۲۲)

حضرت آیت اللہ اور ان کی مشنوی ”گوہر جوہری“ کے بارے میں مزید
معلومات درج ذیل ہیں :

ان کا پورا نام حضرت غلام سرور المعروف بہ شاہ آیت اللہ تھا۔ شاہ محمد
مقدم قدس سرہا کے بیٹے تھے، ۱۱۳۶ھ (۱۷۱۳ء) میں پیدا ہوئے۔ (۲۲۳) اردو
کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور شورش حلقص کرتے تھے۔ بقول عشقی
سرائی میں حلقص مذاقی تھا۔ (۲۲۴) اردو مشنوی ”گوہر جوہری“ میں جوہری حلقص
استعمال کیا ہے۔ چوہر اسی برس کی عمر میں ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء) میں انتقال کیا۔ مشنوی
گوہر جوہری کے علاوہ اردو میں ان کے مرثیے، منقبت، شہر آشوب اور قصائد
بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ (۲۲۵)

مشنوی گوہر جوہری کا ایک نسخہ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری اور ایک نامکمل
نسخہ شاہ مجتبیٰ حسن کے کتب خانہ بہار شریف میں محفوظ ہے۔ اس مشنوی کا مفصل
تعارف پروفیسر سید حسن عسکری نے رسالہ ”اردو، اپریل ۱۹۳۰ء میں کر لیا تھا۔ (۲۲۶)
مندرجہ ذیل معلومات اسی ماخذ کی بنا پر پیش کی جا رہی ہیں۔

مشنوی کا آغاز حمد و نعت سے ہوا ہے۔ اس کے بعد ”مدح خن“ ہے۔

- | | |
|-----|---|
| ۲۲۲ | سید حسن عسکری، اردو، اپریل ۱۹۳۰ء |
| ۲۲۳ | تذکرۃ الصالحین بحوالہ ”بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا“، ص ۲۳۸۔ سید حمید الدینی |
| | نظا، صدر شعبہ اردو، پٹنہ کالج کاجان ہے کہ سال ولادت جو تذکرۃ الصالحین میں ہے گج |
| | نہیں۔ قاضی عبدالودود، نواسے ادب، بمبئی، اکتوبر ۱۹۵۸ء، ص ۳۸ |
| ۲۲۴ | تذکرۃ عشقی مشمولہ، دو تذکرے، ص ۱۱۶ |
| ۲۲۵ | بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، ص ۲۳۸ |
| ۲۲۶ | ص ۲۲۵۔ ۲۶۰ |

اور مثنوی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پوری مثنوی مختلف بیانات اور داستانوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً: سیر گلشن، چرومرشد کی مدح، وصف عشق، داستان چرو، داستان گدا، داستان ملک ہریوگ، داستان عشق وغیرہ۔ ہر بیان یا داستان کی ابتدا مع ضروری خلاصے کے بحر متعارف میں چند شعروں پر ختم کر کے بحر ہزج میں مفصل بیان مع تمام واقعات نظم کیے گئے ہیں۔ مثنوی کی جان آخری قصہ یعنی ”داستان عشق“ ہے۔ جس میں کنول دئی اور راجارام کے عشق کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ پروفیسر سید حسن عسکری کا بیان ہے: ”مثنوی (گوہر جوہری) پر محمد افضل تھنچانوی کے بارہ مائے کا اثر خلاف واقعہ نہیں معلوم ہوتا۔ زبان ملتی جلتی ہے۔ فارسی ترکیبوں کا انداز، الفاظ کا استعمال، سب باتیں بکث کہانی میں بہت حد تک پائی جاتی ہیں۔ اس لیے قرین قیاس ہے کہ مصنف نے یہ مثنوی بکث کہانی کے طرز پر لکھی۔“

قصے کا خلاصہ یہ ہے کہ اکبر آباد میں ایک خوش رو نوجوان راجارام رہتا تھا۔ وہ ایک خوب صورت عورت کنول دئی پر عاشق ہو گیا۔ رفتہ رفتہ عاشق و معشوق دونوں آتش عشق میں جلنے لگے۔ ایک دن کنول دئی پوجا کے بہانے گھر سے نکلی۔ راہ میں کسی کے رونے کی آواز سنی۔ فوراً دل میں درد اٹھا:

اثر اس نام میں کیا کچھ بلا ہے ہلکسہ چٹنی دل کی صدا ہے
مرے جی سچ کیا کیا درد بانٹا کسی کانے گلے کا ہے خراٹا

کنول دئی اپنے عاشق کے پاس پہنچ گئی تو دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا:

جو کھولا آنکھ یار اپنے کو دیکھا دل و دلبر نگار اپنے کو دیکھا
جنوں بھڑکا پڑی دیوانگی جاگ چلے جی میں پکارا آگے رے آگ

محبت جب صبر و قرار کی حدوں سے آگے بڑھ گئی تو ایک رات راجا رام نے کنول دئی کو خواب میں دیکھا۔ دونوں میں کھوے کھاتیں ہو گئیں۔ کنول دئی نے راہ تھمائی کہ اپنے باپ کے ذریعے میرے والدین کو پیام بھجواؤ۔ وہ

منظور کر لیں گے۔ فرض ایسا ہی کیا گیا اور بہت کچھ انتظار کے بعد دونوں کی شادی ہو گئی۔

عاشق و معشوق خوشی خوشی رہنے لگے۔ لیکن چرخِ فتنہ پر در کو یہ کب منظور تھا۔ راجا رام کو کام سے باہر جانا پڑا۔ چنانچہ ہجر و فراق کے رنج و الم کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس موقع پر شاعر نے کنول دی کی زبانی بارہ ماہِ منظوم کیا ہے اور تفصیل کی جولانی دکھائی ہے۔ بارہ ماہ کیا ہے۔ جدائی کے آلام و مصائب کا ترپا دینے والا بیان ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اسلاخ آیا لگا بادل گر بنے	اندھیری رات میں بجلی چمکنے
سنگن پر برق نہیں ہے گا چمکتا	مرا شوقوں ستیں ہے دل پہڑ سنا
پیا بن میں بھری برسات روؤں	نہ ہے برساتھ کیونکر ساتھ سوؤں
ہرا جنگل ہوا پانی میں اور روکھ	مرا ہر دا گیا برسات میں سوکھ
گھٹا ساون کی کاری جب پڑی جھوم	مرے جی سچ بردا آکرے دھوم
کوئی جھومر کوئی گاویں ملا ریں	سب اپنے پیو سنگ کہنکیں دھما ریں
پیا بھہ گھر اگر آوے سہرا	چڑھاؤں اے خضر تیرا میں بیڑا

ایک برس کے چائیکہ انتظار کے بعد کنول دی کی مراد بر آئی اور راجا رام گھر آیا لیکن کنول دی لاغر اور نحیف ہو چکی تھی، بیمار پڑ گئی۔ علاج شروع ہوا۔ راجا رام نے بڑے ہاتھ پاؤں مارے لیکن اتفاق نہ ہوا اور موت کی گھڑی قریب آ ہی پہنچی۔ آخری وقت میں کنول دی نے راجا رام کو بلایا۔ فرض:

دم آخر میں وہ شوریدہ تصویر	ہوا معشوق سے چاکر بغل گیر
گلی کہنے کہ اے دیوانہ میرا	میں تیری شمع تو پروانہ میرا
کوئی ساعت میں آوے گی قیامت	میں جاتی ہوں سدا تو رہ سلامت
تری تہیں دیکھ کر آتی روائی	کہ دے گی اب اجل دلع جدائی
رہے گا کیوں کہ بے لیتی کے بھٹوں	پھرے گا کس طرح ہاموں پہ ہاموں

اور یہ کہتے کہتے دم نکل گیا۔ رونے دھونے کے بعد لاش کو جلانے کی جگہ لایا گیا اور چٹا کی آگ میں برگ گل سی وہ نازک بدن دیکھتے ہی دیکھتے راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ راجا رام کی نگاہوں میں دنیا تیرہ و تار ہو گئی۔ چند روز کے بعد لوگوں نے اسے خبر کی کہ راکھ سے ایک شعلہ نکلا ہے اور راجا رام، راجا رام کہہ کر پکارتا ہے۔ چنانچہ راجا رام وہاں پہنچا اور جب شعلہ نمودار ہوا وہ اس سے ہم آغوش ہونے کے لیے لپکا اور بھڑک کر فنا ہو گیا۔

دکو کثرت میں وحدت کا تماشا دو شعلے جوں ہوا اک شعلہ پیدا اس کے بعد مثنوی کا خاتمہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی عمن کاری، شیرینی اور گفتگویی ہے۔ گو ایک مثنوی میں کئی داستانیں بیان کی گئی ہیں، لیکن تسلسل میں کہیں فرق نہیں آنے پایا۔ اصل قصے میں مقامی ماحول اور معاشرت کی کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔ مثنوی کی زبان قدیم ہے اور بعض مقامات مشکوک بھی ہیں، لیکن جو اشعار صاف ہیں، لطف دے جاتے ہیں اور شاعر کی قادر الکلامی اور شیریں بھائی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

مثنوی طوطی نامہ

یہ مثنوی جعفر علی حسرت کے رشحاتِ قلم میں سے ہے۔ اشپرا نگر نے اس کا ذکر اپنی فہرست میں کیا ہے۔ نقد نو صفحات ۱۶۰ اور سنہ کتابت ۱۲۱۶ھ ہے۔ (۲۲۷) مشہور قصے، شک سب تھی (طوطی نامہ) سے، جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ مثنوی کسی قوتارام اور اس کی محبوبہ شکر پارہ کے عشق پر مشتمل ہے۔

آغاز:

یا الٰہی یہ عشق خانہ غراب کس نے مانگا تھا یاں کسے تھی تاب

۲۲۷ اشپرا نگر، ص ۲۱۰، نمبر ۲۲

اس کا ایک مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے میں ہے۔ کلیات حسرت نیچے نمبرج میں مشنوی طبعی نامہ کے شمول کا یقین نہیں۔ (۲۲۸) البتہ یہ مشنوی لکھنؤ کے نسخہ میں ہے۔ (۲۲۹)

مشنوی انشا

سید انشاء اللہ خاں، انشا نے ”رائی کھنکی اور کتور اودے بھان“ کی کہانی کی طرح غصیلہ ہندوستانی زبان میں ایک منظوم کہانی بھی کہتا چاہی تھی۔ قاضی عہد اودود کا بیان ہے: ”غیر مخطوط زبان کی مشنوی یا تو تمام نہ ہو سکی، یا تمام ہوئی تو اس کے کچھ اشعار اب تک نظروں سے پنہاں ہیں۔ یہ مشنوی کلیات انشا کے مطبوعہ نسخوں میں نہیں ہے اور یہی حال اس کے بیشتر مخطوطات کا ہے۔ اس وقت تک کلیات کے صرف دو قلمی نسخے ملے ہیں، جن میں اس مشنوی کے اشعار پائے جاتے ہیں اور دونوں کتب خانہ مشرقیہ پشتہ میں ہیں:

شمار ۱۳، ۱۲۳۰ھ کا مکتوبہ ہے اور شمار ۷، ۱۲۶۱ھ فصلی کا لکھا ہوا ہے۔ ... شمار ۱۳ میں عنوان ”مشنوی در لہجہ اردو“ ہے۔ (۲۳۰)

آغاز:

بنایا یہ سب جس نے ہووے بھلا سرا ہے اسے کیا کوئی جی جلا
بھلے لوگ اس کو سراہا کیے تو چپکے ہی چپکے کراہا کیے
اس نامکمل مشنوی میں کل ۵۵ اشعار ہیں۔ تمہید باغ حسنہ کے بعد لکھا ہے:

مجھے نیند آتی نہ تھی ایک رات مرے جی نے مجھ کو سنائی یہ بات
کہانی وہ کہیے کہ ہندی کے چھٹ نہ رکھے کسی اور بولی کی پٹ

۲۲۸ مکتوب قاضی عہد اودود بنام راقم الحروف

۲۲۹ اپنا

۲۳۰ معاصر شمارہ ۱، ص ۵۷

اس کے بعد خلیفہ ہند ستانی میں قلعہ نظم کرنے کی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ دوست احباب نے انھیں سننے کے بعد کہا کہ اگر تمہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی تو سب میں تمہاری ”ناک لوچھی“ ہو جائے گی۔ یہ بیان ۱۹ اشعار میں آیا ہے۔ قصے کا آغاز اس طرح کیا ہے :

ہوا ایک دولہا دلہن کا بیاہ	تو بڑھنے لگی دن بدن ان کی چاہ
جو چاہت ہوئی ایک کو ایک کی	جو آنے لگی لاج کو بھی ہنسی
چمکڑ جاتے تھے جو بھی اک گھڑی	تو لگتی تھی ساون کی ایسی جھڑی
ٹٹکتے تھے آنکھوں سے ان کی دھوئیں	اُٹل انھیں برسات میں جوں کنوئیں
جو کچھ چاہیے پاس تھا ان کے سب	پر ان کو یہ لپکا پڑا تھا کدھب
نہ بچتے تھے جب تک وہ روتے نہ تھے	بھڑنے کے دھڑکے سے سوتے نہ تھے
بھڑکنے لگی تھلاہٹ کی آگ	لگا ہونے آہیں میں گہرا سہاگ
ملوے سوسے بہت بڑھ چلے	لگے سوجنے بیکروں اڑ تلے
نیا دولہا تھا اور دلہن تھی نئی	تو اک سٹھ گھڑی کی لگن لگ گئی (۲۲۱)

کلیات انشا کے متذکرہ بالا نسخوں میں یہ مثنوی اسی شعر پر ختم ہو جاتی ہے۔ انشا نے کرداروں کے نام نہیں لیے، لیکن قصے کی اُٹھان سے ظاہر ہے کہ وہ مقامی رنگ کا کوئی قصہ بیان کرنا چاہتے تھے۔ یہ قصہ ان کا طبع زکو تھا یا کسی مقامی روایت سے ماخوذ تھا؟ اس سلسلے میں قیاس آرائی سے کام لینا غلط ہوگا۔ البتہ یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ اپنی مثنوی کہانی ”رانی کینگی اور کنور اووے بہان“ کی طرح وہ اس مثنوی کو بھی مقامی رنگ روپ میں پیش کرنا چاہتے ہوں گے اور اسے ”ہندی“ یا خالص ہندوستانی زبان میں بیان کرنے کے لیے انھوں نے مثنوی کے پلاٹ، کردار، مناظر اور واقعات کا جو نقشہ تیار کیا ہوگا، وہ ہندوستانی حراج اور ماحول کے مطابق ہوگا۔ لیکن انشا غالباً اپنی اس مثنوی کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔

مشنوی کنور و چندر کرن

مصنف، احمد علی، موتی لال ولد بہادر سنگھ کاتب نے یہ نثر گڑھ
مکتبہ میں ۱۳۳۰ھ میں نقل کیا۔ اور اوراق ۹۔ (۲۳۲)

مشنوی راجا چتر گٹ و رانی چندر کرن

از روشن علی، مکتوبہ ۱۸۸۰ء

آغاز:

یہی کرتا ہوں میں دل کو تسلی جدھر دیکھو اودھر اس کی تھنی
اس مشنوی کا مغلوطہ برٹش میوزیم میں روشن علی کی دوسری تین
مثنویوں (قصہ لال و بہراء قصہ طوطا و مینا اور قصہ نجمیہ) کے ساتھ ایک مجموعے
میں محفوظ ہے۔ (۲۳۳)

مشنوی راجا چتر گٹ و رانی چندر کرن

از: راغب اردوبدی

اس قصے سے متعلق اردو میں ایک اور مشنوی بھی لکھی گئی۔ مصنف
سمن لعل متخلص بہ راغب۔ یہ اردو کے کا باشندہ تھا۔ ہندوستان کے اس ہردلعزیز
قصے کو نظم کر کے راغب نے اسے سر بھری ایلٹ سے معنون کیا، جسے وہ اپنا
مرتبہ کہتا ہے اور جس کی شان میں چند قصیدے اسی مشنوی میں شامل ہیں۔ ایک
شعر میں اپنا متخلص یوں بیان کرتا ہے:

سمن لعل معروف ہوں در جہاں متخلص ہے راغب مرا دوستاں

۲۳۲ اردو ادبیات، جلد دوم، نمبر ۲۵۵، ص ۳۹

۲۳۳ 'علوم ہند، برٹش، ص ۲۸، نمبر ۵۹

مثنوی میں چند اشعار اردو ہے کی تعریف میں بھی ہیں۔ سنہ اختتام ۱۸۴۷ء، مخطوطہ برٹش میوزیم۔ (۲۳۳)

مثنوی قصہ گوئی چند

گوئی چند بھرتی کا یہ قصہ سب سے پہلے ہندی میں کسی شخص ”بیجا لال“ نے لکھا۔ (۲۳۵) ہندی کی دوسری مشہور روایتیں کشمن سنگھ (آگرہ ۱۸۶۷ء، دہلی ۱۸۷۹ء، (۲۳۶) کلکتہ ۱۹۰۷ء، (۲۳۷) کانپور ۱۹۱۰ء، (۲۳۸) اور سہدیو (پٹنہ ۱۸۸۲ء) (۲۳۹) کی ہیں۔ بارواڑی زبان میں اسے موتی لال نے لکھا (آگرہ ۱۸۶۹ء)۔ (۲۴۰) پنجابی زبان میں اس قصے کو دیوی دیال (لاہور ۱۸۷۰ء)، (۲۴۱) رام (لاہور ۱۸۷۱ء)، (۲۴۲) قاری رسم الخط میں (لاہور ۱۸۷۷ء)، (۲۴۳) اور شاکر داس (لاہور ۱۸۸۰ء) (۲۴۴) نے نظم کیا ہے۔

انہی پر شمار، مدہوش نے بیجا لال سے قصہ لے کر اسے اردو مثنوی کے پیرائے میں بیان کیا۔ (۲۴۵) مدہوش کی یہ مثنوی خاصی مقبول ہوئی اور بار بار

۲۳۳	جلوم پارت، برٹش، ص ۴۴
۲۳۵	جلوم پارت، برٹش، ص ۱۱۶
۲۳۶	اطریا ہندی، ص ۶۷، نیز ہندی کتب برٹش کالم ۹۰
۲۳۷	برٹش ہندی، ص ۱۶۶
۲۳۸	ایضاً، ص ۳۶۳
۲۳۹	ہندی کتب برٹش کالم ۱۵۳
۲۴۰	اطریا ہندی، ص ۶۷
۲۴۱	اطریا پنجابی، ص ۱۹
۲۴۲	ایضاً، نیز پنجابی کتب برٹش کالم ۱۳
۲۴۳	اطریا ہندی، ص ۶۹
۲۴۴	پنجابی کتب برٹش کالم ۳۰
۲۴۵	جلوم پارت، برٹش کتب، ص ۱۱۶

شائع کی گئی۔ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں اس کے دو ایڈیشن محفوظ ہیں جو دہلی سے ۱۸۷۶ء اور ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئے، پہلے کے صفحات ۲۸ اور دوسرے کے ۳۲ ہیں۔ (۲۳۶)

کتب خانہ انڈیا آفس لندن میں مثنوی گوپی چند از انبی پر شاہ مد ہوش کے مندرجہ ذیل پانچ ایڈیشن محفوظ ہیں۔

دہلی ۱۸۶۹ء، دہلی ۱۸۷۲ء، دہلی ۱۸۷۵ء، دہلی ۱۸۷۷ء، دہلی ۱۸۷۸ء (۲۳۷)

اس مثنوی کا ایک اور ایڈیشن اسٹیٹ لائبریری راپور میں محفوظ ہے۔ یہ ۱۸۷۱ء میں دہلی سے شائع ہوا۔

انہی پر شاہ مد ہوش، اس مثنوی کے علاوہ بعض دوسری کتابوں کے بھی مصنف تھے۔ ان کی تصانیف — ”سیرستان انگلینڈ“، ”کیان مالا“ اور قصہ ”سیرسری ناسکیٹ“ بھی برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔ (۲۳۸) تذکرہ آثار الشعراء ہندو میں ان کا ایک شعر درج ہے:

بیالاپی کے وحدت کا، تماشا دیکھ قدرت کا
جو اسے مد ہوش وملت کا اگر کچھ بھی مزا چاہے

بشاش نے انھیں ”مترجم پو تھی گوپی چند“ لکھا ہے اور اس کے علاوہ حالات نہیں بتائے۔ (۲۳۹)

اسی کتب خانے میں ”قصہ گوپی چند بھرتی“ کا ایک نثری نسخہ بھی موجود ہے۔ اس کا مصنف معلوم نہیں۔ یہ لکھنؤ سے ۱۸۷۲ء میں شائع ہوا تھا۔

۲۳۶ بیضا، ص ۳۱

۲۳۷ انڈیا سٹیوٹ، ص ۱۶۰

۲۳۸ بلوم ہارٹ، برٹش کتب، ص ۳۱

۲۳۹ بشاش، مدہوش پر شاہ، تذکرہ آثار الشعراء ہندو، ص ۱۴۰

تعداد صفحات ۲۰ (۲۵۰)

اس قصے کی دوسری نثری روایتیں یہ ہیں :

(۱) گوہنی چند اردو (نثری ڈراما) از نوشیرواں جی مہربان جی آرام، بمبئی۔ (۲۵۱)

یہ ڈراما بعد میں غلام حسین عرف حسینی میاں ظریف کے نام سے بھی شائع ہوا۔ (۲۵۲)

(۲) گوہنی چند اردو (ڈراما) فشی وناٹک پرشاد خاں بھاری، شاگرد راج دہلوی۔ (۲۵۳)

(۳) مہاراجہ بھرتی (اردو ڈراما) از محمد عبدالعزیز خانقہ لکھنؤی (۲۵۴)

(۳) راجہ گوہنی چند، مجبول المصنف، لاہور (۲۵۵)

اردو مثنوی میں اس قصے کو انہی پرشاد مدہوش کے علاوہ دو اور شاعروں نے بھی نظم کیا ہے :

مثنوی قصے گوہنی چند اردو، از محمد عمر خاں، صفحات ۴۸، دہلی ۱۸۷۸ء (۲۵۶)

مثنوی گوہنی چند اردو از لالہ جسونت رائے (مطبوعہ) (۲۵۷)

کتب خانہ انڈیا آفس لندن میں مدہوش کی ”سیرتاسکیت اردو منظوم“ کے دو ایڈیشن (سیالکوٹ ۱۸۷۶ء اور ۱۸۷۹ء) محفوظ ہیں۔ اس مثنوی کا نام

۲۵۰ ایضاً، ص ۱۰۲

۲۵۱ اردو ڈراما، عشرت رحمانی ص ۲۰۳، نیز انڈیا مطبوعات ص ۱۶۳

۲۵۲ اردو ڈراما، ص ۲۴۱

۲۵۳ اردو ڈراما، ص ۲۲۲

۲۵۴ اردو ڈراما، ص ۲۳۸

۲۵۵ فہرست کتب خانہ، ص ۳۲

۲۵۶ انڈیا مطبوعات، ص ۱۶۰

۲۵۷ مولفہ لاہوری، رام پور

”غمرۂ دل رہا“ ہے۔ (۲۵۸) اس کے علاوہ انڈیا آفس میں مد ہوش کی ایک اردو مشنوی قصہ ”توتا مینا“ بھی موجود ہے۔ یہ دہلی سے ۱۸۷۷ء اور ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی۔ (۲۵۹)

قصہ یوں ہے: دھارماگری کے راجا گوپی چند کی رانی رتن کنور نے بیٹے میں اپنے خاوند کو جوگی کے لباس میں دیکھا اور بہت پریشان ہوئی۔ راجا گوپی چند نہایت وجہ اور تکلیل تھا اور اس کے پاؤں میں ایک نورانی نشان بھی تھا۔ ایک دن راجا غسل کر رہا تھا کہ اس کی ماں میناوتی کی نظر اپنے بیٹے کے خوب صورت جسم پر پڑی جسے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ سوچنے لگی کہ جوانی میں گوپی چند کا باب راجا پدم سین بھی اسی طرح حسین و جمیل تھا۔ لیکن بڑھاپے کی خزاں نے گلشن شباب کی رنگینی ختم کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ جب موت ہر شے کا سلسلہ منقطع کر دیتی ہے اور نکاہری حسن و جمال اس قدر عارضی ہے تو اس سے دل لگانے سے حاصل؟ اتھاٹا میناوتی کا بھائی راجہ بھرتی گورو گورو کا تھ کے ساتھ اپنی بہن سے ملنے دھارماگری آیا۔ وہ راجہ پاٹ تیاگ کر جوگی ہو چکا تھا۔ اس نے بھی دنیا کی بے ثباتی اور جسم و جمال اور مال و دولت کی ناپائیداری کی باتیں سنائیں۔ چنانچہ میناوتی نے اپنے اکلوتے بیٹے گوپی چند کو بلایا اور کہا کہ وہ بھی سوہ مایا سے منہ موڑ کر جوگی بن جائے۔ کچھ دیر ماں بیٹے میں بحث و تکرار ہوتی رہی۔ گوپی چند نے اپنی سولہ رانیوں کا ذکر کیا کہ میں انہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ مجھے در در کی ٹھوکریں کھانے اور بھیک مانگنے پر کیوں مجبور کرتی ہو۔ میرے چلے جانے سے محلات میں کھرام بچے جائے گا۔ میری سلطنت برہا ہو جائے گی۔ ماں نے بتایا کہ دنیا سوہ اور ملیا کا جال ہے۔ یہاں کی ہر خوشی جھوٹی اور ہر مسرت عارضی ہے۔ نہات چاہتے ہو تو جوگ اختیار کر لو۔ بالآخر گوپی چند نے شاہی لباس اتار پھینکا اور گورو کا تھ کا چیلہ بن گیا۔ اُسے پہلا

حکم یہ دیا گیا کہ اپنے ساتھ محل کی چوکت پر کھڑے ہو کر بھیک مانگ آؤ۔ جو کل بادشاہ تھا، آج فقیر بن کر اکٹھ چگانے لگا۔ بچے کے ہاتھ میں کاسے گدائی دیکھ کر ماں کی مانتا جوش میں آئی۔ گدائی کے خیال سے وہ دھڑکیں مار مار کر رونے لگی۔ رانی رتن کنور بے ہوش ہو گئی۔ سب نے بھیڑا زور لگایا کہ کوئی چند کو روک لیں۔ لیکن اس نے کسی کی ایک نہ سنی اور گرد کے ساتھ شہر چھوڑ کر چلا گیا۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں، پھر تاپھراتا کوئی چند بنگال میں پہنچا۔ اس کی بہن چھپاوتی بنگال کے راجا اگر سین سے بیانی ہوئی تھی۔ ایک دن وہ محل کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ باندی نے اسے خیرات میں بہرے موتی دینا چاہے۔ کوئی چند نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ فقیروں کو تو روٹی کے ککڑوں سے غرض ہے۔ اس ناقدری پر باندی اس سے اُلٹنے لگی۔ بات چھپاوتی تک پہنچی۔ وہ خود دروازے پر آئی۔ جوگی سے سوال و جواب ہوئے۔ بالآخر پاؤں کے نورانی نشان سے بہن نے بھائی کو پہچان لیا۔ کوئی چند نے جوگی ہونے کی مرکزشت سنائی اور خیرات لے کر اپنی راہ چل دیا۔ چھپاوتی کو بھائی کی یہ حالت دیکھ کر ایسا سخت صدمہ ہوا کہ اس کے جاتے ہی وہ غش کھا کر گری اور گرتے ہی مر گئی۔ راجا اگر سین دربار سے بھاگا بھاگا آیا اور باندی کے بتانے پر کوئی چند کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بڑی جستجو کے بعد اس نے جوگی کو جا لیا۔ کوئی چند کو رنج ہوا کہ اس کی بدولت چھپاوتی کی جان گئی۔ چنانچہ اس نے گورکھ ناتھ کو یاد کیا اور گرد کی ڈمک سے چھپاوتی زندہ ہو گئی۔ غرض خاطر مدارات کے بعد اس نے بھائی کو خوشی خوشی رخصت کیا۔ یہاں قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ اس واقعے کا اثر اگر سین اور چھپاوتی پر گہرا ہوا اور وہ دونوں بھی راج پاٹ چھوڑ کر فقیر ہو گئے۔

انہی پرشاد ہوش کی مشہور "قصہ کوئی چند" کا نسخہ راجپور ۱۸۷۱ء میں دہلی سے مصور شائع ہوا۔ یہ ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے میں ۲۱ سطریں ہیں۔ مشہور کی ابتدا بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہوتی ہے۔ مصنف نے صراحت

کردی ہے کہ پہلے یہ قصہ ناگری میں تھا۔ اُس نے اردو میں منتقل کیا۔ شروع کے اشعار یہ ہیں:

کروں محمد معبود کیوں کر رقم زباں میں نہ طاقت نہ تاب قلم
جب قدر تھیں اس کی ہیں بے شمار وہی جانتا ہے جو ہے ہوشیار
گدا کو کرے شاہ، شاہ کو گدا کسی کو نہ پارائے چون و چرا
آغاز داستانِ سحر بیان:

چلا ساقیا ارغوانی شراب کہ دل سے مرے دور ہو چچ و تاب
تھا اک شہر دھارا نگر دل پسند کہ راجا تھا واں کا سری گوبی چند
عدالت سخاوت میں مشہور تھا پدم اس کے پا میں بھی اک نور تھا
خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے:

جو دیکھا کہ بھائی نہیں ٹھیرتا ہوئی پھر تو ناچار اور یہ کہا
تھیں کیا کسی کی محبت پڑی یہی خاصیت ہے وہ جوگ کی
منگائی وہ بیوجن کھلانے آنے مرض کیا بھائی کو بہن نے
ہوئے ہاکمال اور بن کو چلے کمال اپنا دکھلا بہن کو چلے
گورو چٹلا دونوں بہم مل چلے وہ کمال ہو خور جس کو چورا لے
ہوا قصہ گوبی چند اب تمام

الہی ہو مقبول ہر خاص و عام

اس کے بعد مد ہوش کا کہا ہوا قطعہ "تاریخ" ہے، جس سے مشنوی کا سال تصنیف ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) برآمد ہوتا ہے۔ دوسرا قطعہ "تاریخ عبداللہ خاں رسا" کا ہے۔ اس سے بھی یہی سنہ مستحب ہوتا ہے۔ خاتمۃ الطبع کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ انہی پر شاہ مد ہوش بیٹے تھے لالہ گروحداری لعل کے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ مشنوی میں قصے کے تمام واقعات بلا کم و کاست نظم کیے گئے ہیں۔ زبان و بیان کی سادگی و سلاست میں دہلوی لہجے کی ٹھٹھک ہے۔ لیکن مشنوی

کی ادنیٰ حیثیت نکھارنے پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔

یہ سیدھا سادا قصہ ہندوستانی مزاج کی ایک خاص کیفیت کا ترجمان ہے۔ اس میں زندگی کے ہادی پہلو پر روحانی پہلو کی فوقیت ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تیاگ کا بنیادی فلسفہ یہی ہے کہ انسان زندہ ان علاقوں ہے آزاد ہو جائے، نفسِ کلی کے عرقوں کے لیے خودی یا ہنکار کو فنا کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس قصے میں باطنی انقلاب کے بعد راجا کو بھیک مانگتے ہوئے دکھایا گیا ہے، جو تسلیم خودی کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عہدِ یوگ کے اس نظریے کی غلط تعبیر نے عوام میں بے عملی کے رجحانات پھیلانے میں مدد دی جن کا ردِ عمل کرم یوگ کے فلسفے میں ظاہر ہوا۔ لیکن اس کے باوجود صدیوں تک باطنیت کے یہ خیالات سادہ صوفیوں، سنتوں اور جوگیوں کی تعلیمات کی بدولت ہندوستان میں بہت مقبول رہے اور ان کی ایک جھلک اس قصے میں بھی مل جاتی ہے۔ قصے کا انتہائی اخلاقی ہے اور اس میں گرو کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ مختلف روایتوں میں گرو کی حیثیت سے مختلف نام آئے ہیں۔ لیکن دہلوی روایتوں میں زیادہ تر گوروں کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس لوک قصے سے متعلق اردو میں دو اور مشنیاں بھی لکھی گئیں۔ ایک کے مصنف لالہ جسونت رائے (۱۹۶۰ء) اور دوسری کے محمد عمر خاں (۱۹۶۱ء) ہیں، لیکن سر دست ہم ان کا تفصیلی تعارف پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

مثنوی راجا رگھبیر

از ہردیو سہائے۔ یہ ایک جوگی کا قصہ ہے، جس نے راجا رگھبیر کا سوانح بھرا تھا۔ یہ کتاب میرٹھ سے ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ (۱۹۶۲ء)

۲۶۰ مولت لائبریری، رام پور

۲۶۱ اطرا مطبوعات، ص ۲۶۰

۲۶۲ بلوم ہارٹ، برٹش کتب، ص ۱۱۱ (نکاح ۱۰۰، ۹۰، ۱۰۰، ۱۱۹، ۱۳۱)

مثنوی تحفہ مشتاق معروف قصہ بنگال

از نگاہ نگہ محکم بہ مشتاق۔ بلوم ہارٹ کا بیان ہے کہ اس مثنوی میں ایک مقبول عام کہانی کو اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ یہ مثنوی دہلی سے ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی۔ صفحات ۱۳۔ (۲۶۳)

مثنوی راجا کنور سین و رانی چتراولی

اس مثنوی کا مخطوطہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ مصنف کا نام اور سنہ تصنیف معلوم نہیں ہے۔ مثنوی کی زبان زیادہ قدیم نہیں۔ بلوم ہارٹ کا بیان ہے کہ مثنوی انیسویں صدی عیسوی میں لکھی گئی ہوگی۔

خدا ہے محمد، محمد خدا کہے اوس بن اوس کی کوئی کیا شا
تہمید میں مصنف لکھتا ہے کہ اس مثنوی کا قصہ ہندوستان میں بہت مقبول ہے۔ اس لیے میرے دل میں اسے نظم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ کل اوراق ۱۳۲۔ (۲۶۳)

مثنوی ہنس جواہر

ہنس جواہر کا یہ عوامی قصہ سب سے پہلے قاسم شاہ دریاہادی نے بھاشا میں لکھا۔ یہ سن ۱۷۸۸ء کے لگ بھگ زندہ تھے۔ (۲۶۵) اس کا مخطوطہ پٹنہ کی نمائش مخطوطات اردو میں پیش کیا گیا تھا (مملوکہ چڈت لودے شکر شاستری) اسے ۱۱۳۶ھ کی تصنیف بتایا گیا ہے۔ لیکن اس قصے کے ساتویں ایڈیشن (مملوکہ معراج دھولپوری) سے جو نامی پرنس لکھنؤ سے اردو رسم الخط میں ۱۹۰۶ء میں شائع

۲۶۳ ایضاً، ص ۱۰۷

۲۶۴ ایضاً، ص ۳۳

۲۶۵ ہندی ساقیہ کا اچھا، شکل، ص ۱۰۲

ہوا تھا، اس کا ۱۳۹ھ میں تصنیف ہونا پایا جاتا ہے۔ قصے کے چھوٹی بند سے مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو:

گیارہ سے اونچاس جو بابا جب یہ کھڑا پریم کب ساجا
پڑت چچ ناتھ نے اسے قادی رسم الخط میں مرہب کر کے لکھتو سے
۱۸۷۰ء میں شائع کیا تھا۔^(۲۶۶) اس قصے کے ۱۸۹۸ء، ۱۹۰۱ء اور ۱۹۱۰ء کے ایڈیشن
برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔^(۲۶۷)
۱۹۰۶ء کے ایڈیشن کے سرورق پر اس قصے کے اردو ترجمے کا اشتہار
یہ الفاظ درج ہے:

”قصہ ہنس جواہر اردو۔ اکثر صاحبان بسبب عدم واقفیت زبان بھاکا کے
اس عجیب و غریب قصے کے مطالعے سے محروم رہ جاتے تھے۔ ان کے واسطے
مطبع نے نظم اردو میں ترجمہ کرا کے چھاپا ہے۔“
بلوم ہارٹ نے ”ہمت“ کی مثنوی ہنس جواہر اردو، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۰۰ء
کا ذکر کیا ہے۔^(۲۶۸) مندرجہ بالا اشتہار غالباً اسی مثنوی کا ہے۔

قصہ ہنس جواہر کا ایک منظوم ترجمہ مولوی محمد احسن وحشی نگرانی نے
بھی کیا تھا۔ یہ ”آہ وحشی“ کے نام سے مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا۔^(۲۶۹)
”صدیق“ میں ”آہ وحشی“ کے علاوہ احسن وحشی کی دھجے اور مطبوعہ تصانیف کے
نام بھی ملتے ہیں۔ ان میں سے پانچ ناول ہیں اور چھٹی کتاب ”ذوقیات الاختیار“
میں ہندوستان کے مشاہیر صوفیاء و فقرا کی تاریخ ولادت و مقام مدفن سے متعلق
معلومات درج ہیں۔^(۲۷۰)

۲۶۶ اظہار ہندی، ص ۶۷

۲۶۷ ہندی ص ۱۵۰

۲۶۸ برٹش، خیمبر ص ۱۷۱

۲۶۹ فہرست معلومات نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۳۲ء ص ۷۰، مکتوب معراج و مولوی ری نظام سولہ

۲۷۰ صدیق، ص ۱۵

بلوم ہارٹ نے مشوئی ہنس جواہر اردو کے مصنف کا نام ”مہنت“ بتایا ہے اور مزید کسی قسم کی صراحت نہیں کی۔ کہانی عشق و محبت کے افسانے پر مبنی ہے۔ اس مشوئی کا تیسرا ایڈیشن، ۱۹۰۰ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ تعداد صفحات ۶۸۔ (۲۷۱) ”ہنس جواہر“ نام کی ایک فارسی مشوئی بھی برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس کے مصنف بے شک رائے، ذریعہ دہلوی ہیں۔ سند اختتام ۱۲۵۶ھ۔ مصنف تریچے میں اسے ”قل دمن ثانی“ قرار دیتا ہے۔ اس مشوئی میں ”ہنس“ شہزادہ بلخ اور بچن کی شہزادی کا افسانہ عشق بیان کیا گیا ہے۔ (۲۷۲)

قصہ برہہ بھسوکا و قصہ پریم لوکا

اسد علی خاں حمزہ اور نگ آبادی نے تذکرہ گل عجب میں فضل اللہ فضل کے ترجمے میں لکھا ہے کہ ”قصہ برہہ بھسوکا و قصہ پریم لوکا ہریان ہندی از دیوانہ گار است“ (۲۷۳) حمزہ نے اس کا نمونہ پیش نہیں کیا۔ غالباً یہ قصہ بطور مشوئی ہی نظم ہوا ہوگا۔

مشوئی گلدستہ عشق

”دکنی زبان کی اس مشوئی میں نواب چند کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ کسی شاعر فشی نے اسے فرخ سیر کے عہد میں ۱۱۲۲ھ میں لکھا اور سعادت خاں کے نام سے معنون کیا۔ آغاز: الہی جگت کا کر نہار توں
تعداد صفحات ۳۰۰، فی صفحہ ۱۵ بیت۔ (۲۷۴)

۲۷۱ بوم ہارٹ، ضمیر، ص ۱۷۱ (تکران (۱) ۵، ۲۶، ۱۳۱۱۲)

۲۷۲ راج، ص ۷۲۸

۲۷۳ تذکرہ گل عجب، ص ۱۳۲

۲۷۴ شہزادہ، ص ۷۳

مثنوی قلیلِ عشق

یہ مثنوی برٹش میوزیم، لندن میں دیوانہ پارش قلمی (اردو) کے شروع میں درج ہے (اوراق ۲ ب سے ۴۱ الف) شاعر کے حالات پر وہ خفا میں ہیں۔ البتہ کلام سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ نواب علی بہادر، ہاندہ کا ملازم تھا۔ قطعہ تاریخ کے مطابق مثنوی ۱۲۶۶ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس میں محبوب نامی ایک سوداگر کے لڑکے اور جوہر کی بیٹی کیجکی کی داستانِ عشق بیان کی گئی ہے۔ آغاز:

مجھے اپنے کرم سے یا الہی
دیارِ عشق کی دے بارشاقی (۲۷۵)

مثنوی قصہ ست کنور

قصہ ست کنور کو بہادر کے ایک شاعر ”جگر ناتھ سنگھ“ نے بطور مثنوی نظم کیا۔ اس کے ایک قلمی نسخے کا ذکر مولف ”مثنویاتِ راج“ نے کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ مثنوی کے شروع میں عنوان نہیں، بلکہ ”داستان بہ زبان ہندی آمیز“ لکھا ہوا ہے۔ مثنوی کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۲۱۱ فصلی میں تصنیف ہوئی۔ ترقیم یہ ہے:

”تمام شد نسخہ قصہ ست کنور تصنیف لالہ جگر ناتھ سنگھ بہ خط خام بہراجیت ولد جھو سنگھ مالک پنے دار موضع مندوم پور پرگنہ آردہ سرکار شاہ آباد بتاریخ پانزدہم ماہ سادون بروز جمعہ ۱۲۱۱ھ فصلی بہ عملداری کبھنی تحریر یافت۔“ قصے کے بارے میں مصنف نے اس قدر صراحت کر دی ہے کہ اسے انھوں نے اپنے دوستوں کی زبانیں سن کر قلم بند کیا۔ مثنوی چار سوانحیات پر مشتمل ہے۔ زبان غیر صاف اور ناہموار ہے۔ (۲۷۶)

۲۷۵ برٹش، م ۴۲

۲۷۶ مثنویاتِ راج، م ۴۳

مثنوی قصہ جمینی بھان

مثنوی قصہ جمینی بھان مہبول المصنف، صفحات ۴۰، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۳۸ء (۲۷۷)

مثنوی قصہ تہولن

مثنوی قصہ تہولن اردو از علی خاں، صفحات ۷۷۔ گجراتی رسم الخط میں، بمبئی ۱۸۷۲ء (۲۷۸)

مثنوی غمزہ دلربا یعنی ناسکیت اردو مظلوم

اس کے مصنف انی پرشاد ہوش ہیں، جن کا ذکر قصہ گوئی چند کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔ مثنوی غمزہ دلربا میں جوگی ناسی کیتو کا عوامی قصہ نظم کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک ایڈیشن سیالکوٹ سے ۱۸۷۶ء اور دوسرا ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا۔ (۲۷۹) انھوں نے یہ قصہ ہندی سے لیا اور ہندی میں چرن داس نے سنسکرت سے ترجمہ کیا، جو دہلی سے ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔ (۲۸۰)

۲۷۷ ایڈیا مطبوعات، ص ۱۶۰

۲۷۸ ایڈیا، ص ۱۶۳

۲۷۹ ایڈیا مطبوعات، ص ۱۶۳

۲۸۰ ایڈیا ہندی ۳۵

باب سوم

نیم تاریخی قصے

مثنویات ہیر و رانجھا

ہیر اور رانجھا کا افسانہ عشق پنجاب کا مشہور و معروف قصہ ہے اور اب تک خاص و عام میں مقبول ہے۔ پنجابی زبان میں اسے سب سے پہلے ”دمودر اور وڑہ“ ساکن قصبہ جنگ نے لکھا۔ اس نے یہ قصہ راجا رام کھتری عرف گہرل ساکن قصبہ بھیرہ، ایک بیٹی شاہد سے سند دمودر اس قصے کو اکبر کے زمانے کا بیان کرتا ہے۔^(۱) اس کے بعد اس قصے کو متعدد شاعروں نے اپنے اپنے طور پر بیان کیا۔ ان میں سے گورداس بھلا، گوہند سنگھ، احمد، شاہ چراغ، مقبل، وارث شاہ، فضل شاہ اور مولا بخش کشہ کی روایتیں قابل ذکر ہیں۔^(۲) پنجابی زبان میں ان تصانیف کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ پنجابی کے علاوہ سندھی زبان میں بھی متعدد شاعروں نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں ایک شخص حاجی احمد بخش خٹوم نے ہیر کا ”نمائش نامہ“ لکھا ہے۔ سید حیدر شاہ اور فقیر غلام نے ہیر رانجھا کی مکمل داستان نظم کی ہے۔ خلیفہ نبی بخش نے اس قصے پر مثنیٰ ایک ”سی حرنی“ تصنیف کی ہے۔^(۳)

سندھی زبان میں اس قصے کو حیدر بخش حیدر آبادی نے بھی لکھا۔ یہ کتاب کراچی سے ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی۔^(۴) ہندی زبان میں بھی اس قصے پر مثنیٰ دو کتابیں برٹش میوزیم لندن میں ہیں۔ ایک بھارس سے ۱۸۷۶ء میں شائع

۱ مولوی محمد شفیع، ۱۔ ک۔ م، اگست ۱۹۴۷ء

۲ ایضاً

۳ مامون، کراچی، جون ۱۹۵۹ء

۴ سندھی کتب، برٹش کالم ۷

ہوئی۔ (۵) (مجموع المصنف) دوسری بھینٹی سے ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے مصنف آنندی لال ہیں۔ (۶)

قصہ

راجھا (مغربی پنجاب) کے ایک گاؤں ہزارہ کا زمیندار جاٹ تھا۔ ہیر قریب کے ایک قصبے جنگ سیال کے سردار چوچک خاں کی بیٹی تھی اور حسن و جمال میں اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی۔ راجھے نے ایک رات خواب میں ہیر کو دیکھا اور صبر و قرار کھو بیٹھا۔ اس دوران راجھا کے باپ کا انتقال ہوا اور بھائیوں میں جائیداد کی تقسیم کے سلسلے میں جھگڑے پیدا ہو گئے۔ راجھا ان سے ٹک آ کے پانچ ہیروں کی زیارت کے لیے لٹان کو چل دیا۔ پانچ ہیر اسے راستے میں مل گئے اور انھوں نے راجھے کو ہیر کا بتا دیا۔ جنگ کے قریب پہنچتے ہی تانید نہیں سے راجھے کی ملاقات ہیر سے ہو گئی اور نگاہیں ملتے ہی دونوں ایک دوسرے کا کلہ پڑھنے لگے۔ راجھا سوائے گلہ بانی اور ہسری بھانے کے اور کچھ جانتا نہیں تھا۔ ہیر اسے اپنے باپ کے پاس لے گئی اور گلہ بانی کی خدمت پہرہ کرائی۔ دن رات کے قرب کی وجہ سے محبت کی شعلیں بڑھنے لگیں۔ ہیر کے والدین کو خبر ہوئی تو انھوں نے ہیر پر پابندی عائد کرنا چاہی، لیکن ہیر راتوں کو چھپ چھپ کر راجھے سے ملنے لگی۔ ٹک آکر ہیر کے والدین نے اسے گھر میں نظر بند کر دیا۔ راجھے کی معمولی حیثیت کے باعث اس سے ہیر کی شادی سالوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ انھوں نے اسے رنگ پورہ کے رئیس سیدا سے منسوب کر دیا۔ ہیر نے انکار کیا اور نکاح کے وقت قاضی سے بھی بحثی۔ لیکن پیش نہ گئی اور نکر و حیل سے نکاح ہو گیا۔ ہیر کو بھیڑ میں دوسرے ساز و سامان کے ساتھ بھینسوں کا ایک گلہ بھی ملا۔ لیکن بھینسیں راجھے سے اتنی مانوس تھیں کہ اس

۵ ہندی کتب، برحق کالم ۶۷

۶ ایچا، برحق کالم ۱۵۸

کے بغیر انھوں نے قدم نہیں اٹھایا۔ مجبوراً راجھے کو بھی بطور گلہ بان ہیر کے ساتھ بھیجا پڑا یہاں ہیر نے اپنے شوہر سیدا سے التفات نہ بردتا اور چھپ چھپ کے راجھے سے ملنے لگی۔ جب چہ میگوئیاں بڑھیں تو راجھا رنگ پورہ سے نکالا گیا۔ اور جب ہیر راجھے کے فراق میں ٹھٹھنے لگی تو راجھا جوگی کی وضع میں رنگ پورہ لوٹ آیا۔ ہیر نے اپنی ایک ہم راز سیکلی سے مدد لی اور موقع پا کر راجھے کے ساتھ رنگ پورہ سے بھاگ نکلی۔ دونوں راہ میں پکڑے گئے۔ معاملہ قاضی کے پیش ہوا اور قانون کی رو سے ہیر سیدا کے حوالے کر دی گئی۔ اس پر ہیر اور راجھا نے مل کر بددعا کی جس سے شہر میں آگ لگ گئی۔ بات حاکم شہر تک پہنچی اور اس نے راجھا کے حق میں فیصلہ کیا۔ اس کے بعد بقول دمودر ہیر اور راجھا دونوں دوش بدوش کسی نامعلوم سمت روانہ ہو گئے۔ مقبل کے ہاں بھی قصے یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن دمودر کے بعد کے بعض شاعر مثلاً آرام اور وارث شاہ کے ہاں قصے کا انجام قدرے مختلف ہے۔ آرام کی روایت کے مطابق ہیر اور راجھا قاضی کے فیصلے کے بعد جھگڑ آئے۔ راجھا شادی کی تیاری کے لیے اپنے وطن ہزارے گیا۔ ادھر ہیر سخت بیمار ہوئی اور مر گئی۔ وارث شاہ نے الیہ کی کیفیت شدید تر کرنے کے لیے اتنی بات اور بڑھا دی ہے کہ راجھے کی غیر موجودگی میں ہیر کے والدین نے اسے زہر دے دیا۔ ہیر کے انتقال کی خبر سننے ہی راجھے کا کلیجہ شق ہوا اور گرتے ہی مر گیا۔ (۷)

تاریخی حیثیت

اس قصے کی اصلیت کے بارے میں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کا بیان ہے: ”یہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے کے کسی واقعے پر مبنی ہے۔“ موصوف کا خیال ہے کہ راجھا کی روایت کا تعلق کرشن سے ہے۔ راجھا کی ونبھلی یا القودہ کرشن کی بنسری ہے جس کے فوق فطرت کرشمے اور کارنامے

ہندوستانی لوگ کھاناں کا جزو لاینک بن چکے ہیں۔ پانچ بھر، پانچ پانڈو ہیں۔ ہندو مسلم اختلاط کے بعد اس واقعے کا اولین افسانہ لکھنے والوں میں بھر پرستی عام ہوئی۔ انھوں نے حسن اتفاق کو ہر بار ہیروں کی تائید قہیبی پر محمول کیا۔^(۸)

ڈاکٹر موصوف کا یہ بیان محل نظر ہے۔ کیونکہ ہندوؤں میں پانچ پانڈوؤں کی پرستش کا کوئی خاطر خواہ ثبوت نہیں ملتا۔ مسلمانوں میں بھی پانچ بھر سے عقیدت کا رواج ہندو مسلمہ سابقہ سے بہت بعد کی چیز ہے۔ دمودر کے پانچ بھر نہ تو شیشی فرقے کے چچ تن^(۹) ہیں اور نہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی و خواجہ اجیری جیسے اہل تصوف کے مشائخ^(۱۰)۔ بلکہ یہ پانچ ملانی بھر ہیں^(۱۱) جن کا رسوخ اکبر کے زمانے میں انتہائی عروج پر تھا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ دمودر نے ہندو ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ راجھا کو کرشن کی طرح ہنسی ہاتھ میں لیے کار فرما دکھایا اور اس کے قبضین نے ذاتی اعتقاد کی بنا پر قیسے کو کرامت پرستیوں کا مرکب بنا دیا۔ اس کار خیر میں ہندو مسلمان دونوں شریک رہے ہوں گے۔ کیونکہ ”پانچ ہیروں کا احترام دونوں کا مشترک عقیدہ تھا۔“^(۱۲)

ڈاکٹر محمد باقر نے حال ہی میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہیر اور راجھا کا واقعہ عہد اکبری سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ پنجابی زبان

۸۔ موہن سنگھ بھٹ، نور نیل کالج میگزین، ۱۹۳، ص ۹۳

۹۔ حضرت محمد، بی بی فاطمہ، حضرت علی، امام حسن اور امام حسین

۱۰۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، خواجہ حسین الدین چشتی اجیری، خواجہ نظام الدین تولیا، نصیر الدین ابراہیم خیر اور سلطان محمود ناصر الدین

۱۱۔ بہاء الدین ڈکریا ملانی، شاہ دھارے عالم حضرت کھنوی، شد جس تبریز ملانی، شیخ جلال الدین محمد دوم لوہی اور بابا فرید الدین گنج شکر، حوالہ ماسبق

۱۲۔ Encyclopaedia of Religion and Ethics جلد ۹، ص ۶۰۰

چچ بھر کے دو واقعے فیروز پور اور ملتان میں سوجو ہیں۔ ان کا ذکر کھنوں کی مذہبی تحفوں میں بھی ملتا ہے۔ حوالہ ماسبق

میں دمودر نے اپنے قصے کو (راجا رام کھتری) ایک بیٹی شاہد سے من کر لکھا۔ دمودر نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ چونکہ خاں سیال (والد ہیر) اکبر کے زمانے میں ہو گزرا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کی تصدیق میں باقی کولابی کی سند لاتے ہیں۔ باقی کولاب صوبہ خٹکان (افغانستان) کا شاعر تھا۔ اس کی فارسی مشنوی ہیر رانجھا کا واحد نسخہ میٹشل میوزیم کراچی میں محفوظ ہے۔ باقی چونکہ ۱۵۷۹ء میں بعد اکبر، معصوم خاں کابلی کی بغاوت کے زمانے میں مارا جاتا ہے، یقیناً ہیر رانجھے کا واقعہ جو اس نے نظم کیا، اس کے انتقال (۱۵۷۹ء) سے پہلے رونما ہو چکا تھا اور اس کی شہرت دور دراز علاقوں تک پہنچ گئی تھی۔“ (۱۳)

ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ ہیر کا مقبرہ اس وقت جنگ سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر واقع ہے اور مرجع خلافت ہے۔ مقبرہ کی عمارت خاصی قدیم ہے اور آثار قدیمہ کے ماہرین نے تصدیق کی ہے کہ اس کی دیواروں کے طاقوں اور مقبرے کا طرز تعمیر سولہویں صدی کے مزارات سے ملتا جلتا ہے۔ (۱۴)

ہیر رانجھا کا قصہ انگریزی میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اسے سردار عبدالقادر آفندی نے ہیر قمرالدین صفت دہلوی کی فارسی مشنوی سے ترجمہ کیا۔ (۱۵) ہندی ہیر رانجھا منظوم کا ایک مہبول المصنف نسخہ انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے۔ یہ دہلی سے ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا تھا۔ (۱۶) ہریانہ زبان میں قصہ ہیر رانجھا کو پنڈت موتی رام و شیو چند نے گیتوں اور دوہوں میں لکھا۔ (۱۷)

ہیر رانجھا کے فارسی اور اردو نسخوں کی تفصیل یہ ہے:

۱۳	ماہ نوکراچی، دسمبر ۱۹۵۸ء
۱۴	ایضاً
۱۵	ہندوستانی قصے فارسی زبان میں، ص ۲۶۵
۱۶	انڈیا ہندی، ص ۶۸
۱۷	مطبوعہ شہنشاہی دہلی، دہلی، ۱۹۵۸ء

۶۔ مثنوی بہیر و رانجمن، میر قمر الدین منت، سال تصنیف ۱۱۹۵ھ (۲۵)

مجھے نے فہرست انڈیا آفس میں اس مثنوی کی تاریخ تصنیف ۱۱۹۵ھ بتائی ہے اور مادہ تاریخ "قصہ عشق بہیر و رانجمن" دیا ہے۔ (۲۶) مولوی محمد شفیع نے لکھا ہے کہ اگر "بہیر" اور "رانجمن" کے درمیان فرق ہے تو تاریخ ۱۱۹۶ھ ہوگی۔ (۲۷) بیان غلط ہے۔ فرق کے شمول ہی سے ۱۱۹۵ھ برآمد ہوتے ہیں البتہ انھوں نے قلمی نسخے سے جو تاریخ نقل کی ہے، وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

سال تاریخ اس کتاب شرف خواست منت ز عقل باتمیز
خودش از سر بدیہہ کہفت "قصہ عشق بہیر و رانجمن" کبیر
۲ + ۱۱۸۹ = ۱۱۹۱ھ

اس قلعے میں اگر بہیر اور رانجمن کے درمیان فرق پڑے تو سنہ تصنیف ۱۱۹۷ھ برآمد ہوگا۔

۷۔ مثنوی "کلشن راز عشق و وفا" منشی سندر داس آرام۔ سال تصنیف ۱۱۷۷ھ۔ یہ شخص پنجابی زبان کے مشہور شاعر وارث شاہ کا معاصر تھا اور اس نے اپنی مثنوی "بہیر وارث" سے ۹ برس پہلے مکمل کی۔ (۲۸)
۸۔ مثنوی لائق۔ خاتے پر اسے میر خسرو کی تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ "مکتوبہ مست یکہزار و نو صد و چہار" (۲۹)

۲۵ مجھے ۱۷۲۲ء منت نے اپنی مثنوی "سمتاز الدولہ جاسن" کے نام معنون کی ہے۔ رچرڈ جاسن انگریزی اور فارسی لغات کے مؤلف تھے۔ انھیں نے منت کو گورنر جنرل دارن ویلنگٹن کی خدمت میں پیش کیا اور ملک اشتراد کا خطاب دلویا تھا

۲۶ نمبر ۱۷۲۳ء، ص ۹۳۵

۲۷ پنجابی قصبے جاری میں، ص ۱۷۰، پارتی

۲۸ مولوی محمد شفیع، دیکھ۔ مہ، اگست ۱۹۲۷ء

۲۹ ایضاً

قاضی فضل حق کا بیان ہے کہ ”مصنف کا نام جو کاتب نے خاتے پر ”میر خسرو“ لکھا ہے، یقیناً غلط ہے اور دراصل یہ کتاب لائق کی تصنیف ہے۔“ (۲۰) ”لائق کا صحیح نام معلوم نہیں۔ ممکن ہے یہ محمد مراد لائق ہی ہو جو مشہوری دستور ہمت (کامروپ و کام (D) کا مصنف ہے اور جس کا ذکر شیخ انجمن میں ملتا ہے۔“ (۳۱) اشہر انگریز نے تذکرہ محمد یوسف کے حوالے سے لکھا ہے کہ لائق ہمت خاں کے بیٹے خان جہاں کا تخلص تھا۔ وہ آگے چل کر یہ بھی لکھتا ہے کہ لائق محمد عاشق کا تخلص تھا، جو ہمت خاں کے ملازمین میں سے تھا۔“ (۳۲)

۹۔ مشہوری عظیم الدین خصوصی ۱۲۱۳ھ

۱۰۔ مشہوری ضیاء الدین ضیا ۱۲۱۵ھ

۱۱۔ مشہوری آزاد ۲۶-۱۲۱۶ھ

۱۲۔ مشہوری نواب ولی محمد خاں ۲۷-۱۲۲۶ھ (۳۳)

۱۳۔ طویل قطعہ فقیر قادر بخش بیدل ۱۲۹۳ھ

نمبر شمار ۹ سے ۱۲ تک کی چار مشہوریوں اور فقیر قادر بخش بیدل کے طویل قطعے کی تحقیق کا سہرا سید حسام الدین راشدی مرتب تذکرہ مقالات الشعرا مولفہ میر علی شیر چانچ خصوصی کے سر ہے۔ راشدی صاحب نے ان منظومات کی نشان دہی ترجمہ احمد یار خاں پیکتا کے حواشی میں کی ہے۔ (۳۴)

۱۴۔ مشہوری نڈائی یا ساقی (ناقص نسخہ) کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی،

۳۰۔ پنجابی قصے فارسی زبان میں، ص ۱۰۰/۱۰۱

۳۱۔ شیخ انجمن، ص ۳۱۱

۳۲۔ اشہر انگریز، ص ۴۷۵

۳۳۔ نمبر شمار ۹ سے ۱۲ تک کی چار مشہوریاں سندھی لہجی پورٹ نے حنیفہ ہوشیارپوری سے مرتب

کرا کے ”مشہوریاں ہیر درانچھا“ کے نام سے کراچی سے جلالی میں شائع کر دی ہیں

۳۴۔ تذکرہ مقالات الشعراء، ص ۸۸۲

بنگال۔ مکتوبہ ۱۲۴۸ھ (۳۵)

۵۔ نگاریں نامہ از کنھیا لال ہندی۔ یہ مثنوی و کنویر یہ پرنس، لاہور سے ۱۲۹۹ھ میں شائع ہو چکی ہے۔

نگاریں نامہ کا سنہ انتظام ”پردہ نظم ہیر و رانجھا“ یعنی ۱۸۸۱ء ہے۔ (۳۶)

نشر:

۱۔ گورداس کھتری (قوم کوہلی) ساکن قصبہ سنگھوہ ۲۱-۱۱۲۲ھ۔ یہ قصہ پنجابی زبان کی اولین روایت ”ہیر و مودر“ پر مبنی ہے۔ (۳۷)

۲۔ خسارام خوشابی ۱۱۵۷ھ (۳۸)

۳۔ سراج الکبیت از عبرتی عظیم آبادی ۱۲۵۲ھ (۳۹)

۴۔ محبت نامہ (متر مسجع) از فشی شیوک رام عطارو غنصوی ۱۸۵۰-۹ھ (۴۰)

اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ یونیورسٹی لاہور میں، علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ اس میں مصنف کا نام شیوک رام دیا گیا ہے۔ (شیوک رام نہیں) کتاب کا نام بھی محبت نامہ نہیں بلکہ ہیر نامہ لکھا ہے۔ اس نسخے کے کاتب حسام الدین نے ترقیے میں دعویٰ کیا ہے کہ موجودہ نسخہ اس نے نسخہ ”مصنف مکتوبہ ۱۲۴۱ھ سے نقل کیا ہے۔ (۴۱)

۴۵ ایشیاٹک نمبر ۹۱۸

۴۶ پنجابی قصے زبان فارسی میں، ص ۱۸۹

۴۷ مولوی محمد شفیع، دکن۔ مہ۔ اگست ۱۹۲۷ء

۴۸ راج، ۱۷۷۰ء نیز کرنل نمبر ۱۱۸

۴۹ کاظمی فضل حق، اردو، ۱۹۳۰ء، ص ۷۱۸

۴۰ بحوالہ نو، جون ۱۹۵۹

۴۱ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، لبریری، جلد ۳ / ۸۲ مکتوبہ ڈاکٹر محمد الدین احمد، اردو، نام مزاف

۵۔ داستانِ نثر از علی بیگ ۱۲۳۰ھ (۱۸۴۲ء)

اردو نسخے

نثر:

- ۱۔ ہیر رانجھا از حکیم نرائن رند دہلوی برادر بھتی نرائن جہاں۔ (۴۳)
- ۲۔ ہیر رانجھا از مقبول احمد خلف قدرت احمد فاروقی گویا موی۔ ۱۸۳۸ء دہاسی نے لکھا ہے کہ یہ مخلوط فارسی اردو نظم و نثر میں ہے۔ دہاسی نے اس کا فرانسیسی ترجمہ ریویو دی اورینٹ اے دی المیریا (ستمبر ۱۸۵۷ء) میں شائع کیا۔ (۴۴) اصل کے دیگر ایڈیشن: ہندو پریس دہلی ۱۸۷۳ء (۴۵) دہلی ۱۸۷۶ء (۴۶)
- ۳۔ ”ہیر رانجھا اردو نثر“ نسخہ برٹش میوزیم۔ اس کے ترقیے میں لکھا ہے کہ یہ کہانی غلام سردار الدین سرشتہ دار نے رچنگ کے گوسائیوں سے سن کر قلم بند کی۔ مکتوبہ رچنگ ۲ جنوری ۱۸۵۰ء (۴۷)
- ۴۔ ہیر رانجھا از ایم۔ اسلم، مطبوعہ کلاہور ۱۹۵۰ء۔
- ۵۔ ہیر رانجھا اردو (ڈراما) از حافظ محمد عبداللہ، ریکس فلیچ پور، مہتمم لائٹ آف انڈیا تھیٹر یکل کمیٹی، آگرہ (۴۸)
- ۶۔ ہیر رانجھا اردو (منظوم ڈراما) از رونق بنارسی ۱۸۸۰ء (۴۹)

۴۲	بحوالہ ملوث، جون ۱۹۵۹ء
۴۳	۱۷۷۷ء
۴۴	دہاسی، خطبات ص ۱۵۶
۴۵	اردو ۱۹۴۰ء، ص ۷۲۱
۴۶	بلوم ہارٹ، برٹش کتب ص ۱۹۵
۴۷	بلوم ہارٹ، ص ۵۹ نمبر ۱۰۲
۴۸	اردو ڈراما مشرتہ دہلی، ص ۲۲۲
۴۹	ایضاً، ص ۲۲۸

۷۔ معشوقہ پنجاب (قصہ ہیر رانجھا نثر اردو) از چودھری الفضل حق (۵۰)

۸۔ ہیر رانجھا (اردو نثر) از ایم۔ ایم۔ والی خادم۔ مطبوعہ نرائن دت
سبگل لاہور، سنہ ۲ (۵۱)

لظم :

۱۔ ہیر رانجھا (قلمی) از نجیب الدین نجیب۔ اوراق ۳۹۔ منظر ۱۲۸
ترقی اردو ہند، علی گڑھ۔ سنہ کتابت درج نہیں۔ (۵۲) اس مثنوی کا ایک نسخہ کتب
خانہ رضائیہ رام پور میں بھی ہے۔ اوراق ۳۸۔ مکتوبہ ۱۴۳۹، (۵۳)

۲۔ ہیر رانجھا (قلمی) مول چند مخلص بہ نئی، دہلوی۔ سنہ تصنیف
۱۸۱۳ء سنہ کتابت ۱۸۴۳ء اوراق ۹۲، کتب خانہ رضائیہ رام پور (۵۴)

۳۔ ”قصہ ہیر و رانجھا“ از مولوی کرم الہی بھوپالی۔ یہ پنجاب پریس
سیالکوٹ سے ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔ تعداد صفحات ۲۳۳ (۵۵)

۴۔ ”آہلہ حرارت عشق“ یا ”ارمغان گدا“۔ از صوفی عبدالغفور،
قیس۔ یہ ترجمہ ۱۹۰۹ء میں اسٹیم پریس آگرہ (۵۶) سے لور ۱۹۱۱ء میں کانپور سے
شائع ہوا۔ (۵۷) تعداد صفحات ۲۷۲

۵۰	صدیق، ص ۲۴
۵۱	فہرست کتب خانہ، ص ۳۵
۵۲	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، نشان ۱۰۲/۱۵۷
۵۳	کتب خانہ رضائیہ، رام پور، نشان ۵۶۰ ج
۵۴	کتب خانہ رضائیہ، رام پور، نشان ۵۷۰، برائے فتح دیکر، قلم لاہوری، علی گڑھ، ذخیرہ سر سلیمان ۱۰۹
۵۵	مخزنہ قلم لاہوری، علی گڑھ
۵۶	ایضاً
۵۷	بحوالہ اردو، ۱۹۳۰ء ص ۷۳۱

- ۵۔ ہیر رانجھا از رفیع خاور، ادارۃ مطبوعات پاکستان، کراچی۔
۶۔ مثنوی ہیر و رانجھا اردو، معتمد میر فضل علی۔ قلمی نسخہ پٹنہ
یونیورسٹی۔ اردو نمائش پٹنہ، منعقدہ ۱۹۵۹ء میں پیش کی گئی۔

مندرجہ بالا قدیم مثنویوں میں سے کرم الہی اور قیس کے ترجمے پنجاب میں اور نجیب اور غشی کے ترجمے پنجاب سے باہر لکھے گئے۔ ان کے مصنفوں نے اپنے مآخذ کے بارے میں کوئی صراحت نہیں کی۔ قرینہ یہ ہے کہ پنجابی مصنفوں کے سامنے یا تو پنجاب کی عوامی روایت ہوگی یا دودور، متقبل اور وارث شاہ کی پنجابی منظومات ہوں گی۔ نجیب اور غشی کے ترجمے چونکہ پنجاب سے باہر لکھے گئے اس لیے ممکن ہے ان کا مآخذ پنجابی روایتیں نہ ہوں۔ یہ اس زمانے کی تصنیف ہیں جب فارسی ادبی زبان کی حیثیت سے سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ گمان غالب ہے کہ ان نسخوں کے مصنفوں نے فارسی مثنویوں سے استفادہ کیا ہوگا۔ مول چند غشی کی اردو مثنوی اور سندھ داس آرام کی فارسی مثنوی میں گہری مطابقت پائی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہیر رانجھا کا قصہ زبان زد خاص و عام رہا ہے اور اتنی بار لکھا گیا ہے کہ مختلف نسخوں میں باہمی مشابہت تلاش کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ قصے کی جزئیات میں ہر مصنف نے اپنی طبیعت کا زور دکھایا ہے اور اسے اپنے اپنے انداز سے بیان کیا ہے۔ متاخرین شاعروں نے تو اپنے زمانے کے تہذیبی رجحانات کے زیر اثر ہیر کے کردار کو تصوف کے رنگ میں ایسا گہرا رنگ کہ عشق و محبت کا ایک سیدھا سادہ قصہ سلوک و معرفت کا صحیفہ بن گیا۔

مثنوی ہیر رانجھا، غشی

مول چند غشی، شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد تھے۔ (۵۸) انھوں نے ۱۲۲۵ھ میں شمشیر خانی کا ترجمہ قصہ خسروانِ غم یا شاہنامہ اردو کے نام سے

کیا۔ (۵۹) اس میں ۹ ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔ برٹش میوزیم میں اس مثنوی کے چھ مطبوعہ ایڈیشن محفوظ ہیں۔ (۶۰) ہیر و رانجھا کے علاوہ ان کی ایک اور مثنوی سام نامہ (۱۲۳۷ء) بھی ہنوز راج پور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔

غشی کی مثنوی ہیر و رانجھا کے دو محفوظ دستیاپ ہوئے ہیں۔ علی گڑھ کا نسخہ (۶۱) نہ صرف اول و آخر سے ناقص ہے بلکہ بے حد بے ترتیب ہے اور کسی جلد ساز کی کور ذوق کا شکار ہو گیا ہے۔ دوسرا نسخہ رام پور کا ہے (۶۲)۔ یہ ناقص الاول ہے۔ مثنوی کا آغاز ”مناجات بدرگاہ حبیب الدعوات“ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد چند اشعار ”نعت جناب رسالت پناہ محمد رسول اللہ“ میں ہیں۔ اس زمانے کے مخلوط تہذیبی اور ادبی ماحول کے غیش نظر ایک ہندو مصنف کا نعت رسولؐ لکھنا باعث حیرت نہیں۔ نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

قنائے دل ہے یہ صبح و سہا کہ اس آستانے پہ ہوں چہ سا
کہ ہے خاک کو جس کی جوں مہرتاب نہیں اس کے روکش بلند آفتاب
سر سرداں سپد المرسلین درفشندہ خورشید ایمان و دیں
محمدؐ کہ ہے ختم پیغمبراں جناب اس کی ہے قبلہ گاہ جہاں
محمدؐ نہیں کوئی جس کا عدیل جناب اس کی ہے مہبط جبرئیل

اس کے بعد محمد اکبر شاہ ثانی اور ممتاز محل بیگم کی مدح ہے، جس میں شاعر نے صراحت کر دی ہے کہ اس نے یہ قصہ ممتاز محل بیگم کی فرمائش پر نظم کیا۔ قصے کا آغاز ہندوستان کی تعریف سے ہوتا ہے :

تماشا ہے اقلیم ہندوستان پہ خوبی و لطف انتخاب جہاں

۵۹ دکن، طلبات، ص ۱۷۳

۶۰ بلوم ہاٹ، برٹش کتب، ص ۱۸۲

۶۱ لندن، لائبریری، ذخیرہ سرسلیمان نمبر ۱۰۹

۶۲ مکتب خانہ رضائی، رام پور، نشان ۵۷۰

سرپا لطافت سرپا بہار بہار چمن ہودے جس پر غار
جب سر زمیں ہے مسرت فزا نہایت ہے دلچسپ اور دل کشا
جسے دیکھیے سو طرح دار ہے پری چہرہ ہے بلہ رخسار ہے

فشی اور سندرداس آرام کے فارسی قصے میں گہری مراثت ہے۔ غالباً فشی کے پیش نظر آرام کا قصہ رہا ہوگا۔ گو اس سلسلے میں فشی نے کوئی صراحت نہیں کی۔ لیکن قصے کے انجام سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ آرام اپنا قصہ ہیر رانجہ کی موت پر ختم کرتا ہے اور اس کے بعد ایک حاجی کی روایت نقل کرتا ہے۔ یہ حاجی پنجاب سے حج کے لیے گیا تھا۔ واپسی میں جہاز غرق ہو گیا اور یہ ایک مچھ کے سہارے کنارے پر آگیا۔ یہاں ایک لقا و دوں صحرا میں جب بھوک پیاس سے اس کی جان لیوں پر آگئی تو ہیر اور رانجہ اس کی مدد کو آئے اور چشم زدن میں اسے پنجاب میں پہنچا دیا۔ شاعر ہیر اور رانجہ کو ولایت کا درجہ عطا کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ اس طرح کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیر رانجہ ابھی تک زندہ ہیں۔ آرام کے سوا دوسرے مثیل اور وارث کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ مول چند فشی الہٰی اپنی اردو مثنوی کا خاتمہ اسی روایت پر کرتا ہے:

وہ دونوں بہم صورت ذی حیات جاباں میں پھرتے ہیں دن اور رات
ہنکھم خداوند شام و بچہ بتاتے ہیں بجولے ہوؤں کو وہ راہ
نظر آوے جو کوئی گم کردہ راہ تو آکر وہیں ہم ہنکھم راہ
طرح خضر کے اس کے ہوں رہنما کریں دام رنج و الم سے رہا
اس سے شبہ ہوتا ہے کہ آرام کی نظم فشی کے سامنے تھی، کیونکہ ہیر رانجہ کی یہ سحرانوردی اور گم کردہ راہوں کی رہنمائی آرام کے علاوہ اور کسی نے نہیں بیان کی۔

فارسی شاعروں کی طرح فشی نے بھی مثنوی میں جابجا غزلیں شامل کر دی ہیں۔ اور ابواب کے طویل عنوان قائم کیے ہیں۔ سرخیاں فارسی نثر میں

ہیں۔ یوں مشنوی کی زبان سادہ اور اشعار رواں ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو :

جو بھینسوں کو لے کر بوتھ سحر سوے دشت چلن وہ خست جگر
تو یہ شوق سے دیکھتی تھی اودھر وہ دل دار جب تک کہ آتا نظر
نظر سے نہاں جب کہ ہو جائے تھا تو جی ہیر کا سخت گھبرائے تھا
وہیں باندھ کر دل میں اس کا خیال یہ کہتی تھی وہ ہا دل نہ ملال
کہ افسوس بیٹھوں میں ایوان میں پھرے تو خراب اس بیابان میں
مرے ہم فقیں ہوویں انساں یہاں تجھے وحشیوں سے ہو صحبت وہاں
ستاتا ہے ہر لحظہ حیرا فریق جدائی تری مجھ پہ ہے سخت شاق^(۶۳)

مشنوی ہیر رانجھا، نجیب

نجیب الدین نجیب نے اپنی مشنوی میں ہیر کے والد کا نام چوچک کے بجائے جموجک لکھا ہے۔ نجیب کے قصے میں ایک اور اختلاف یہ ہے کہ عشق کی ابتدا رانجھے کے خواب سے نہیں بلکہ ہیر کے خواب سے ہوتی ہے۔ ہیر خواب میں رانجھے کو ہماری بھانجا دیکھتی ہے اور دل دے بیٹھتی ہے۔ پھر ہیر اور رانجھے کی پہلی ملاقات حسن اتفاق کا نتیجہ نہیں بلکہ ہیر قاصد بھیج کر رانجھے کو بلواتی ہے۔ مزید یہ کہ ہیر کا ڈولا جب سرال پہنچتا ہے، تو ہیر لباس عروسی کی جگہ جوگن کی کفنی میں دکھائی دیتی ہے۔ ہیر کا شوہر اسے بدشگونئی سمجھ کر ہیر سے باز پرس کرتا ہے، تو وہ کہتی ہے :

سنجھل ہوش کر اسے سب بے ادب نہ دے اپنے تئیں اس طرح تاب و تب
یہ تاق کی دل سے ہوں دور کر پرانی امانت پہ بس دل نہ دھر
نہ کر طمع دل میں بحق کریم نہیں حیرے قاتل یہ دُرِ نیم !

ہیر ایک خط میں رانجھے کو لکھتی ہے :

سنی جو تری بانسری کی صدا ہوا جب ہی سے دل مرا ہوا
نہیں تیری فرقت سے کچھ دل میں تاب ہوا دل مرا بل کے مثل کباب
تجھے اپنی اس بانسری کی قسم تجھے اپنی اس دلبری کی قسم
مثنائی سے تشریف یاں لائے اس عاجز پہ اشفاق فرمائیے
جو کل چلتے صاحب تو اچھے چلو جو واں کھڑے یاں آکے پانی پیر

نجیب کے ہاں قصہ راحت انجام ہے۔ نجیب، آرام اور وارث شاہ کی
طرح قصے کو ہیر اور رانجھا کی موت سے الیہ کا رنگ نہیں دیتا بلکہ اسے داسودر
اور مقبل کی روایات کے مطابق قاضی کے فیصلے پر ختم کر دیتا ہے۔ اس کے بعد
ہیر رانجھا دونوں کسی نامعلوم سمت چل دیے اور غائب ہو گئے۔

رہے ڈھونڈتے ان کو پیر و جواں نہ پلایا کسو نے بھی ان کا نشان
میاں رکھے ہم کو بھی در خوف و بیم خدا ان کے انجام کا ہے عظیم
فرض سب کا یہ ہے یہاں سے گئے یہاں سے گئے، اس جہاں سے گئے (۱۳)

اس شعر پر مثنوی کا خاتمہ ہے۔ شاعر کئی جگہ اپنا تخلص نجیب استعمال
کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مغلوطے سے مصنف کے بارے میں کوئی معلومات
حاصل نہیں ہو سکی۔

مثنوی ہیر رانجھا، کرم الہی

کرم الہی کی یہ مثنوی ہیر وارث شاہ سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے۔ رانجھا
والد کی وفات کے بعد جب وطن سے جانے لگا ہے تو اس کی بہنوئی اسے
رد کرتی ہیں۔ اس کا ذکر سوائے وارث شاہ کے اور کسی نے نہیں کیا۔ کرم الہی اس
کا نتیجہ کرتا ہے۔ لہٰذا ملاح سے رانجھے کی ملاقات اور سوال و جواب، نیز ہیر اور

قاضی کا مباحثہ بھی وارث شاہ سے ماخوذ ہیں۔ وارث شاہ نے قصے کو زیادہ المیہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ انجام کار ہیر کو زہر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا باپ رانجھے کو خط میں لکھتا ہے کہ ہیر کا انتقال پیٹے سے ہوا۔ رانجھا مگر یہ سناں ہیر کی قبر پر آتا ہے اور :

یہ قدرت خداوند رب القدرے نکلا وہیں ہاتھ پدر منیر (کذا)
لیا چوم رانجھن بعد آرزو پکڑا وہیں ہاتھ آں ماہرہ (کذا)

اور اس طرح شاخ فکرت اپنی اصل کے ساتھ پیوند ہو گئی۔

اس مشق کا پایہ ادبی حیثیت سے بہت پست ہے۔ زبان اکثر غلط اور بیان ڈولیدہ ہے۔ لیکن شاعر چونکہ وارث شاہ کا متبع ہے، اس لیے کہیں کہیں موثر اشعار بھی اس کے قلم سے نکل گئے ہیں۔ مثلاً رانجھا ہزارے جاگر شادی کی تیاری میں مصروف ہے۔ ادھر ہیر کے والدین اسے زہر دے دیتے ہیں اور وہ موت کی گھڑیاں گن رہی ہے۔ اس کا نقشہ یوں کھینچتا ہے :

کرے یاد رانجھن کو ہو کر مذحاج مرے یاد تجھ کو نہ آیا خیال
مرے دل کے پارے مرے نور جاں چلی ہیر حیری متا سب نکال
ذرا دیکھ لے رنگ رخسار کا میں پایا نہیں جلوہ دیدار کا
مری زلفیں بکھری یہ دوش پر تو کیوں چھوڑ مجھ کو گیا بے خبر
ذرا دیکھ لے میری آنکھوں کے تار جوں سادوں مینے میں ہیر بہار
اور سہیلیوں سے کہتی ہے :

مرے رانجھنے کو بتائی خبر ترے غم میں گزری ہے وہ سیم بر
تجھے یاد کرتی رہی صبح و شام ترے عشق میں چھوڑی دنیا تمام
ماں سے یوں خطاب کرتی ہے :

مرا جوڑاقل تھا رانجھن کے ساتھ تو کی خود نمائی دیا اور ہاتھ

مرا دل زبا انتھاری کرے بہا کی وہ گھر میں تیاری کرے
مرا اب بہا موت کے ساتھ ہے مرا رانجھا ہی مرا ناتھ ہے (۶۵)

مثنوی آبلہ حرارتِ عشق

عبدالغفور، قیس کی مثنوی کسی فارسی ترجمے پر مبنی ہے، جس کے نام کی
مراحت مصنف نے نہیں کی:

قدیمی زبان اس کی تھی فارسی اور پنجابی میں لکھ گئے ہیں کئی
مگر اس کا اردو ہوا ہی نہ تھا مفصل تو ایسا لکھا ہی نہ تھا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالغفور قیس کو بہر رانجھا کے کسی اردو نسخے کا علم
نہیں تھا۔ اسے یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس نے قصے کو پوری تفصیل سے بیان کیا
ہے۔ اس کا قصہ اپنی تفصیل میں کم و بیش وارث شاہ سے مشابہ ہے۔ اس سے
خیال گزرتا ہے کہ یہ قصہ جس فارسی مثنوی پر مبنی ہے وہ وارث شاہ کے بعد
لکھی گئی ہوگی۔ قیس کی مثنوی کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پورا قصہ
ایک روحانی تمثیل (Allegory) کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ رانجھا جسم ہے اور
بہر روح۔ محویت عشق حقیقی ہے اور بیچ چر مرشد کی ذات ہیں۔ شاعر نے پانچ
ہیروں کے تصور سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ غرض ساری مثنوی میں فوق فطرت
واقعات کی ایک پر اسرار فضا قائم ہو گئی ہے۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، پانچ ہیروں
کا یہ تصور کوئی جامد اور محدود تصور نہیں۔ بہر رانجھے کا قصہ نظم کرنے والے ہر
شاعر نے ذاتی اعتقاد کی بنا پر ان پانچ ہیروں میں جس کو چاہا، شامل کر لیا۔ قیس
کے ہاں ان کی تفصیل یہ ہے:

تو رکھ یاد ان اولیائوں کے نام تھے اول تو خضر علیہ السلام
دوم تھے شکر سنج بابا فرید کہ ہو ان پہ رحمت خدا کی مزید

۶۵ مثنوی بہر رانجھا، کرم الہی بھوپالی، پنجاب پریس پبلیکٹ، ۱۹۰۵ء

سوم تھے ذکر کیا وہ ملتان کے خدا ان سے راضی رہے پے پے
چہارم بخاری تھے سید جلال کہ ہو ان پر راحم وہ ایزد جلال
قلندر تھے پنجم وہ شہباز لال کہ رحمت کرے ان پہ بس ذوالجلال

ادبی اعتبار سے یہ مثنوی کرم الہی کی مثنوی سے بہتر ہے۔ شاعر حسن
بیان سے عاری نہیں۔ اشعار ہموار اور رواں ہیں۔ رائے کی ہنری کی تعریف ہے۔

پڑے اس میں چاندی کے چھلے کئی حقیقت میں انگلی تھی وہ ہیر کی
پڑی اس میں بتور کی چوڑیاں گویا ہیر کی تھی کٹائی عیاں
گولائی میں تھے اس کی موتی جڑے گویا ہیرے پہنے کھڑی دو لڑے
شریلی تھی آواز اور اچلی گویا ہیر بولے تھی اس میں جچی
تہ تھی ہانسی ہیر ہانی تھی وہ ہزارے کی یوں تو نشانی تھی وہ
وہ جس وقت ہوتا تھا نذر سرا تو غیرت میں آتی تھی اندر سجا
بعض قلمی تصویریں بھی خوب ہیں :

اُدھر اُس کی نظروں میں جنگل سیاہ اُدھر اس کی آنکھوں میں کاجل سیاہ
غرض کر کے سنگار و ابرن لگا وہ دم بھر میں پچھلی اسی بن میں جا
کہ جس بن میں اس کا کھیا سا یار کوالن کا اپنی کرے انتظار
رہی دس قدم جب کہ رائے سے ہیر لگتی لگتی چلی وہ شریہ
دکھا چلبلا پن وہ انداز کا چلی اس کی جانب پہ باز دوا (۶۶)

مثنویات سستی پتوں

سستی پتوں کے قصبے کو شمال مغربی ہندوستان میں وہی اہمیت حاصل ہے،
جو دھولا بازو کو راجستھان میں یا مادھونل اور کام کنڈلا کو بہار میں۔ سندھ، کچھ،

بلوچستان اور پنجاب میں یہ قصے بچے بچے کی زبان پر ہے۔ سندھی محوام میں تو سنی اور بنوں کو اولیا کا مرتبہ حاصل ہے۔ لیکن سندھ کی نسبت پنجاب میں اسے جو عمن قبول ملا، بیان سے باہر ہے۔ پنجاب میں بعض مقامات پر لوہری کے دن اب بھی سنی بنوں کا سوانگ رچایا جاتا ہے اور محوام ہاشم کی پنجابی سنی گاتے ہیں۔

سنی بنوں کا قصہ سندھی (۶۷) بلوچی (۶۸) کچھی اور پنجابی زبانوں میں بار بار لکھا گیا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ نئے پنجابی میں ملتے ہیں۔ ہر نام سنگھ شان مرحب سنی ہاشم نے ایسی پچاس سے زائد تصانیف کے نام پیش کیے ہیں۔ (۶۹) ان میں سے زیادہ اہم روایتیں سندھ داس آرام (۱۷۱۱ھ)، حافظہ برخوردار (۱۷۶۱ھ)، سندھ رام اور ہاشم (التونی ۱۸۳۰ء) کی ہیں۔

سنی بنوں کا یہ قصہ انگریزی میں بھی منتقل ہو چکا ہے۔ للٹھ برٹن اور مزلو سٹن نے اسے پنجابی روایتوں سے ترجمہ کیا ہے۔ (۷۰) سندھی روایت کا انگریزی ترجمہ F. J. Goldsmid نے کیا، جو ۱۸۶۳ء میں لندن سے مع اصل متن شائع ہوا (۷۱)

اصل قصے کی روایتیں سندھی، بلوچی اور پنجابی زبان میں باہم مختلف ہیں۔ حتیٰ کہ سوائے سنی بنوں کے دوسرے تمام کرداروں کے نام بھی تبدیل

۶۷ سنی بنوں سندھی منظوم از اخوند مہداریم و گوزال چتون مل کراچی، ۱۸۷۳ء

۶۸ اظہار: سندھی ص ۷

۶۹ سنی بنوں سندھی، بمبئی المصنف مع انگریزی ترجمہ F. G. Goldsmid لندن ۱۸۶۳ء،

سندھی کتب برٹش کالم ۱۳

۶۸ سنی بنوں، بلوچی، منظوم، قومی پبلی، بمبئی، ۱۸۷۶ء، اظہار: سندھی ص ۷

۶۹ سنی ہاشم (پنجابی) پروفیسر ہرچم سنگھ شان، لہارہ ۱۹۵۶ء، مقدمہ

۷۰ سنی بنوں، مطبوعہ لاہور، ۱۹۰۳ء، ص ۱۰

۷۱ اظہار: سندھی، ص ۷

ہو گئے ہیں۔ لیکن سندھی یا بلوچی روایتوں کی نسبت اردو قصے کے پنجابی سے متاثر ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔ اس لیے ہم پنجابی روایت کے بیان پر اکتفا کریں گے۔ پنجابی میں سسی بنوں کا قدیم ترین نسخہ سندس واس آرام کا ہے، لیکن جو اہمیت ہاشم کی سسی کو حاصل ہے اور کسی کو نہیں۔ بعد کے اکثر و بیشتر ترجمے ہاشم ہی کو بنیاد بنا کر لکھے گئے ہیں۔ ہاشم کے قصے کا خلاصہ یہ ہے :

قصہ

بھن بھور کے بادشاہ کے گھر بڑی منتوں مرادوں سے سستی نام کی ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ بھویوں نے پیشین گوئی کی کہ یہ جوان ہو کر کسی کے مشق میں گرفتار ہوگی اور شاہی خاندان کے تنگ و ناموس کو بٹا لگائے گی۔ اس بدنامی سے بچنے کے لیے والدین نے اسے ایک صندوق میں بند کر کے اور کچھ ہیرے جواہرات ساتھ رکھ کے دریا میں بہا دیا۔ یہ صندوق اتنا تھائی ایک لادولہ دھوبی کے ہاتھ لگا، جس نے سستی کو بڑے لاڈ پیار سے پالا۔ جوان ہو کر سستی حسن و جمال میں بگڑ آفاق ثابت ہوئی اور اس کے لیے دور دور سے پیغام آنے لگے۔ سسی نے سب کو اس بنا پر ٹھکرا دیا کہ وہ شاہی نسل سے ہے۔ دھوبیوں کی برادری میں اس بات پر جھگڑا ہوا۔ شدہ شدہ بات بادشاہ تک پہنچی۔ بادشاہ نے بنی کو پہچان لیا اور اس کے رہنے کو دریا کے کنارے ایک محل بنوا دیا۔ یہیں سسی نے ایک سوداگر کے پاس کچھ کے شہزادے بنوں کی تصویر دیکھی اور اس پر شیدا ہو گئی۔ اگلے سال کچھ کے سوداگروں کا ایک قافلہ سسی کے باغ میں اترا۔ سسی نے ان کے ذریعے بنوں کو کچھ سے بلوا بھیجا۔ بنوں کے خویش و اقربا مانع آئے، لیکن اس نے ان کی ایک نہ سنی اور سسی کے پاس چلا آیا۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں شیر و شکر ہو گئے۔ بنوں یہیں رہ پڑا۔ اس پر اس کے والدین جزیب ہوئے۔ آخر بنوں کے بھائی اسے لینے کے لیے بھن بھور آئے۔ سسی نے بہت خاطر ہدایت کی، لیکن انھوں نے ایک رات دھوکے سے بنوں کو مدھوش کر لیا اور

آدمی رات کو کچھ روکنے ہو گئے۔ آنکھ کھلتے ہیں کسی کو خبر ہوئی، تو وہ دیوانہ وار قافلے کے پیچھے دوڑی اور بنوں کی اونٹنی کے نشان پہچانتی کچھ کی راہ چڑ گئی۔ دوپہر تک ریگ زار کی گرمی اور دھوپ کی تپش نے کسی کو نیم جاں کر دیا۔ پاؤں ٹکار ہو گئے اور پیاس سے زبان سوکھ کے کاٹھا ہو گئی۔ مدد کے لیے کسی نے ایک گڈرے کو پکارا جو قریب ہی نکریاں لیے جا رہا تھا۔ لقمہ و دق صحرا میں ایک برہنہ پا اور کھلے سر عورت کو پاگلوں کی طرح بھاگتا دیکھ کر وہ اسے کوئی جن بھوت سمجھا اور ڈر کے مارے بھاگ گیا۔ اس بے سر و سامانی کے عالم میں غم سے ہٹان اور پیاس سے پریشان کسی نے وہیں تھپ تھپ کے جان دے دی۔ اور جب بنوں کو ہوش آیا تو اس نے بھائیوں کو نرا بھلا کہہ کے اونٹنی کی مہار بھن بھور کی طرف موڑ دی۔ عین راہ میں ایک قبر نظر آئی۔ اس گڈرے نے بتایا کہ ایک دیوانی عورت نے بنوں بنوں پکارتے ہوئے یہاں جان دے دی ہے۔ کسی کا عشق بے اثر نہ تھا۔ بنوں ایک آہ کے ساتھ قبر پر گر اور جاں بحق حلیم ہوا۔ (۷۷)

تاریخی حیثیت

اس قصے کے جائے وقوع اور زمانے کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ پنجابی لوک گیتوں اور ڈھولوں میں کسی کے باپ کو راجا کہا گیا ہے۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اس کا سلسلہ راجپوت بھائیوں سے ملاتے ہیں، جو زیادہ صحیح نہیں۔ سر رچرڈ ٹمپل جنہوں نے پنجابی لوک قصوں کے بارے میں تحقیق کی تھی لکھتے ہیں: ”کسی بنوں کا قصہ دراصل سندھ اور بلوچستان سے تعلق رکھتا ہے اور جب نہیں کہ سندھ کی تاریخ کے ابتدائی زمانے کا واقعہ ہو۔ ہمنور یا ہمنور (یعنی بہ وٹو بھول یا معروف) کے ٹھنڈ اس سڑک کے کنارے پر واقع ہیں، جو کراچی سے کھاراکو گئی ہے۔ غالباً اس شہر کا محل وقوع دریائے سندھ کے ایک قدیم

۷۷ کسی ہاشم (پنجابی) حوالہ ماسٹر

دہانے پر تھا۔“ (۷۳)

قاضی فضل حق نے ۱۹۳۰ء میں اس قصے کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے جو روایت بیان کی ہے، اس میں اس شہر کا نام بھن پور بتایا گیا ہے، جو علاقہ سندھ میں واقع تھا۔ (۷۴) لیکن جدید ترین تحقیق کی رو سے یہ مقدمہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ پروفیسر ہرنام سنگھ شان جنسوں نے برسوں کی محنت اور عرق ریزی کے بعد حال ہی میں سسی ہاشم (۷۵) کو مرتب کیا ہے۔ اس قصے کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سسی بنوں کے قصے کا محل وقوع علاقہ کچھ میں ہے۔ گو اس قصے کو سو فیصدی سر واقعہ کی منزلت دینے کے لیے وہ بھی تیار نہیں۔ قصے میں جس طرح کے رسم و رواج اور طور طریقوں کا ذکر آیا ہے وہ قدیم کچھی معاشرت کا پتا دیتے ہیں۔ سندھ اور پنجاب کی روایتوں میں بعد کو بہت رنگ آمیزی ہو گئی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ کچھ سے نکل کر سندھ کے نچلے علاقے سے ہوتا ہوا کران بلوچستان اور پھر وہاں سے پنجاب پہنچا۔ کچھ کا شہر اب بھی ریاست قلات (بلوچستان) میں موجود ہے۔ اس قصے کا صحیح زمانہ بھی معلوم نہیں۔ بعض محققین اسے زمانہ اسلام سے پہلے کا بتاتے ہیں۔ سسی، سنسکرت ششی (چاند) اور بنوں پورن سے لسانی مشابہت رکھتا ہے۔ اس قصے کے ہندی الاصل ہونے کے بارے میں ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں اظہار محبت کی ابتدا عورت کی طرف سے ہوتی ہے جو خالص ہندی انداز ہے۔

چو رام مصنف تاریخ بلوچستان کا بیان ہے کہ سسی کی قبر علاقہ لس بیلہ میں شاہ بلاول اور موہمصل کے درمیانی رنگ زار میں اب تک موجود ہے۔ حجاز سنگھ لکھتے ہیں کہ یہ قبر کچھ اور لاکانے کے درمیان مارو قفل میں واقع ہے۔ یہاں

۷۳ اور نیل کالج میگزین ۱۹۲۷ء، ص ۱۱۵

۷۴ اردو ۱۹۳۰ء، ص ۱۹

۷۵ حوالہ ماسبق

لوگ زیارت کو آتے ہیں۔ ہر سال میلہ لگتا ہے اور مہندی کے ہونے کے قریب وہ چٹھر اب تک موجود ہے، جہاں پیاسی کسی نے مرتے وقت پانی پینا چاہا تھا۔^(۷۶)

فارسی نسخے

۱۔ کسی پتو۔ از سید علی، ٹھٹھ کے ایک صاحب تقدس بزرگ نے قبل ۱۰۵۳ھ میں سندھی زبان سے ترجمہ کیا۔^(۷۷)

۲۔ زیبا و نگار از حاجی محمد رضا ضایہ۔ ۱۰۵۳ھ^(۷۸)

۳۔ کسی و پتو، از جنونت رائے فٹھی، ۱۱۳۰ھ^(۷۹)

جنونت رائے فٹھی کی ”کسی و پتو“ کا ذکر اچھے کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ یہاں اچھے سے غلطی ہوئی ہے۔ یہ مثنوی جنونت رائے، فٹھی کی نہیں بلکہ اندر جیت فٹھی کی ہے، جس کا ذکر فارسی نسخوں کے تحت نمبر ۳ پر کیا گیا ہے۔

۴۔ نامہ عشق، از اندر جیت، فٹھی، ۱۱۳۰ھ^(۸۰)

۵۔ دستور عشق یا مکتان رتکس از جیونت پرکاش ۱۱۳۳ھ^(۸۱)

اچھرا نگر نے دستور عشق کے مصنف کا نام لالہ سنت پرکاش لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ اچھرا نگر نے طبع کلکتہ ۱۸۱۲ء کا ذکر کیا ہے، لیکن وہ اسے دیکھنے کے مدھی نہیں۔^(۸۲) ڈاکٹر محمد باقر کا بیان ہے کہ مصنف کا صحیح نام لالہ جوت پرکاش ہے اور مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۱۳۶ھ ہے۔^(۸۳)

۷۶۔ کسی پاشم (بہاولی) حوالہ، اسبق

۷۷۔ قاضی فضل حق، اردو، ۱۹۳۰ء، ص ۷۲۳

۷۸۔ اچھرا نگر نمبر ۴۲، ص ۵۳۳، نیز اسٹورٹ، ص ۷۳

۷۹۔ اچھے نمبر ۲۴۵۲

۸۰۔ ہر نام نگہ شان، مقدمہ، کسی پاشم، نیز اچھرا نگر، ص ۵۰۸

۸۱۔ نور الہدی محمد عمر، اردو، ۱۹۲۹ء، ص ۷۶۳، نیز اچھرا نگر، ص ۳۵۲

۸۲۔ اچھرا نگر، ص ۳۵۲

۸۳۔ بہاولی قصے فارسی زبان میں، ص ۳

- ۶۔ شہید ناز، از قاضی مرتضیٰ خاں سورتی (بعید محمد شاہ) (۸۴)
 - ۷۔ حسن و ناز، از میر محمد بھکری (۸۵)
 - ۸۔ تھنہ انکرام، از محمد وی ۱۲۵۶ھ (۸۶)
 - ۹۔ وقائع ہنوں از محمد حسین حسین (التونی قیل ۱۲۵۱ھ) اور شہباز خاں سیالکوٹی (۸۷)
 - ۱۰۔ سسی و پیوں از فرخ بخش مکتوبہ ۱۳۵۸ھ (۸۸)
 - ۱۱۔ مہر و ماہ از پیر محمد اودھی، مطبوعہ ۱۳۹۵ھ (۸۹)
 - ۱۲۔ محمد افضل سرخوش دہلوی، صاحب کلمات الشعرا (ولادت ۱۰۵۰ھ) شاگرد میر معز فطرت (وفات ۱۱۲۶ھ) نے بھی قصہ ”سسی و پیو“ کو نظم کیا تھا۔ اس کا نام ”مثنوی حسن و عشق“ ہے۔ آغاز:
- الہی شور شے در دم فزوں کن
نمکدہا نے بد اغم سرنگوں کن (۹۰)

اردو نسخے

- ۱۔ مثنوی اسرار محبت، از نواب محبت خاں محبت شاگرد جرات، سنہ اختتام ۱۱۹۷ھ۔ (۹۱) یہ مثنوی خسرت سولہانی نے اردو سے مغلے پرئیں، علی گڑھ

۸۳	بکوال اردو، ۱۹۳۹ء، ص ۷۶
۸۵	ایضاً
۸۶	ایضاً
۸۷	ڈاکٹر محمد باقر، لک۔ م۔ نومبر ۱۹۳۳ء
۸۸	لک۔ م۔ فروری ۱۹۳۴ء
۸۹	بحوالہ نثری داستانیں، ص ۶۰۳
۹۰	تذکرہ گل رحمتہ قلکی، ورق ۲۳۹ تلف
۹۱	بالیں میں یہ مثنوی خطوط دیوان محبت میں شامل ہے۔ ورق ۱۵۱ تا ۱۵۷ نمبر ۲۳۳۲ نیز اشپرگر، ص ۶۳۴، سالار جنگ ص ۶۹۱، نمبر ۸۷۲

سے شائع کی تھی۔

۲۔ مثنوی سسی بنوں، لاہور اسٹیک جہانگیر (۹۲)

۳۔ مثنوی سسی بنوں از سالک (۹۳)

۴۔ مثنوی نالہ مجبور از لال سنگھ میرفتی ریڈینٹ کشمیر (۹۴)

۵۔ سسی بنوں (نثر) از مقبول احمد خلیف قدرت احمد فاروقی کوپاموی،

۱۳۶۵ھ (۹۵)

۶۔ احمد علی خلیف نے اپنی مثنوی مہر و مشتری (سال تصنیف ۱۸۶۰ء)

میں لکھا ہے کہ اس نے سعد الدین شفق رئیس کالپی کی فرمائش پر سسی بنوں کا قصہ نظم کرنا شروع کیا تھا، لیکن موصوف کے انتقال سے طبیعت کمزور ہو گئی اور قصہ نامکمل رہ گیا۔ (۹۶)

۷۔ قصہ سسی بنوں (نثر) عبداللطیف شرر نے اسے مخدومی کی فارسی

”قصہ انگرام“ سے اخذ کر کے ستمبر ۱۸۹۸ء کے دگلڈاز میں شائع کیا۔

۸۔ سسی بنوں (نثر) نیاز فتح پوری نے فارسی ”حسن و ناز“ (میر محمد

بھکری) اور ”ہبید ناز“ (قاضی مرتضیٰ سورتی) کی بنا پر اس قصے کو جولائی ۱۹۳۹ء

۹۲ بحوالہ مقدمہ سسی بنوں (مجلدی)

۹۳ ایضاً

۹۴ ایضاً

۹۵ دہلی، غلبات، ص ۱۵۶

۹۶ احمد علی خلیف کے افسانہ یہ ہیں۔

نظم ہی میں اس کا لانا خوب ہے

موردہ تحسینی ہوا ہیں کو دکھا

اس سے افسردہ طبیعت ہو گئی

سسی بنوں کا لسانہ خوب ہے

بارے جب قصوں سا اس کو دکھا

لیکن ان کی جب کہ رملت ہو گئی

(مثنوی مہر و مشتری ۷۷ ص ۸)

کے نگار میں شائع کیا۔ (۹۷)

۹۔ نگار میں دہائی کا بیان ہے ”دیوی دیال نے کسی پنوں کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے“ (۱۸۷۰ء) (۹۸) اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ دیوی دیال کا یہ نسخہ اردو میں تھا یا ہندی میں۔

۱۰۔ مثنوی نسیم سحر (کسی و پنوں) مصنف جلال خستہ دہلوی، ۱۸۷۶ء (۹۹)

۱۱۔ کسی و پنوں (اردو نثر) یہ کتاب راہ تہ مل و مولوی علی محمد تاجران کتب نے نو لکھنؤ پر جنگ در کس سے چھپوا کر ۱۹۰۳ء میں لاہور سے شائع کی۔ مصنف کا نام درج نہیں۔ کل صفحات ۱۶۔ تنہید میں صراحت کر دی گئی ہے کہ یہ قصہ تھنہ انکرام سے نقل کر کے بیان کیا جاتا ہے۔
قصے کی مقبولیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

”پنجاب میں جو قصے بچے بچے کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں، انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ ہولیوں یا دسہرے میں جو سوانگ نکالے جاتے ہیں، ان میں ضرور کسی پنوں کا سوانگ بھی نکلا کرتا ہے۔ بھانڈ لوگ قاشوں میں بھی ان کے سوانگ سے دل لہاتے ہیں۔ شہروں کے لوگ جب کبھی کاروبار سے فرصت پاتے ہیں، کسی پنوں کے گیت سن کر یا گاکر اپنا دل بہلاتے ہیں۔ دیہات کے کاشتکار ہوں یا چرواہے، وہ بھی کام کرتے وقت اپنے دل کے دلولے انھیں کے گیت گاکر ظاہر کرتے ہیں“ (۱۰۰)

۹۷۔ نیاز فتح پوری نے لکھا ہے کہ اس قصے کو انگریزی میں لٹریٹ برن اور مرز لوسٹن نے نقل کیا تھا (نگارِ جہان، ۱۹۳۹ء، ص ۳۹)

۹۸۔ مقالات دہائی، ص ۷۵

۹۹۔ مثنوی نسیم سحر، مطبوعہ دہلی ۱۸۸۳ء

۱۰۰۔ کسی پنوں مطبوعہ ۱۹۰۳ء، ص ۴

مثنوی اسرار محبت

اردو منظوم فنون میں سے محبت خاں محبت کی مثنوی "اسرار محبت" (۱۱۹۷ھ) بلند ادبی مرتبہ رکھتی ہے۔ مثنوی اسرار محبت کا جو نسخہ جناب مسعود حسن رضوی لایب کے کتب خانے میں ہے، وہ "مطبع بیت السلطنت، لکھنؤ" کا چھپا ہوا ہے۔^(۱۰۱) اس میں سنہ طبع درج نہیں، لیکن یہ مثنوی غالباً اواسط ساۃ ۱۳ میں طبع ہوئی تھی۔ اشپرا نگر نے بھی اس مثنوی کے مطبوعہ نسخے ہی کا ذکر کیا ہے جو لکھنؤ سے ۲۰ صفحات پر شائع ہوا۔ لیکن اشپرا نگر نے سنہ طبع نہیں بتایا۔^(۱۰۲) لکھنؤ ہی کا ایک مطبوعہ نسخہ کتب خانہ انڈیا آفس لندن میں بھی ہے۔ بلوم ہارٹ کا قیاس ہے کہ یہ ۱۸۳۵ء میں شائع ہوا ہوگا۔^(۱۰۳) جناب مسعود حسن رضوی لایب کے کتب خانے^(۱۰۴) کے علاوہ اس مثنوی کے مزید نسخے کتب خانہ سالار جنگ میں^(۱۰۵) کتب خانہ رضائیہ میں^(۱۰۶) اور ہاڈلین لائبریری میں^(۱۰۷) محفوظ ہیں۔ اشپرا نگر نے بھی اس کے ایک نسخے کا ذکر کیا ہے۔^(۱۰۸) حسرت موہانی نے اس مثنوی کو قاضی محمد صادق خاں اختر کی مثنوی "سرپا سوہ" اور آغا علی شمس کی "مطالع اللہ" کے ساتھ "مجموعہ مثنویات" کے نام سے شائع کیا تھا۔ کس نواب محبت خاں، حافظ الملک نواب رحمت خاں والی بریلی کے فرزند تھے۔ وہ جنگ رومیلہ کے بعد الہ آباد میں قید رہے۔ آصف الدولہ کے زمانے

- | | |
|-----|---------------------------------------|
| ۱۰۱ | رسالہ اردو، جولائی ۱۹۳۱ء |
| ۱۰۲ | اشپرا نگر، ص ۶۳۲ |
| ۱۰۳ | انڈیا مطبوعات، ص ۱۵۳ |
| ۱۰۴ | اردو، ۱۹۳۱ء، ص ۳۵۹ |
| ۱۰۵ | سالار جنگ، ص ۶۹۱ |
| ۱۰۶ | کتب خانہ رضائیہ رام پور، نشان لکھ ۵۲۸ |
| ۱۰۷ | ہاڈلین نمبر ۲۳۳۲ |
| ۱۰۸ | اشپرا نگر، ص ۶۳۲ |

میں رہا ہو کر لکھنؤ آئے اور زندگی فراغت سے بسر ہونے لگی۔

کسا پہلے میر درد سے تلمذ تھا۔ بعد میں جرأت کو بزمِ شاعرانہ ملازم رکھا اور انھیں سے اصلاح لینے لگے۔ نساخ انھیں جعفر علی حسرت کا بھی شاگرد بتاتے ہیں۔ ۱۲۲۲ھ میں انتقال کیا۔^(۱۰۹) مثنوی اسرارِ محبت ان کے دیوانِ نسخہِ باذین میں شامل ہے۔^(۱۱۰)

عبد الغفور نساخ نے نواب محبت خاں محبت کو حسرت کے علاوہ درد کا بھی شاگرد بتایا ہے^(۱۱۱) لیکن قاضی عبدالودود صاحب کی رائے ہے کہ ”محبت کا تلمذ درد مشکوک ہے۔ پہلے حسرت کے شاگرد تھے، بعد میں جرأت سے بھی اصلاح لی۔“^(۱۱۲)

محبت خاں محبت نے اس قصے کو مسٹر جانسن کی فرمائش سے نظم کیا تھا، جس کا ذکر انھوں نے مثنوی کے ابتدائی اشعار میں بالتفصیل کیا ہے۔ مثنوی کا آغاز محبت کی تعریف و توصیف اور ”اسرارِ عشق“ اور ”تائیرِ عشق“ کے بیان سے ہوتا ہے۔ سسی بنوں کے قصے سے محبت کو کیسی رغبت تھی، اس کا پتا ذیل کے اشعار سے چلتا ہے:

جب قصہ عجائب ہے کہانی کہ سن کر ہو دل فولاہ پانی
سمجھتا ہی نہ ہووے جو دم سرد جگر سے وہ بھی کھینچے آہ پندِ درد
عزیزہ کیا کروں اس کا بیاں ہائے کہ مر جانے کی ہے یہ داستان ہائے

محبت نے سسی کی پیدائش، اس کے دریا میں بہائے جانے اور دھوبی کے گمر جہان ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ بلکہ قصے کی ابتدا ہی سسی کی جوانی

۱۰۹ خلی شعراء ص ۴۱۶

۱۱۰ باذین نمبر ۲۳۲۲

۱۱۱ خلی شعراء ص ۴۱۶

۱۱۲ مکتوب قاضی عبدالودود جام مولف

۱۱۳ مغلز ادراہیم، ص ۲۳

دیوانی کے ذکر سے کی ہے۔ وہ اسے ”جنگ سیال“ کا باشندہ بتاتا ہے۔ جہاں گھر گھر حسن و عشق کا چرچا تھا۔ مقامی روایت کے مطابق جنگ سیال دراصل ہیر کا وطن تھا۔ سسی کا نہیں۔ لیکن محبت سسی کو ہیر کی بھینچی قرار دے کر ایک نئی روایت قائم کرتا ہے۔ سسی پری تمثال اور حسن و جمال میں بے مثال تھی۔ شاعر نے اس جکبزدہ کا سرپا یوں بیان کیا ہے:

سرپا کیا لکھوں اس شمع رو کا کہ تھی وہ حسن کا شعلہ سرپا
عیاں یوں سوئے سرخے مہر آلود کہ جیسے شمع کے شعلے پہ ہو دود
ٹلہ می چوٹی نگر اس طرح آوے کہ جیوں مار سید لہریں دکھاوے
بہت سے تھا دلوں کا اس میں مسکن اپنھا ہے کہ اک سانپ اور کئی من
محبت نے سرپا کے رسمی انداز کو برقرار رکھا ہے اور جسم کے ہر حصے کی تعریف کی ہے:

پریشاں رخ پہ ہوں زلفیں تھیں یکسر رگب: ابر سے جیسے ہو مہ پر
وہ دنداں آب دار اس سم پر کے کہ سوداگر ان سے ہو دل میں گھر کے
اور اس کی نتھ کا یہ پیارا ہے حلقہ کہ گویا حسن نے مارا ہے حلقہ
نہیں گردن کی کچھ تعریف ہوتی وہ ہے گویا صراحی دار سوتی
یہ ساعد پہ نزاکت تھی ممو دار رگب گل کی بھی نسبت جس پہ ہو پار
یہ گرمی اس کے تھی ہر اک خن میں کہ آتش سی لگاوے جان و تن میں

سسی کے باغ میں سوداگروں کا قافلہ اترتا ہے۔ محبت کے ہاں سسی کے عشق کی ابتدا قافلے والوں کے پاس بنوں کی تصویر دیکھنے سے نہیں، بلکہ خود بنوں کے دیکھنے سے ہوتی ہے، جو سوداگروں کے ہمراہ سسی کے باغ میں وارد ہوا تھا۔ بنوں جیسے خوبرو جوان کو دیکھتے ہی سسی ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہے۔

یکایک وہ ہوئی یوں عجب دیدار کہ جنبش ہو گئی مڑکاں کو دشوار

وہ کلشن کا تماشا سب بھلایا فلک نے اور ہی اک گل کھلایا
دل اس گل رو کا بر میں یوں پکارا ہمیں تو بے گلی نے مفت مارا
آخر:

گلی دونوں طرف سے خوب ہی لاگ دلوں کے بچ بڑ کی عشق کی آگ
محبت نے آغاز ہی میں سسی بنوں کی برہو راست ملاقات کرا کے اصل
قصے کے کئی واقعات حذف کر دیے ہیں۔ سسی خیلے بھانے سے رات کو عزیزوں
کی آنکھ بچا کر گھر سے نکلتی ہے اور بنوں کے پاس آتی ہے۔ نصف شب تک
دونوں راز و نیاز کی باتوں میں مشغول رہتے ہیں:

انہیں دیکھے تھا یوں حیران ہو ماہ زمیں پہ کس طرح نکلے تھے دو ماہ
کبھی تو سو حڑے ہوتے تھے ہاہم کبھی کچھ سوچ کر روتے تھے ہاہم
آخر غینہ کا غلبہ ہوا اور کیف و نشاط کے اس عالم میں دونوں بے خبر سو گئے۔ بنوں
کے قبیلے والوں نے اس عشق کو مصیبت خیال کیا اور بدنامی کے ڈار سے وہ بنوں
کو سسی کے پہلو سے سوتے میں اٹھا، راتوں رات وہاں سے چل دیے۔ ہاشم کے
ہاں بنوں کے رفیق کوچ کرنے سے پہلے اسے شراب پلا کر مدہوش کر دیتے ہیں۔
لیکن محبت کی مٹھوی میں اس کا کوئی ڈکڑ نہیں، غرض:

رہی سوتی یہاں غافل یہ مجبور ہزار افسوس پہنچا قافلہ ڈور
ہوئی جب خواب غفلت سے وہ بیدار جہاں اس وقت کا ہے سخت دشوار
نہ دیکھا اس نے جو بر میں وہ دلبر جب صورت سی تھی حیران و ششدر
یہی وہ رہ کے آتا تھا پر دیکھا کہ تھا یہ واقعی یا خواب دیکھا
ہوا خون جگر آنکھوں سے جاری لگا دل بر میں کرنے بے قراری
نظر کر پیش و پس ایہ ہر ادھر کو گئی رونے وہ دھر ڈانو پہ سر کو

دل کی بے چینی نے زیادہ سوچنے کی مہلت ہی نہ دی اور وہ ایسے ہی روتی جتنی سر
و جتنی اس سست چل دی ہر سر قافلہ گیا تھا:

برہنہ پا اور عریاں سر چلی تھی قیامت اس کے دل کو بے کلی تھی
یہ غم نے شکل کر دکھائی اس کی ملائی خاک میں رعنائی اس کی
کیا تھا اس سے طاقت نے کتنا گریباں صبر کا تھا پارہ پارہ
گلی جب وہ زمیں پہ پاؤں دھرنے قدم بوسی لگے خار اس کے کرنے
چلی وہ نقشہ پائے کارواں پر غزل یہ عاشقانہ تھی زباں پر
غزل کے چند اشعار:

بس اپنا کچھ نہیں اب آہ چنا کہ دل کو لے گیا اک راہ چنا
سمجھنا بوجھنا تھی راہ کی بات کہ مجھ کو بھی لیے ہر راہ چنا
رکھا اب ناتوانی نے مجھے توڑ نہیں زور اس پہ کچھ داند چنا

ماں باپ کو علم ہوا تو کسی کو صحرا سے واپس گھملائے اور سمجھانے بھانے
لگے۔ باہمی مشورے سے طے پایا کہ بنوں کے پاس قاصد بھیجا جائے۔ کہیں ایسا
نہ ہو کہ کسی کے در بدر آوارہ بھرنے سے بنوں اس سے منحرف ہو جائے۔
کسی نے ان باتوں میں آکر کئی روز صبر کیا لیکن وحشت کا یہ عالم تھا:

کبھی سر پیٹ لینا گاہ رونا کبھی بیزار آپ اپنے سے ہونا
کبھی رو رو کے آہیں سرد بھرنا کبھی کچھ ذکر دل ہی دل میں کرنا
کبھی حیران ہو اک سست نکلا کبھی بیٹھے کچھ آپ ہی آپ بکنا
پری کو اک دوتا سا بتایا محبت نے عجب عالم دکھایا
کبھی جاتے جو دیکھے تھی کسی کو تو اس کو گھیر کر کہتی تھی رو رو
وہ بنوچوں کا جو اک کارواں ہے کہ جس میں ایک بنوں تو جواں ہے
جگر پر داغ میرے دے گیا وہ متاع صبر و طاقت لے گیا وہ

پڑی پھرتی ہوں میں ناشاد اس بن کروں ہوں جیوں جس فریاد اس بن
گیا وہ چھوڑ یوں مجھ ناتواں کو کہ جیسے نقشِ پائے کارواں کو
کبھی دیکھا تو مجھ کو بھی تبادو پہنچ چاقوں میں کچھ ایسا ہوا دو

سسی کے گھر واپس لائے جانے کا واقعہ محبت کی جدت طرزی ہے۔ کسی
دوسرے قصہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ غرض ماں باپ کے سمجھانے بھانے
کا کچھ اثر نہ ہوا۔ سسی کی تو ہڈی ہڈی آتشِ عشق میں جل جل رہی تھی۔ وہ ایک
دن موقعِ پاک کے گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ ناگوار راہ میں ایک اجنبی نے خبر دی کہ:

دیوارِ سندھ میں ہے جلوہ گر وہ ملا چاہے جو تو جائے لور کر
اتنا معلوم ہونا تھا کہ پاکوہاں اور سرگرداں سسی نے سندھ کی راولی۔ ملاقات کی
ایک سوہوم امید کے سہارے سسی نے ریگ زار کی صوبتیں جھیلنے ہوئے،
میلوں کی مسافت طے کر ڈالی۔ آخر پنوں کے شہر میں پہنچ کر سسی نے اس کے
پاس اپنی انگوٹھی بطور نشانی بھیجی۔ لیکن قاصد پنوں کی شادی کی خبر لایا جو اس
روز قہیلے کی ایک حسین عورت سے ہونے والی تھی، یہ خبر سنتے ہی سسی دھک
سے رہ گئی اور گرتے ہی مر گئی۔ پنوں کو پتا چلا تو وہ دوڑا آیا لیکن تیر کمان سے
نکل چکا تھا۔ آخر پنوں بھی روتا رہا سسی کی لاش سے لپٹ کے قربان ہو گیا:

محبت، ہے محبت کا یہ اسلوب کہ طالب اس کا پتا ہے نہ مطلوب
محبت ہے بڑی یہ ایک آفت محبت نے کیا لاکھوں کو عارت

مثنوی کا خاتمہ تاریخِ تصنیف پر یوں ہوا ہے:

کئی تاریخ اس کی یہ بہ صنعت ”عجب قصہ ہے سراہ محبت“ (۱۱۳)

۱ ۱ ۹ ۷

کسی کے بچوں کے شہر پہنچنے، انگوٹھی بھجوانے اور اس کی شادی کی خبر سن کر ہلاک ہونے کا ذکر کسی قصہ نگار نے نہیں کیا۔ یہ محبت کی اختراع ہے، بلکہ اس پر مستزاد یہ کہ بچوں کی ہم قوم منگیترا بھی ان دونوں شہیدان محبت پر نثار ہو جاتی ہے۔ اصل قصہ صرف یہ ہے کہ کسی بچوں تک پہنچ ہی نہیں پائی تھی اور راوی میں تپش اور لو کے اثر سے تڑپ تڑپ کے پیاسی مر گئی۔

مشنوی میں کل ۵۹۱ اشعار ہیں۔ ظاہر ہے کہ محبت نے اصل پلاٹ کو بہت مختصر کر دیا ہے۔ کئی واقعات حذف کیے ہیں اور کچھ اپنی طرف سے بڑھا بھی دیے ہیں۔ لیکن لطف یہ ہے کہ قصے کی دلچسپی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ محبت کی مشنوی اپنی ادبی اور فنی خوبیوں کی وجہ سے اردو مشنویوں میں اونچا درجہ رکھتی ہے۔ انداز بیان اور لب و لہجہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی فخر کو اور قادر الکلام شاعر کی تصنیف ہے۔ کسی کے حالات کو اس سہولت اور سوز سے بیان کیا گیا ہے کہ دل پر چوٹ لگتی ہے۔ تشبیہیں حسین ہیں اور مصرعے سادہ و سبے ساختہ ہیں۔ بقول مجنوں گور کپوری ”فنی اعتبار سے یہ مشنوی کامل العیار ہے۔“ (۵۵)

مشنوی نسیم سحر، مصنفہ پنڈت جیالال خستہ دہلوی

یہ مشنوی مطبع افتخار دہلی سے ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ صفحات کی کل تعداد ۲۳ ہے اور ہر صفحے میں ۲۲ ابیات ہیں۔ مشنوی کا سال تصنیف ۱۳۹۳ھ/۱۸۷۶ء ہے، جیسا کہ مصنف کے قطعہ تاریخ سے ظاہر ہے:

جبکہ یہ داستان تمام ہوئی دلِ ناشاد باغِ باغِ ہوا
سالِ تاریخ کا ہوا جو فکر باغی نے کہا فراغِ ہوا

۳ ۹ ۲ ۱ء

جیالال خستہ دفتر میونسپل کمیٹی دہلی میں ملازم تھے۔ ٹکڑے چاویہ کی تصنیف کے وقت ان کی عمر ۳۰ برس سے زیادہ تھی۔ شعر کا پاکیزہ اور سحرانہاق

رکتے تھے۔ (۱۱۶)

شاعر نے قصے کے بارے میں اپنے ہانڈ کا پتا نہیں دیا۔ البتہ اتنی صراحت کردی ہے کہ اس نے یہ مثنوی اپنے ایک دوست میر صادق علی کی فرمائش پر لکھی:

خصوصاً جو ہیں میر صادق علی خیر و سر غنی و جلی
لکھا جن کے کہنے سے قصہ تمام رہیں تیری رحمت سے طرم دھام
مثنوی کی ابتدا اس زمانے کے دستور کے مطابق بسم اللہ الرحمن الرحیم اور حمد خدائے کریم سے کی ہے۔ ایک پڑت، جو فہر اسلام اور خلفائے راشدین کی شان میں کس خصوص و خشوع سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے، ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیے:

لکھوں پہلے حمد خدائے کریم	کہ ہے نام اس کا غفور الرحیم
ہوا عشق کا بھی اسی سے ظہور	کیا یعنی پیدا محمد کا نور
وہ ساقی کوثر رسول امیں	بنا جن کی خاطر زمان و زمیں
لام رسل ختم ہو پیراں	محبت خدا سرور دوجہاں
ہیں اصحاب اس کے جو والا مگر	عروج فضیلت کے شمس و قمر
ابوبکر صدیق عالی خطاب	پہر کرامت کا اک آفتاب
دوئم عمر عادل مبارک شیم	لے نوشیرواں جن کے جھک کے قدم
سوئم حضرت عثمان عالی وقار	چہارم علی سرور نامدار
ثام میں کردن ان کی جو کچھ رقم	وہ ہے شک ہے کم بلکہ کم سے بھی کم

قصے کا آغاز شہر بھن بھور اور شاہ بھن بھور کے بیان سے ہوا ہے۔ محبت خاں محبت کی بہ نسبت خستہ دہلوی کی یہ مثنوی سسی ہاشم کی اصل روایت

سے قریب تر ہے۔ گو اس میں بعض اختلافات ہیں، لیکن نظر بظاہر یہ خستہ دہلوی کی اختراع نہیں۔ ماننا اس نے کسی چیز کے قصے کو جس طرح دہلی میں سنا، ویسے نظم کر دیا۔

بھن بھور کے بادشاہ کا لاولد ہونا، مفتوں مرادوں سے سستی کا پیدا ہونا، جموں کا پیشین گوئی کرنا کہ شہر دہلوی قصۂ عشق کا شکار ہو کر تنگ و ناموس کو بنا لگائے گی اور اس کے عشق کا افسانہ سن کر لوگ لیلیٰ و مجنوں کو بھول جائیں گے۔ بادشاہ کا بیٹی کو صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دینا، صندوق کا اتنا دھوبی کے ہاتھ لگنا اور سستی کا دھوبی کے گھر جہاں ہونا، دریا کے کنارے بادشاہ کے بنوائے ہوئے محل میں رہنا، وغیرہ قصے کی مستند روایت کے عین مطابق ہے۔ خستہ دہلوی نے ان واقعات کو مفصل بیان کیا ہے اور تقریباً نصف مثنوی انھیں پر ختم ہو گئی ہے۔ اس کے بعد کا قصہ کسی حد تک مختلف ہے۔

ہاشم کی روایت کے مطابق سستی نے کچھ کے سوداگروں کے پاس بیوں کی تصویر دیکھی اور اس پر فریفتہ ہو گئی۔ خستہ دہلوی کے ہاں ”کچم“ کے دو سوداگر تجارت کی غرض سے بھن بھور سے گزرتے ہیں۔ سستی انھیں محل میں بلوا کر پوچھتی ہے کہ کیا کیسہ تم میں بیوں نامی کوئی فوجیان رہتا ہے۔ نجومیوں کے کہنے کے مطابق قسام ازل سے اس کا رشتہ بیوں سے مقرر ہو چکا ہے۔ سوداگر جواب دیتے ہیں کہ بیوں انھیں لکڑ بھائی ہے۔ اس پر سستی سوداگروں سے کہتی ہے کہ اگر جان بخشی جاوے تو کچم سے اپنے بھائی کو بھن بھور لے آؤ۔ ان میں سے ایک سوداگر وہیں رہتا ہے اور دوسرا بیوں کو لانے کے لیے ”کچم“ پہنچتا ہے۔ ان کی ماں یہ ماجرا سن کر بیوں سے کہتی ہے :

کودا نہیں تیری فرقت مجھے جو دوں وہاں کے جانے کی رخصت تجھے
نہاؤے اگر وہاں تو اے نور جاں رہے بھائی تیرا بیتد گراں
عجب سخت مشکل ہوئی آ کے پیش ادھر دھم نیزہ ادھر دھم نیش

دلے جس طرح ہو سکے اے جواں رہا کر کے بھائی کو لا تو یہاں
 بنوں بھن بھور پہنچتا ہے اور سستی اسے دیکھتے ہیں مست و تینود
 ہو جاتی ہے:

در بارغ پر جا کے دیکھا جو نہیں^(۱۱۷) تو آیا نظر وہ جوان حسین
 اسی دم ہوئی جان و دل سے غار نہ کچھ ہوش اس کو رہا زہجار
 نظر سے نظر جو ملی یک یک رہی محل وحشی اسی جا غصہ شک
 یہی حالت بنوں کی بھی ہوئی۔ چند روز ہاشم راز و نیاز رہا۔ اس کے بعد
 دونوں نے نکاح کی غمانی۔ اتنا دھوبی سے اجازت طلب کی گئی۔ اس نے بنوں کو
 فن نگاری میں آزمایا اور اس کے بعد اسے اپنی دامادی میں قبول کر لیا۔ بڑی دھوم
 دھام سے شادی ہوئی اور دونوں خوشی خوشی دریا کے کنارے محل میں رہنے
 لگے۔ یہ واقعات اصل قصے سے مختلف ہیں۔ ہاشم کے ہاں نکاح کی نوبت ہی
 نہیں آتی۔

بنوں کے بھائی جب وطن لوٹے تو ان کی ماں نے یہ سرگزشت سن کر
 سر پیٹ لیا:

ہوئی ایسی کیا مجھ سے صادر خطا ہوا پون^(۱۱۸) میرا جو مجھ سے خدا
 لگی کہنے بنوں سے جاؤ شتاب وہ سستی ہے کون ایسی خانہ خراب
 کسی طرح پھندے سے اس کے تھروا یہاں لاؤ بنوں کو بہر خدا

دونوں بھائیوں نے عورتوں کا لباس نہ پہن کیا اور غلیاگری کے
 بہانے بھن بھور میں وارد ہوئے۔ سستی نے ان کی شہرت سنی تو انھیں محل
 میں طلب کیا۔ رقص و سرود کی محفل گرم ہوئی اور رات گئے تک بیتا ساغر کا

دور رہا۔ بنوں کے بھائی اسی موقع کی تاک میں تھے۔ انھوں نے سستی اور بنوں
 لڑائیوں کو بے سدھ پلا تو بنوں کو مدہوشی کے عالم میں اپنے ساتھ لیے راتوں
 رات بھن بھور کے علاقے سے باہر نکل گئے۔ بنوں کو شراب پلا کر مدہوش
 کرنے کا واقعہ ہاشم کے پاس بھی ملتا ہے۔ لیکن بنوں کے بھائیوں کا عورتوں کی
 وضع میں بھن بھور آنا اصل روایت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

صبح سویرے سستی کی آنکھ کھلی تو بنوں کو قریب نہ پا کر اس کا ماتھا
 ٹٹکا۔ محل میں کھرام بج گیا۔

وہ القصہ بیٹا و ساغر کو توڑ چلی حال میں اپنے ان سب کو چھوڑ
 شکایت کبھی چرخ دوار کی کبھی یاد اس ملہ رخسار کی
 کبھی دے یہ باد صبا کو پیام کہ اے بیک مشتاق بیکو خرام
 مرے گل کی تو جا کے کر جیتو کسی طرح لاوے مجھے اس کی بو
 اس کے بعد کے قصے سے خستہ دہلوی نے پورا انصاف نہیں کیا اور اسے نہایت
 مختصر طور پر ایک آدھ منٹے میں ختم کر دیا ہے۔

یہ جاتی تھی کرتی ہوئی شور غم فغاں زیر لب دہم دم چشم نم
 ہوئی تھکنی سے جو مجبور سخت ہوئی دل میں غمگین و رنجور سخت
 پڑے پانو میں اس کے چھالے تمام نہ چٹنے کی طاقت نہ تاب قیام
 وہ رنگ بیاباں وہ جنگل کی دھوپ کہ دیکھے سے کالا ہو آہو کا روپ
 کہاں وہ کھنڈ پائے رتھیں نکار کہاں اس قدر جنگل خار دار
 ہوئی مضطرب غم سے وہ مدد تھا مری ہو کے بیہوش غش آہیا
 کہاں وہ خواہیں کہاں روئے یار کہاں بزم رتھیں کہاں وہ بہار
 اکیلی پڑی تھی نہ تھا کوئی پاس ضعیف و نحیف و پریشاں آداس
 ذرا ہوش آیا تو کی ایک آہ کہ جس سے ہوا رنگ صحرایہ

زبان پر تھا نام صنم بار بار تاسف سے روئی تھی وہ زار زار
اٹھا سر کو پتھر پہ پٹکا وہیں ہوا سدا زخمی سر تازہیں
مرخص ہوئی اس کی پھر تن سے جاں الم سے ہوا تیرہ سدا جہاں^(۱۱۱)

اس کے بعد چرواہے کا سستی کو دفن کرنا، بٹوں کا کچھ سے پلٹ کر آنا، قبر دیکھ کر
ٹھٹھکا، چرواہے سے ماجرا سننا، قبر کا شق ہونا، بٹوں کا اس میں سا جانا وغیرہ
واقعات وہی ہیں، جنہیں پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ الہتہ سستی کا پتھروں سے سر مار
مار کر مرنے کا واقعہ قدرے بدلا ہوا ہے۔ ہاشم کے ہاں سستی پیاس کے مارے
تڑپ تڑپ کے جان دیتی ہے۔

مثنوی کے آخری اشعار دعائیہ ہیں۔ اس کے بعد مصنف اور اس کے
احباب کے کہے ہوئے دس قطعات تاریخ ہیں۔

یہ مثنوی ادبی اعتبار سے محبت خاں محبت کی مثنوی کو نہیں پہنچتی۔ خست
دہلوی کو بے چارہ گک آمیزی اور قصے کی نوک چمک سنوارنے کا مطلق خیال نہیں،
اس نے واقعات پر نظر رکھی ہے اور انہیں سیدھے سادے طور پر نظم کر دیا ہے۔
تاہم وہ شیواچیان نہ سکی، صاحب زبان ضرور ہے۔ دہلوی لب و لہجہ، صاف
سلیس الفاظ اور بے تکلف بول چال کا سائنہ مثنوی میں تاثیر پیدا کرتا ہے۔

مثنویات پدماوت

پدماوت ہندی ادب کا وہ شاہکار ہے، جسے بقائے دوام اور شہرت عام
نصیب ہوئی۔ اسے ملک محمد جانشی نے عہد شیر شاہ ۱۵۳۰ء (۹۳۷ھ) میں اودھی
زبان میں تصنیف کیا۔

ملک محمد ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ہندی مؤرخین انہیں
جائس کا باشندہ بتاتے ہیں۔ پدماوت کے علاوہ انہوں نے دو اور تصانیف اکھراوت
اور آخری کلام بھی لکھیں۔ پدماوت کی زبان اودھی ہے۔ لیکن فی الاصل یہ

کتاب فارسی رسم الخط میں لکھی گئی اور اس کے تمام تر قدیم نسخے فارسی رسم الخط ہی میں لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ ملک محمد جاسکی کا سنہ وفات ۹۳۹ھ بتایا جاتا ہے۔ (۱۲۰)

قصہ

پداوت کی کہانی کے دو حصے ہیں۔ پہلا تفتیلی اور دوسرا نیم تاریخی۔ پہلے حصے میں سنہل دیپ (۱۳۱) کے راجا گندھرد سین کی حسین بیٹی پداوتی جو ان ہونے کے بعد دل گرفتہ رہنے لگی۔ یہ ایک توتے کو جس کا نام بیرامن تھا، بہت عزیز رکھتی تھی۔ توتا شیرادی کا دل بہلانے کے لیے اسے عشق و محبت کے سنہرے خواب دکھانے لگا۔ راجا گندھرد سین نے توتے کو ہلاک کرنا چاہا لیکن وہ بچ نکلا اور ایک برہمن کے ہاتھ پڑا جس نے اسے چتوڑ کے راجا رتن سین کے پاس بچ دیا۔ راجا نے اس سے پداوتی کے حسن و جمال کا احوال سنا اور پداوتی کا تاریدہ عاشق ہو گیا۔ غرض پداوتی کو حاصل کرنے کے لیے رتن سین جوگی کے بجیس میں سنہل دیپ پہنچا۔ یہاں توتے کے ذریعے راز و نیاز کے مراحل کے طے ہوئے۔ اور بڑے رگڑوں جگڑوں کے بعد شادی ہو گئی۔ واپسی پر رتن سین اور پدمنی کا جہاز طوفان میں گھر کر رلا ہو گیا۔ طرح طرح کے مصائب و آلام سے مقابلے کے بعد دونوں چتوڑ پہنچے۔ پہلی رانی ناگمتی اور پداوتی دونوں راجا کے ساتھ ہمیشہ خوشی رہنے لگیں۔

اس کے بعد کا حصہ نیم تاریخی رنگ کا ہے۔ سلطان علاء الدین نے چتوڑ سے نکالے ہوئے رانگھو نامی ایک برہمن سے پدمنی کے حسن و جمال کا تذکرہ سنا اور اس کے حصول کے لیے چناب ہو گیا۔ چتوڑ پر چڑھائی کی گئی۔ لیکن آٹھ برس کے بعد بھی قلعہ فتح نہ ہوا۔ بالآخر علاء الدین نے صلح کر لی۔ رتن سین نے

۱۲۰ ہندی سابقہ کا اجلاس، رام چندر کل، ص ۹۳ تا ۹۸

۱۳۱ بعض راجوں کے مطابق سنہل دیپ سے مراد نکا ہے، لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک محمد جاسکی نے جزائر کو سنہل دیپ کہا ہے یہ جزیرے نکا سے جنوب غرب واقع ہیں۔

سلطان کی مسلسل کئی روز تک دعوت کی۔ ایک دن اتفاقاً محل کے قریب ایک آئینے میں علاء الدین نے پدامتی کا عکس دیکھ لیا جس کے بعد سلطان کی تمنا و بیقراری کئی گنا بڑھ گئی۔ جب کوئی تدبیر کارگر ہوتی نظر نہ آئی تو علاء الدین نے دھوکے سے رتن سین کو گرفتار کر لیا اور دہلی میں لا کر قید کر دیا۔

راجپوت سرداروں نے راجا رتن سین کو رہا کرانے کے لیے چال چلی۔ چند جاہاز سپاہی پاکیزوں میں چھپ کر دہلی پہنچے۔ مشہور کیا گیا کہ پدمنی علاء الدین کے حرم میں داخل ہونے کے لیے آئی ہے۔ چنانچہ اسے راجا رتن سین سے آخری بار ملنے کی اجازت دی گئی۔ پاکیزوں میں چھپے ہوئے راجپوت عین موقع پر سکواہیں سونت سونت کر باہر نکل آئے اور انھوں نے قلعے کے سپاہیوں کو مارا ماریا۔ اس طرح راجا علاء الدین کی قید سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

چوڑ چنچے ہی رتن سین کا مقابلہ اپنے پڑوسی راجا دیو پال سے ہو گیا۔ جس نے رتن سین کی غیر موجودگی میں پدامتی کو ورغلانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ دونوں میں سخت معرکہ ہوا۔ دیو پال مارا گیا اور رتن سین کے بھی مہلک زخم آئے۔ اسی اثنا میں علاء الدین بھی ایک جمعیت کثیر لیے رتن سین کے تعاقب میں چوڑ چنچل۔ مگر پدمنی اس کے وہاں چنچے سے کچھ ہی پہلے رتن سین کی لاش کے ساتھ سنی ہو چکی تھی۔ (۱۲۲)

تاریخی اصلیت

ملک محمد جہاںسی نے ۹۳ھ میں اس قصبے کو لودھی زبان میں کلبہ۔ جہاںسی کی پدامت اس قدر مقبول و معروف ہوئی کہ لوگ اس قصبے میں بیان شدہ تمام باتوں کو تاریخی واقعات سمجھنے لگے۔ چنانچہ بعد میں آنے والے بعض

۱۲۲ ملک محمد جہاںسی، پدامت، مشہور جہاںسی مرغزاد (ہندی) مرتبہ مانا پرشار میت، ہندوستانی

اکبری، المآثر، ۱۹۵۲ء

مورخوں نے بھی پداوت کی اصلیت تسلیم کر لی اور اس واقعہ کو سلطان علاء الدین غلٹی سے منسوب کر دیا۔ حالانکہ اس کے حقیقی ہونے میں کئی شبہات ہیں۔ سلطان علاء الدین غلٹی سے اس واقعے کا کوئی تعلق نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ علاء الدین کی کسی معاصر تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ تاریخ عمری (۱۲۳) اور تاریخ مبارک شاہی (۱۲۴) میں پد منی کا کوئی تذکرہ نہیں۔ برنی نے بھی اپنی تصانیف میں اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ (۱۲۵) خواجہ نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں اور مولانا عصائی دہلوی (۱۲۶) نے شاہنامہ موسوم بہ فتوح سلاطین میں چتوڑ کی فتح کا ذکر تو کیا ہے، لیکن پد منی کے وجود کو اس کا سبب قرار نہیں دیا۔ امیر خسرو نے غزائن الفتح میں چتوڑ کی فتح کو مفصل بیان کیا ہے لیکن وہ بھی اس واقعے کا ذکر جاسی کی طرح نہیں کرتے۔ (۱۲۷) امیر خسرو فتح چتوڑ کے بھٹی شاہد تھے۔ لیکن ان کے ہاں پد منی کا کہیں ذکر نہیں۔ اگر جنگ کی تہ میں واقعی پد منی کی کشش کار فرما ہوتی تو امیر خسرو جیسا بے ریا شاعر اسے ضرور بیان کرتا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعے کے بیان کرنے میں سلطان کی توہین اور نفرت تھی۔ اس لیے ہم عصر مورخین نے اسے خلاف مصلحت قرار دے کر بیان ہی نہ کیا، لیکن تاریخ فیروز شاہی، عہد علاء الدین غلٹی کے بہت عرصے بعد فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں لکھی گئی۔ اس میں علاء الدین غلٹی کے جملہ خفاکس اور عیوب پوست کندہ بیان کر دیے ہیں۔ اگر پد منی والا واقعہ سچ ہوتا تو اسے صاف صاف لکھ دینے میں

۱۲۳ تاریخ مبارک شاہی، بکچی بن احمد بن عبد اللہ دہلوی، مرتبہ محمد ہدایت حسین،

کلکتہ ۱۹۳۱ء ص ۷۷

۱۲۴ تاریخ سلاطین غلٹی، ص ۱۲۹

۱۲۵ طبقات اکبری، خواجہ نظام الدین احمد، مرتبہ لیاقت علی، کلکتہ ۱۹۲۷ء، ص ۱۵۷

۱۲۶ فتوح السلاطین، مولانا عصائی، مرتبہ ڈاکٹر مہدی حسین، ۱۹۳۸ء، آگرہ، ص ۲۲۹

۱۲۷ غزائن الفتح، امیر خسرو، مرتبہ محمد حبیب، ص ۳۹ (انگریزی)

تاریخ فیروز شاہی کے مصنف کو کیا نام مل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس حقیقت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ پدموات کے قیسے کا کوئی تعلق علاء الدین خلجی سے نہیں۔ اس کے ثبوت میں چند دلائل اور بھی ہیں:

(الف) جانشی کا بیان ہے کہ علاء الدین اور رتن سین میں متواتر آٹھ سال تک جنگ ہوتی رہی۔ اس کے برعکس غزائن الفتح اور تاریخ فیروز شاہی متعلق ہیں کہ علاء الدین خلجی نے چتوڑ کو ایک ہی حملے میں فتح کر لیا۔ (۱۲۸)

(ب) جانشی نے رتن سین کو چوہان بتایا ہے، جبکہ علاء الدین خلجی کے زمانے میں چتوڑ میں مشہور سیپا خاندان کی حکومت تھی۔ (۱۲۹)

(ج) اس زمانے میں لکا کا راجا پر اکرم بھو چہارم تھا۔ لیکن جانشی لکا کے معاصر بادشاہ کا نام گودردھن بتاتا ہے۔ (۱۳۰)

(د) کھمان راسا کی لوک روایت میں علاء الدین خلجی کے ہم عصر چتوڑ کے راجا کا نام رتن سین نہیں، بلکہ ’لکھم سی‘ اور اس کے چچا کا نام ’بھیم سی‘ آیا ہے۔ (۱۳۱)

ان تمام تاریخی شواہد کی روشنی میں پدمنی کے واقعے کو سلطان علاء الدین خلجی سے منسوب کرنا غلط ثابت ہوتا ہے۔ لیکن یہ مسئلہ مزید دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ فارسی کی ایک مشہور و معتبر تاریخ میں پدمنی کا واقعہ علاء الدین خلجی کے قلم میں اسی طرح بیان کیا ہے، جیسے اسے جانشی نے لکھا ہے۔ یہ تاریخ فرشتہ ہے، اس سلسلے میں فرشتہ کے الفاظ غور طلب ہیں:

”در خلال این احوال راجہ رتن سین راجہ لکھن چتوڑ کے تا آنوقت در

۱۲۸ غزائن، ص ۳۹

۱۲۹ تاریخ سلاطین خلجی، ص ۳۹

۱۳۰ ایضاً

۱۳۱ افسانہ پدمنی، محمد احتشام الدین دہلوی، ص ۱۳۶

جس بود، پردوش غیر مقرر، نجات یافت و شرح آں چنین ست کہ پس از مدتی کہ راجہ در قید بود، ہمسع پادشاہ رسانیدند، کہ در میان زنان راجہ چوڑ زنی ست، پد منی نام، سخی قد، سیہ چشم، ماہ سیاہ و جمیع صفات محبوبی متصف۔ پادشاہ بوسہ پیغام داد کہ خلاصی تو، منحصر در انتظار آں جلیلہ است۔ رائے قبول نمود۔ کسان بطلب اہل و عیال خود، کہ بکوہستانات محکم پناہ بردہ بودند، فرستاد تا ازاں میاں مقصود پادشاہ را حاصل نماید، اما راجہو جان خویش راجہ، ازاں پیغام و تکلیف گشت، سرزنش بسیار کردند۔۔۔۔۔ دختر رائے کہ فہم و عقل مشہور خویش و قبیلہ خود بود۔۔۔۔۔ گفت، تدبیرے بخاطر م رسیدہ، کہ ہم پدر زندہ ماند و ہم بے ناموسی فرسند۔ و آں ایست کہ پاکی بسیار پر از مردمان کار، باجماعے از پیادہ و سوار روانہ دہلی کشید و آوازہ انگلید کہ حسب الحکم پادشاہ، زنان راجہ متوجہ حضورند و چون بحوالی شہر رسند، وقت شب بہ معمورہ در آمدہ، راو جس خانہ راجہ را پیش گیرند و بعد از آنکہ نزدیک آں رسند، جملہ راجہو جان، حنیفا علم کردہ، پدر و بی و بھائی در آجند، دسر سر کشالے، کہ قدم ممانعت پیش گزارند، جدا کردہ پد ہم بر اسپ بار رفتار سوار سازند و برق ساں راو ملک خود پیش گیرند۔ اہل رائے آں رائے را پسندیدہ بہاں محل نمودند، و جماعے از فدائیاں در پاکشیا نشستہ روانہ دہلی شدند۔ و فکلیہ پاسے از شب گزشتہ بود، بہ شہر در آمدند و آوازہ انداختند، کہ پد منی را با سائر متعلقان رائے آوردیم۔ چون بوقت نزدیک شدند، یک بار راجہو جان شمشیر با کشیدہ از پاکشیا بیرون آمدہ دیدند، و بہ قتل محافظان اقدام نمودہ، و بھجر رائے بھلکندہ و اود را سوار کردہ ہم چو مرنے کے از نفس نجدہ از شہر بیرون شدند، و بہ جماعے از راجہو جان کہ مولود بودند، پیوستہ راہ ولایت خود پیش گرفتند۔ و در اثنائے راہ سواران پادشاہ بہ تعاقب کردہ بودند، در چند موضع پایشاں رسیدہ تلاشبا کردند، و جعے کثیر از راجہو جان بھتل آوردند۔ لیکن رائے بہر عنوان کہ توانست، افساں و خیزاں بمصلحت بسیار خود را بکوہستانیکہ اہل و عیال اور در انجا بودند، رسانید و

نہیں دوسرا تدبیر و فتنہ خوب سیرت فرچنگ حکومت پادشاہ نہایت یافتہ (۱۳۲)

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ پدمنی کے حصول اور راجا کی رہائی کے بارے میں فرشتہ کا بیان جانشی سے بہت دیر قبل ہے لیکن متعدد مستند اور معاصر تاریخوں کی خاموشی کے پیش نظر فرشتہ کے بیان کو صحیح تسلیم کر لینا تاریخی احتیاط کے خلاف ہے۔ علاء الدین خلجی نے ۱۲۹۳ء میں چتوڑ فتح کیا۔ اس کے ۲۴۳ برس بعد یعنی ۱۵۳۶ء میں جانشی نے پدمات اور ۳۱۲ برس بعد یعنی ۱۸۱۵ء میں فرشتہ نے اپنی تاریخ لکھی۔ حیرت ہے کہ تین سو برس تک کسی دوسرے مؤرخ یا مصنف نے اس واقعے کا کوئی ذکر نہ کیا۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ اس واقعے سے متعلق خود فرشتہ کا ماخذ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جانشی کی مشہور تصنیف ہوتے ہی بہت مقبول و معروف ہوئی اور ہر خاص و عام کی زبان پر اس کی کہانی چڑھ گئی، چونکہ اس میں شجاعت، حسن، دلیری اور مردانگی کے عناصر کی فراوانی تھی، راجپوتوں نے اسے اپنی قومی تاریخ کا واقعہ سمجھا اور عام طور پر اسے سلطان علاء الدین خلجی سے منسوب کیا جانے لگا۔ فرشتہ کے زمانے میں یہ کہانی امر واقعہ سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ اس نے بھی اسے صحیح تسلیم کیا اور اپنی تاریخ میں اسے سلطان علاء الدین خلجی کے حالات میں درج کر دیا۔ جیسے تاؤ نے بھی پدمنی کے واقعے کا ذکر کھمان راسو کو بنیاد بنا کر کیا ہے۔ (۱۳۳) کھمان راسو راجپوتوں کا قومی گاتھا ہے۔ کھمان غالب ہے کہ خود کھمان راسو میں پدمنی کا ذکر جانشی کی پدمات کی شہرت کے بعد کیا جانے لگا۔ جانشی کی مشہور شیر شاہ سوری کے زمانے میں مکمل ہوئی تھی، جبکہ کھمان راسو اکبر اعظم کے آخری زمانے میں مدون ہوا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر فرشتہ، جانشی کے روایتی قصے سے متاثر ہو کر اسے اپنی تاریخ میں لکھ گیا ہے اور کھمان راسو میں بھی پدمنی کے

۱۳۲ تاریخ فرشتہ (جلد اول) مطبوعہ نول کشور، نکتہ ۷۳، ۱۸۷۷ء، ص ۱۱۵

۱۳۳ Annals and Antiquities of Rajasthan, Tod (James) ۱۸۸۳ء، جلد اول، ص ۲۱۳

حوالے جانشی کی مثنوی کا نتیجہ ہیں تو کیا جانشی کی کہانی کا واقعاتی حصہ محض اس کے تخیل کی پرواز ہے یا اس کا کوئی تعلق اپنے زمانے کے عمارت سے بھی ہے۔ جانشی کے زمانے کی سیاست کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ پدمنی جیسی حسین عورت کے لیے کسی بادشاہ کا جنگ پر آمادہ ہونا کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ اس بات کی قطعی تردید ہو جانے کے بعد کہ علاء الدین غلٹی کے حملہ چوڑ میں کسی ایسی چیز کو دخل نہیں تھا، گمان گزرتا ہے کہ پدمنی کے لیے چوڑ پر حملہ کرنے والا علاء الدین غلٹی نہیں بلکہ کوئی دوسرا غلٹی حکمران ہو اور اس کے نام میں جانشی اور جانشی سے متاثر دوسرے رولویوں کو قتل قہمی ہوئی ہو۔ محمد احتشام الدین^(۱۳۳) کا یہ خیال صحیح ہے کہ پدمنی کے قہمی میں کوئی صداقت ہے تو یہ واقعہ سلطان غیاث الدین غلٹی سے متعلق ہو سکتا ہے۔ غیاث الدین غلٹی (علاء الدین کے دو سو برس بعد) ملک مالوہ میں گزرا ہے۔ اس کے حدود سلطنت چوڑ کی ریاست سے ملے ہوئے تھے اور اکثر باہم لڑائی رہتی تھی۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ سلطان کے دربار میں کوئی نامشروع بات نہیں ہونے پاتی تھی۔ لیکن اسے خوبصورت عورتوں کا بے حد شوق تھا۔ ہزار ہا حسین عورتیں اس کی خدمت میں حاضر رہتیں۔ پھر بھی سلطان کو حسرت تھی کہ جیسے غمسن اور صورت کو اس کا بی چاہتا تھا، وہ میسر نہیں۔ آخر اس کے ایک مصاحب نے اپنی کوششوں سے سلطان کی یہ خواہش پوری کی۔

اس میلان کے سلطان سے بعید نہیں کہ اس نے حسین ترین عورت (پدمنی) کی جنتو میں چوڑ پر دھوا بول دیا ہو۔ ساتھ ہی وہ شرع کا بھی بہت پابند تھا اور شرع کی رو سے چونکہ غیر کی زوجہ پر نظر ڈالنا حرام ہے، اس لیے شرع کی گرفت سے بچنے کے لیے غیاث الدین غلٹی نے چوڑ کی حسین ترین رانی کو جس کا نام اس کے حسن کے سبب سے پدمنی یا پدموت رہا ہو، آئینے میں دیکھنے کی ترکیب نکالی ہو اور اس کی حسن پرستی کا یہ واقعہ عوام کی زبان پر چڑھ کر

دور و نزدیک مشہور ہو گیا ہو۔

غیاث الدین خلجی سلطان مالوہ اور خاندان چتوڑ کے مابین جنگ کی تصدیق اکھنکاشی کے ایک ہندو کتبے سے بھی ہوتی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ۱۴۸۸ء میں مالوہ کے سلطان غیاث الدین خلجی نے ”پادل گورا“ سے شکست کھائی۔ یہ ”پادل گورا“ نامی راجپوت سردار وہی ہے جس کا ذکر مشہوری پدموت میں جانشی نے بار بار کیا ہے۔ پدموتی کے واقعے کو غیاث الدین خلجی سے منسوب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ رتن سین نام کا کوئی راجا علاء الدین خلجی کے زمانے میں چتوڑ کا حکمران نہیں تھا۔ لیکن راجا ساگا کا فرزند رتن سین تقریباً غیاث الدین خلجی ہی کے زمانے میں چتوڑ کا راجا ہو گیا ہے اور اغلب ہے کہ اسی رتن سین سے غیاث الدین خلجی کے معرکے رہے ہوں۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ غیاث الدین خلجی ہی کی حسن پرستی کے واقعے پر جانشی نے اپنی مشہوری کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ واقعہ جانشی کے اپنے زمانے سے قریب تھا اور اس سے جانشی کا متاثر ہونا بعید از قیاس نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قصے کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے جانشی نے اپنے زمانے کے دوسرے تاریخی واقعات سے بھی اثر لیا ہو۔ مثلاً ڈولیوں اور پاکلیوں میں مسلح سپاہیوں کا جانا اور گوہر مقصود حاصل کرنا خود جانشی کی زندگی کا واقعہ ہے۔ شیر شاہ نے بنگالہ کی مہم کو جاتے ہوئے اپنے اہل و عیال اور خزانے کو رجتاس کے راجا کے پاس چھوڑنے کی اجازت چاہی تھی۔ لیکن دراصل پاکلیوں میں سپاہی بھیج کر قلعہ فتح کر لیا تھا۔ قصہ پدموت کی تیسری اہم کڑی یعنی جوہر کی رسم بھی غیر تاریخی بات نہیں۔ خود جانشی کے زمانے میں جب ۹۳۸ھ میں سلطان بہادر گجراتی نے رائے سین کے راجا سلہدی پر فوج کشی کی تو اس کی یگانہ روزگار رانی درگادتی اور سینکڑوں دوسری رائیوں نے آگ میں کود کر جوہر کرایا۔ سین ممکن ہے کہ جانشی نے اپنے زمانے کے ان واقعات کو آب و تاب دے کر ایک مربوط مشہوری کے حیکر میں ڈھال دیا ہو۔

بہر حال جاسی کی پداوت اس قدر مقبول و معروف ہوئی کہ اس کا قصہ مختلف زبانوں میں ترجمہ و تخیلیں کے ذریعے پھیل گیا۔

اس کا اولین انگریزی ترجمہ جی۔ اے گریسن اور سدھا کر دویدی نے مل کر کیا تھا جو کلکتہ سے ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔ (۱۳۵) انگریزی کا ایک اور ترجمہ فیض آباد کے انگریز کمشنر اے۔ سی۔ شریف نے ۱۹۳۰ء میں کیا۔ (۱۳۶) پشتو زبان میں پداوت کو ابراہیم نے منتقل کیا۔ (۱۳۷) پشتو زبان کا دوسرا ترجمہ ملا گل احمد پٹانی کا ہے۔ یہ "قصہ شہزادہ رت و پدمن افغانی" کے نام سے دہلی سے ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا۔ (۱۳۸) بنگالی میں اس قصے کا ترجمہ ارکان کے وزیر کنٹھا کر نے کسی شخص "الواج لو" سے ۱۶۵۹ء میں کرایا۔ (۱۳۹)

فارسی اور اردو میں بھی پداوت سے متعلق کئی نسخے ملتے ہیں۔ چونکہ بعض اردو مثنوی نگاروں نے قصہ اصل اودھی سے نہیں، بلکہ فارسی مثنویوں سے اخذ کیا ہے، اس لیے فارسی نسخوں کے نام سامنے رکھنا بھی ضروری ہیں۔

فارسی نسخے

۱۔ فارسی میں پداوت کو سب سے پہلے عبدالغفور بڑی نے بعد جہانگیر ۱۶۱۸ء (۱۰۲۸ھ) میں کھلایا۔ یہ مثنوی انڈیا آفس لندن میں موجود ہے۔ (۱۴۰) (رت پدم)

۲۔ عاقل خاں رازی نے ۱۶۵۸ء (۱۰۶۹ھ) میں "شیخ و پروانہ" کے

۱۳۵ ہندی، م ۱۸۳

۱۳۶ ڈاکٹر گیان چند جین، رسالہ اردو، اگست ۱۹۵۰ء

۱۳۷ ۱۵۸۳ء

۱۳۸ پشتر کتب برقی کالم ۲۰

۱۳۹ ہندی سانبھہ کا انہاس، رام چندر شل، م ۹۲

۱۴۰ ۱۵۸۳ء نیز اشپراگر م ۳۷۹، آصفیہ ج ۲، م ۱۳۷۸

نام سے یہی قصہ پھر لکھا۔ اس کا مخطوط برٹش میوزیم لندن اور انڈیا آفس میں محفوظ ہے۔ (۱۳۱)

۳۔ مشکوی "حسن و عشق" از حسام الدین، ۱۶۶۰ء (۱۰۷۰ھ) نئی دہلی میں ۹۲۹۔ (۱۳۲)

۳۔ مشکوی پداوت، از حسن عازانہ نئی دہلی میں ۹۱۱ء میں۔ (۱۳۳)

۵۔ بھی رام متوطن ابراہیم آباد نے عاقل خاں رازی کی مشکوی "طبع و پروانہ" کو فارسی نسخہ میں "فرح بخش" کے نام سے منتقل کیا۔ نئی دہلی میں ۱۲۱۷ھ (۱۳۴)

۶۔ "فرح بخش" کا فارسی خلاصہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے کیا۔ اس کا مخطوط برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔ (۱۳۵)

۷۔ "قصص پداوت" کے نام سے حسین غزنوی نے فرخ میر کے زمانے میں لکھا۔ (۱۳۶)

۸۔ رائے گوہر بخشی نے پداوت کو فارسی میں لکھ کر "تختہ القلوب" نام رکھا۔ تصنیف ۱۶۵۲ء اس کا ایک ناقص مخطوط ہارڈنگ لاہوریری، دہلی میں محفوظ ہے۔ (۱۳۷)

۹۔ دکنی شاعر سید محمد عسقلانی نے جانی کی پداوت کو فارسی میں نقل کیا۔ اس کا سنہ تصنیف "مگلے غنیمت" ۱۶۹۸ء (۱۱۱۰ھ) ہے۔ (۱۳۸)

۱۳۱۔ ۱۶۳۲ء اور ۱۶۳۵ء، نیر اشرفاگر، ص ۵۳۳، سالار جنگ ۷۱۷ فارسی نظم

۱۳۲۔ پراپ میں دکنی مخطوطات، ص ۷۷

۱۳۳۔ ایضاً

۱۳۴۔ رج، برٹش، نمبر ۱۸۹۱۸، ص ۶۶۸

۱۳۵۔ ایضاً، نمبر ۱۹۴۱

۱۳۶۔ اسٹورٹ (فارسی مخطوطات) ص ۷۳

۱۳۷۔ ہارڈنگ لاہوریری، دہلی، فارسی مخطوطات، نمبر ۳۸

۱۳۸۔ جسٹس فارسی، اردو سے ترجمہ، ص ۹۸

۱۰۔ مثنوی بوستان سخن (قلمی) امای، سنہ تصنیف ۱۲۲۹ھ، تعداد اشعار ۳۲۹۳ نسخہ نیشنل میوزیم نئی دہلی۔ (۱۳۹)

۱۱۔ چنگھہ عشق (قلمی) فشی آئند رام غلص نے پداوت کا قصہ ۱۱۵۲ھ میں فارسی نثر میں قلم بند کیا۔ غلص نے اس قصبے کے فقط پہلے حصے کو لیا ہے اور جنگوں وغیرہ کے نیم صدیقی واقعات حذف کر دیے ہیں۔ ان کے ہاں قصبے کی روایت بھی جافسی سے قدرے مختلف ہے۔ مرکزی کرداروں کے نام بھی تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ مثلاً ہیر وئن کا نام چندر پر بھا اور ہیر و کا کنور سندھ سین بتایا گیا ہے۔ یہ قصبہ دونوں کی شادی پر ختم ہو جاتا ہے۔ غلص نے ۱۱۵۵ھ میں اس قصبے پر نظر ثانی کی۔ اس کا مخطوطہ تذریہ لاہوری دہلی میں محفوظ ہے۔ (۱۵۰)

۱۲۔ ”قصبہ پد منی وغیرہ“ قلمی (مثنوی فارسی) مجہول المصنف۔ نسخہ کتب خانہ نچہ سلطان (۱۵۱)

۱۳۔ قصبہ رتن و پدم قلمی (مثنوی فارسی) مجہول المصنف، نسخہ کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد، دکن (۱۵۲)

اردو نسخے

۱۔ اردو نثر میں پداوت کو سب سے پہلے مرزا عتایت علی بیگ عتایت لکھنوی نے لکھا۔ اس کا نام ”پداوت بھاکا مترجم“ ہے۔ یہ ترجمہ مطبع اعظمی کانپور سے ۱۸۹۸ء (۱۳۱۶ھ) میں طبع ہوا۔ جافسی کی مثنوی کا متن اردو رسم الخط میں درج کیا گیا اور اس کے نیچے اشعار کا اردو ترجمہ ساتھ ساتھ دے دیا ہے۔ (۱۵۳)

۱۳۹ نیشنل میوزیم، نئی دہلی۔ ذخیرہ قتبک ۳۰۸۵

۱۵۰ تذریہ لاہوری، دہلی۔ فارسی مخطوطات نمبر ۱۳

۱۵۱ اشعار فارسی مخطوطات، ص ۷۳

۱۵۲ آصفیہ، جلد ۲، ص ۱۳۸۳، نمبر ۳۹

۱۵۳ پداوت بھاکا مترجم، عتایت علی بیگ، عتایت لکھنوی، مطبع اعظمی کانپور، ۱۸۹۸ء

- ۲۔ ”پداوت بھاکا مترجم“ از احمد علی رسا۔ ہندی متن اردو رسم الخط میں، مع اردو ترجمہ و اردو حواشی، کانپور، ۱۸۹۹ء، صفحات ۲۳۶ (۱۵۳)
- ۳۔ ”پداوت“ (یعنی ایک بچی داستان) از ساگ رام۔ ساکن کپور تھلہ، لاہور، ۱۸۹۸ء، صفحات ۱۷۲ (۱۵۵)
- ۴۔ پداوت بھاکا مترجم از چنڈت بھگوتی پرساد پانڈے انوج، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ص ۳۳۶ (۱۵۶)
- ۵۔ میر عبد الجلیل بکراہی نے علی جلی ”بھاکا اور اردو“ زبان میں پداوت لکھی۔ اس کا ذکر ضیاء الدین خاں نے پداوت کے فارسی خلاصے میں کیا ہے۔ (۱۵۷)
- ۶۔ پداوت اردو (منظوم ڈراما) از نوشیرواں جی مہربان جی آرام، بمبئی (۱۵۸)
- ۷۔ محبت کی پتی یعنی رانی پداوتی (اردو نثر) از محمد اکبر علی خاں، افسوں شاہجہاںپوری۔ اس میں پد منی اور رتن سین کے عشق کا قصہ ناول کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ (۱۵۹)
- ۸۔ مثنوی پدم ساج اردو (قصہ پداوت) از بہاری لال بیدل، صفحات ۱۳۰، مطبوعہ بجنور، ۱۸۸۵ء (۱۶۰)
- ۹۔ پداوت، ہزبان ہریانہ (گیتوں اور دوہوں میں) از چنڈت سرورپ چند دوسو کیشری۔ اردو رسم الخط میں یہ کتاب شجودیاں دینا ناتھ نے دریہ کلاں

۱۵۳ بلوم ہاٹ برنس خیر، ص ۲۶۲

۱۵۵ بلوم ہاٹ برنس خیر، ص ۳۲۲

۱۵۶ کتب خانہ دانش محمد علی

۱۵۷ راج ۱۰۳۶ ب

۱۵۸ اردو ڈراما، حضرت رحمانی، ص ۲۰۳

۱۵۹ ابرار اللہانی پریس، آگرہ، کل صفحات ۱۱۲

۱۶۰ اطیاء مطبوعات

دہلی سے اواخر انیسویں صدی میں شائع کی۔

۱۰۔ ہیرامن قوتا پداوت نار، بزبان ہریانہ (گیتوں اور دوہوں میں)
مصنف سی ایچ حکم چند۔ یہ کتاب بھی اردو رسم الخط میں دہلی سے شائع ہوئی۔

اردو نظم

اردو نظم میں پداوت کی چھ روایتوں کا علم ہوا ہے۔ ان میں سے تین
دکنی شاعروں اور تین شمالی ہند کے شاعروں سے منسوب ہیں:

۱۔ قصہ پداوت۔ غلام علی دکنی (دکنی) نئیے اٹلیا آفس (۱۹۱) اور ابق
۲۱، سنہ تصنیف ۱۶۸۰ء (۱۰۹۱ھ) یہ نسخہ مکمل نہیں ہے۔

۲۔ رتن پدم۔ سید محمد فیاض ”دلی“ دیلوری۔ یہ مشنوی بہ قول اشپراگر
شاہان اردو کے کتب خانے میں تھی۔ تعداد ابیات تقریباً چار ہزار، صفحات
چار سو۔ (۱۶۳)

۳۔ دیپک پتنگ۔ سید محمد خاں عشرتی۔ مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ
حیدر آباد، صفحات ۲۱۶۔ سنہ تصنیف ۱۶۹۵ء (۱۱۰۷ھ) سنہ کتابت ۱۱۸۹ھ (۱۶۳)

۴۔ مشنوی شمع و پروانہ۔ ضیاء الدین عبرت و میر غلام علی عشرت۔
سنہ تصنیف ۱۷۹۶ء (۱۲۱۱ھ) (۱۶۳)

۵۔ پداوت۔ محمد قاسم علی بریلوی، سنہ تصنیف ۱۸۶۹ء، ص ۸۳ (۱۶۵)

۶۔ سائیکیت پداوت، از سکھ داس ظلف نرائن داس، چندوسی، ۱۸۹۰ء
صفحات ۱۰۸۔ (۱۶۶) یہ مقامی روایتوں پر مشتمل ایک نظم ہے جس میں جگہ جگہ

۱۶۱ بوم ہدیت اٹلیا نمبر ۳/۷۳

۱۶۲ اشپراگر نمبر ۷۲۰

۱۶۳ سالار جنگ، ص ۶۱۹

۱۶۴ مخطوطہ پداوت، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، نکلان ۷۵/۷۳۰

۱۶۵ پداوت، محمد قاسم علی بریلوی، مطبع نول کشور، ۱۸۷۳ء، کان پور

۱۶۶ بوم ہدیت برٹش میوزیم، ص ۴۴۳

دوسے بھی آگئے ہیں۔ غالب یہ گانے کے لیے لکھی گئی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔

۷۔ مشنوی ”بت خانہ خلیل“ از خلیل حسن خلیل لکھنوی۔ یہ ملک محمد جانشی کی پداوت کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ خلیل بڑے بھائی جلیل کے۔ امیر بینائی سے شرف کمند تھا۔ راجا بلرام پور کے ملازم ہوئے اور ملام حیات انھیں سے وابستہ رہے۔ ریاست ہی کی طرف سے ان کی تصانیف ”مرقع بلرام پور“ اور ”پنچ نگارین“ زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ ”پنچ نگارین“ ان کی پانچ مشنویوں کے مجموعے کا نام ہے، جن میں سے ایک پداوت کا بھی اردو ترجمہ مشنوی ”بت خانہ خلیل“ ہے۔ (۱۶۷)

مشنوی پداوت، غلام علی دکنی

اس مشنوی کا داود نسو انڈیا آفس میں محفوظ ہے۔ (۱۶۸) یہ ناقص الاخر ہے اور اس نامکمل نسخے کے سوائے اس مشنوی کا کوئی اور نسخہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔

غلام علی کے بارے میں تذکرے خاموش ہیں۔ مشنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام علی بلند پایہ شاعر تو نہیں تھا، تاہم اس نے اپنی مشنوی کو دلچسپ بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ یہ مشنوی سلطان ابوالحسن تاتاشاہ کے زمانے میں لکھنؤ کی گئی۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۶۸۰ھ (۱۰۹۱ھ) ہے۔

مشنوی کی ابتدا حسب رواج حمد و نعت و منقبت سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد بادشاہ کی مدح ہے اور عشق کی تعریف سے قصے کا آغاز ہوتا ہے۔ غلام علی نے اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا۔ نصیر الدین ہاشمی نے ”مہرپ“ میں دکنی مخطوطات میں اس مشنوی کا مفصل ذکر کیا ہے۔ عبدالشکور بڑی کی فارسی مشنوی

۱۶۷ بولی دنیا، ستمبر ۱۹۳۹ء اور جولائی ۱۹۳۹ء

۱۶۸ علوم ادب، اپریل نمبر ۳/۷۳

سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ غلام علی کا قصہ بڑی سے ماخوذ ہے۔ یہ مثنوی ناقص الآخر ہے، شادی کے بعد جب راجا رتن سین پدمنی کو ساتھ لیے چٹوڑ واپس روانہ ہوتا ہے تو راہ میں ان کا جہاز طوفان میں گھر کر پاش پاش ہو جاتا ہے اور یہ لوگ ایک راکشس کے زخمی میں پھنس جاتے ہیں۔ اس کے بعد مثنوی کے اوراق غائب ہیں۔ خاتمہ ان اشعار پر ہے :

میں راکشس، توں انسان میرا خوراک لے آیا ہوں یاں تچ کوں کرنے ہلاک
دیوتا ہے توں جو مچ لب آئیا میری بات سن سات توں آئیا
غلام علی کا اسلوب بیان سادہ اور آسان ہے۔ گو کلفندہ کی مثنویوں میں یہ مثنوی تاریخی مقام رکھتی ہے۔^(۱۶۹)

مثنوی رتن پدم، ولی ویلوری

پداوت کا دوسرا مظلوم ترجمہ ولی ویلوری کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ ظاہر یہ مثنوی تاباب ہے اور اس کا کوئی مخطوطہ اس وقت یورپ یا ہندستان میں نہیں۔ اس کا ذکر صرف اشپراگر^(۱۷۰) اور اسٹوارٹ^(۱۷۱) نے اپنی اپنی فہرستوں میں کیا ہے۔ ”قصہ پداوت وکھنی“ سے متعلق اسٹوارٹ نے مصنف کے نام کی صراحت نہیں کی اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ یہ قصہ نثر میں لکھا گیا یا مثنوی میں تھا۔^(۱۷۲)

ولی ویلوری کا پورام نام سید ولی فیاض اور ولی محقق تھا۔^(۱۷۳) وہ ویلور علاقہ مدراس (موجودہ قمل ناڈو) کا باشندہ تھا اور عالسگیر کے زمانے میں تھا۔ وفات

۱۶۹ یورپ میں وکھنی مخطوطات ۱۹۳۲ء، ص ۱۱۷-۱۲۰

۱۷۰ اشپراگر، ص ۶۳۱، نمبر ۷۲۰

۱۷۱ فہرست کتب خانہ نچے سلطان، اسٹوارٹ، ص ۱۸۰

۱۷۲ اسٹوارٹ، ہندی و وکھنی مخطوطات، ص ۱۸۰، نمبر ۱۱

۱۷۳ مٹس اللہ کھوری، حدود سے قدیم ۱۹۳۵ء، ص ۱۰۰

قبل ۱۵۰۰ھ۔ رتن پدم کے علاوہ دلی نے دو اور مشنویاں روضۃ الشہداء اور دعائے قاطرہ بھی لکھیں۔ (۱۷۵)

دلی دلیوری نے مشنوی پدموت کے شروع میں اپنے حالات بیان کیے ہیں۔ پہلے یہ سات گڑھ میں حراست خاں کی رفاقت میں رہا، اس کے بعد گڑھ چلا آیا اور یہاں کے صوبہ دار نواب عبدالجید خاں کا ملازم ہو گیا، جس نے اسے سدھوت میں تعینات کر دیا۔ قصہ رتن پدم بمقام سدھوت ہی لکھا گیا۔ اشپرا نگر نے اس مشنوی کا نام صرف ”رتن“ بتایا ہے (۱۷۶) جو غلط ہے۔ مشنوی کا پہلا شعر ہے:

خدا یا تو ہے پاک پروردگار نرنگار داسار د ایجھے پار
مخلص:

دلی حیرے کرم کی ہے مجھے آس نہ کر اس آس سوں ہرگز تو زاس
اشپرا نگر کا بیان ہے کہ یہ مشنوی ذخیرۂ قوٰپ خانہ میں تھی، کل صفحات چار سو اور ہر صفحے پر گیارہ ابیات تھے۔ (۱۷۷)

مشنوی دیک پتنگ، عشرتی

عشرتی کی اس مشنوی کے نسخے جنوبی ہند کے کتب خانوں میں عام پائے جاتے ہیں۔ اردو سے قدیم اور اردو شدہ پارے میں اس مشنوی کا ذکر ملتا ہے۔ اس مشنوی کا ایک مستند نسخہ، عشرتی کے پوتے، زین العابدین کے ہاتھ کا لکھا ہوا کتب

۱۷۳ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو (پارسہ) ص ۲۲۸

۱۷۵ خمس اللہ قادری، اردو سے قدیم، ص ۱۰۲

۱۷۶ اشپرا نگر، ص ۶۳۱

۱۷۷ اشپرا نگر، ص ۷۳۰

خانہ سالار جنگ حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ اس کا سنہ کتابت ۱۱۸۹ھ ہے۔ یہ مشنوی ۱۶۹۵ء (۱۱۰۷ھ) میں تصنیف ہوئی۔ (۱۷۸)

عشرتی کا پورا نام سید محمد اور والد کا نام سید یوسف حسینی تھا۔ حیدر آباد کے رہنے والے تھے۔ اورنگ زیب کے عہد میں گزرے ہیں۔ (۱۷۹) مولف ”دکن میں اردو“ نے دیکھ چنگ کے علاوہ ان کی دو اور مشنویوں: چیت لکن اور نیہ درپن کا بھی ذکر کیا ہے۔ (۱۸۰) عشرتی نے جانشی کی پدمات کو فارسی میں مختص بھی کیا تھا، جس کا ذکر فارسی نسخوں کے ذیل میں اور پر کیا جا چکا ہے۔

مشنوی دیکھ چنگ حمد و نعت و مناقب سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد عشرتی نے اپنے دوست خواجہ علی کا تذکرہ کیا ہے، جس کے بعد سے قصے کا آغاز ہے۔ عشرتی نے پدمات کا جو قصہ بیان کیا ہے، وہ عام قصوں سے قدرے مختلف ہے۔ یہاں عشق کی ابتدا پدمات کی طرف سے ہوتی ہے اور وہ رتن کی تلاش میں مصیبتیں بھیجتی ہے۔ آخر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرتی ہے۔ مشنوی کا آخری ورق ختم نہیں ہے۔

آغاز

الٹی توں سر جیا زمین ہو رہ زماں دیکھیا سورج جوت سوں آسماں
لنگ کوں بنایا توں گردش کے چال سید جس میں لایا چندر کا ہلال

خاتمہ

بہنود میں یوں دیکھا سو وہ سب نہیں سنا بھیگی شنگ روٹی کینکس (۱۸۱)

۱۷۸ سالار جنگ، ص ۶۱۹

۱۷۹ اردو سے قدیم، ص ۹۸

۱۸۰ دکن میں اردو، ص ۲۳۲، یہ لفظ ہے کہ یہ درپن جہان کی تصنیف ہے

۱۸۱ سالار جنگ، ص ۶۱۹

مثنوی شمع و پروانہ

پداوت کا یہ چوتھا مضمون ترجمہ دو مصنفوں کا مرہون منت ہے۔ ضیاء الدین جبرت نے رامپور کے سپہ سالار مجاہدوں کی فرمائش پر اسے نظم کرنا شروع کیا تھا۔ ضیاء الدین خاں جبرت، محبت خاں، محبت بن حاتم و رحمت خاں، دامی روہیلکھنڈ کے شاگرد تھے۔ قصہ انہی ایک تہائی کے قریب ہی نظم ہوا تھا کہ جبرت نے دامی اہل کو بلکہ کہا۔ اسے جبرت کے انتقال کے تقریبات آٹھ برس بعد غلام علی عشرت بریلوی نے قدرت اللہ شوق کی فرمائش پر ۱۲۷۱ھ میں پورا کیا۔ (۱۸۲) عشرت میر معظم علی کے بیٹے تھے۔ مشورہ خاں مرزا علی لطف سے تھا اور بریلی کے رہنے والے تھے۔ (۱۸۳)

اس مثنوی کے قلمی نسخے عام طور پر دستیاب ہوتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ کا نسخہ ناقص الآخر ہے۔ اس کا مکمل نسخہ لندن لاہوری کے ذخیرہ سر شاہ سلیمان میں موجود ہے۔ (۱۸۴) یہ مثنوی پہلے پہل کلکتہ سے ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد سے اس کے کئی ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔

مثنوی کی ابتدا ضیاء الدین جبرت نے حسب دستور، حمد، ثناء، مناجات اور بحر طریقت کی تعریف سے کی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے چند اشعار اپنے استاد محبت خاں جبرت کی مدح میں لکھے ہیں۔ آگے کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ جبرت جب ایک ہندو راجا رانی کا قصہ لکھتے تھے تو بعض احباب نے اعتراض کیا۔ جبرت انھیں جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ عشق آزاد ہے گا کفر و دین سے نہیں کچھ کام اسے شک و یقین سے
نہیں کچھ مانا عیسیٰ حتم کار کہ کیا صبیح ہے اور کیا ہے زہار

۱۸۲ مثنوی شمع و پروانہ (قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ، نکلن ۷۵/۶۳۰

۱۸۳ گلشن ہے خند، ص ۱۳۵

۱۸۴ مثنوی شمع و پروانہ (قلمی) ذخیرہ سر شاہ سلیمان، علی گڑھ، ۵۰/۱۰۸۱

جہاں میں عشق کا جو رسم و رواج ہے مخالف حضرت شرع میں ہے
کے کا اعتراض اس میں جو ہے جا جناب عشق کا مردود ہوگا (۱۸۵)

اس کے بعد ضیاء الدین عبرت معترضین کو لاجواب کرتے ہوئے کہتے
ہیں کہ میرا وطن ہندوستان ہے اور مجھے وطن سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہیں۔ جو
بات اپنے وطن میں ہے، وہ دوسرے ملکوں میں کہاں؟ پھر کیوں اپنے وطن کو
چھوڑ کر دوسروں کے قصبے دوہراؤں؟ وطن کی روایتوں اور قصوں سے منہ موڑنا
وطنیت کے تقاضے کے خلاف ہے:

لیکن قصہ کہتا ہوں وطن کا کہ ہوں میں عنایت اپنے جن کا
سواہ ہند کو اے مونس جاں! بھوک شربت چشم صفا ہاں
کروں ہندوستان کا عشق مرقوم ہے جس سے عرب کے ملک میں دھوم
ہے شعلہ عشق ہندی کا شرر ریز کہ ہے گا آفتاب اس کا بہت تیز
کہ سوز عشق ہندی تیز تر ہے عرب کے عشق سے خوریز تر ہے (۱۸۶)

مشغولی کے آغاز میں عبرت نے صراحت کر دی ہے کہ اس نے اپنی
مشغولی کا قصہ عاقل خان رازی کی پہلویت سے لیا ہے:

رقم جو ہے یہ مضمون شعلہ بنیاد مری روشن طبیعت کا ہے ایچاد
مگر مضمون عاقل خان رازی کہ اس نے داستان یہ غارسی کی (۱۸۷)

عبرت نے قصبے کے عنوانات اشعار میں لکھے ہیں، یہ اشعار باہم مربوط
ہیں۔ اگر انھیں ایک جگہ جوڑا جائے تو یہ مل کر قصیدہ بن جاتے ہیں۔ یہ قصیدہ
ایک طرح سے خلاصہ ہے جس میں قصبے کا عطر پیش کر دیا گیا ہے۔

۱۸۵ مشغولی شمع و ہوا (ملکی) اخیرہ سر شاہ سلیمان، علی گڑھ

۱۸۶ ایضاً

۱۸۷ ایضاً

مہرت کا انداز بیان سادہ اور دل نکلیں ہے۔ اشعار رواں دواں اور
مترنم ہیں۔ قصہ کی دلچسپی ہر قدم پر قائم رہتی ہے۔ مہرت نے قصے کو راجا
رتن سین کے جوگی بن کر مشکل دیپ جانے اور توتے کی زبانی پداوت کو پیغام
بجھوانے تک نظم کیا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اس حصے سے نمونے کے طور پر
چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رتن سین ایک راجا میں نے پایا	تری خاطر ہوں جوگی کر کے لایا
وہ شہزادہ ہے اب تیرا بھکاری	ترے بن زندگی ہے اس کو بھاری
وہ اپنی سی نہایت کرچکا ہے	تو کر آگے جو کچھ تیری رضا ہے
وہاں نکس کی تاتھ جان جاوے	یہاں تاتھ تو جیادری کہاوے
جو توتے سے سنی مہرت کی گفتار	ہوئی وہ ہارنیں اک نقش دیوار
جوانی کا جو عالم تھا پدم کا	سرایت کر گیا قصہ یہ نظم کا
لیا دل کا وہیں تمام اس نے مینا	کہ راز عشق بہ جاوے نہ لفظا
کہا توتے تری خاطر ہے منظور	مرے اس راز کو رکھو تو مستور
منم کے پوجے کے دن ہیں نزدیک	کروں گی جا کے روشن جان تاریک
جو یوں جاؤں کچھ اے نیک فرجام	کہہ دمہتر میں ہو باؤں گی پدا نام (۱۸۸)

اس کے آگے کا قصہ غلام علی عشرت نے نظم کیا ہے اور چونکہ اس
خوبی سے لکھا ہے کہ معلوم نہیں ہوتا۔ پہلے حصے کا زور قلم اور لطف بیان
دوسرے حصے میں بھی قائم رکھا گیا ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ
مصنفوں کی وجہ سے مثنوی کی روانی، دلچسپی اور صفائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔
خاتمے کے اشعار یہ ہیں:

غرض یہ فتح پاکر حسب دل خواہ	علاء الدین نے لی چٹوڑ کی راہ
نواح شہر میں داخل ہوا جب	شنا یک ہارگی وہ ماجرا سب

کہوں کیا میں کہ شہ یہ ماجرا شن زبں تصویر آسا رہ گیا سن
غرض خاک پدم سر پر اڑا کے بعد افسوس و غم آنسو بہا کے
کیے اپنے پہ بس سر در گریباں چلا دہلی کی جانب زار و گریباں
سُنی تم نے عزیزو یہ کہانی کہ ہے اللہ باقی کلّہ فانی (۱۸۹)

مثنوی پداوت، قاسم

محمد قاسم علی بریلوی کی پداوت منظوم ۱۸۶۹ء میں تصنیف ہوئی اور
۱۸۷۳ء میں مطبع نولکلشور لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

محمد قاسم علی کا سلسلہ نسب یہ ہے: محمد قاسم علی ابن مولوی محمد قائم
علی بن شیر علی بن مہر علی بن مولوی علی صادق (۱۹۰) یہ ہدایوں کے باشندے
تھے لیکن مثنوی کی تصنیف کے وقت بریلی کے محلہ گڑھیہ میں مقیم تھے۔ (۱۹۱)

محمد قاسم علی عبرت اور عشرت کی مثنوی پداوت سے باخبر تھے۔ چونکہ
دونوں نے قصہ اصل اودھی زبان کے بجائے ماقول خاں رازی کی فارسی مثنوی
سے اخذ کیا تھا۔ محمد قاسم علی ان کے بارے میں صحیح کہتے ہیں کہ یہ دونوں بھاکا
کے مزاج داں نہیں تھے اور انھوں نے جانشی کی مثنوی کو تمام و کمال اُردو کا
قالب نہیں پہنایا:

نذوق بھاکا لیکن تھا نہ پلا یہ شاہد گود میں ان کی نہ آیا
ولے تاہم لکھا ہے کر کرامت کہ قصہ لے لیا اکثر سلامت

عبرت و عشرت کی مثنوی ترجمہ در ترجمہ ہے۔ اس کے برعکس قاسم
نے برہو راست جانشی سے ترجمہ کیا ہے اور اپنی مثنوی میں یہ التزام رکھا ہے کہ

۱۸۹ ایضاً

۱۹۰ مثنوی پداوت، قاسم علی بریلوی، مطبوعہ نولکلشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۷۳ء

۱۹۱ ایضاً

جانشی کی پداوت کا ترجمہ ”ہیت بہ ہیت اور دہرہ بدہرہ دہی اردو زبان کیا جائے۔“^(۱۲) اس میں شک نہیں کہ محمد قاسم علی نے شعر کے مقابلے میں شعر اور بند کے مقابلے میں بند لکھا ہے اور معنی کے اعتبار سے یہ اردو مثنوی جانشی کی اودھی مثنوی کا لفظی ترجمہ ہے۔ لیکن ترجمے کی پابندی اور قیود کے باعث مثنوی میں اصل اور نقل کا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ قاسم کی مثنوی میں تسلسل تو ہے لیکن جوش، روانی اور بے ساختگی نہیں۔ ہر جگہ آدرد کا رنگ غالب ہے۔ کہیں کہیں اردو مترادفات یا صحیح قافیہ ہاتھ نہ آنے کی وجہ سے اودھی الفاظ پر قرار رکھے ہیں جن سے نظم میں غرابت اور اشکال پیدا ہو گئے ہیں۔ محمد قاسم علی نے ہر منظر اور ہر واقعہ میں جانشی کی بیرونی کی ہے۔ چنانچہ مثنوی بے حد طویل ہو گئی ہے۔ پداوت سے متعلق اردو کی پانچوں مثنویوں میں یہ طویل ترین ہے۔ جانشی کی سی قادر الکلامی، زور، تفصیل، لفظ، بیان اور جدت ادا محمد قاسم علی کے پاس کہاں۔ ترجمہ بے رنگ اور پیکنا سینما ہو کے رہ گیا ہے۔ طوالت و غرابت ہی کی وجہ سے یہ مثنوی قبولیت کے درجے کو نہ پہنچی اور اس کے دوبارہ چھپنے کی نوبت نہ آئی۔

اس مثنوی کے ہر بند کے آخر میں ٹیپ کے طور پر بھاشا کا ایک دوہا ہے جو قاسم ہی کی تصنیف ہے۔ اس سے قصے کی مختلف کڑیوں میں باہد مگر ربط قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔

مثنوی قاسم کی خوبی یہ ہے کہ جانشی کے زور طبیعت نے مضامین و مناظر میں تفصیل و جزئیات کے جو دفتر پیش کیے ہیں، ان کی بھٹک یہاں دیکھی جاسکتی ہے۔ ناگتی کی وفا شعوری، پد مٹی کا بے مثال حسن و جمال، راجا کا جوگی بن کے لدا لدا پھرنا، سہیل دیپ کے رسم و رواج، جنگلات کا سکوت، ہنسٹ کی رنجین، سرودی کی بے مہری، جیسے کی پکاریں، ہاتھیوں کی قطاریں، سوروں کا رقص، گھوڑوں کی پوجا، ہندی عورت کا برہ ورن، ساجن سے خیالی مکالمے وغیرہ

ترجمے میں بھی لطف دے جاتے ہیں۔ قاسم نے پدمی کے سرپا کا بھی عین ترجمہ کیا ہے۔ یہ پندرہ سطحوں کو محیط ہے۔ بارہ ماہ کو بھی پوری طرح نظم کیا ہے اور یہ آٹھ سطحوں میں بیان ہوا ہے۔ راجہ رتن سین کے فراق میں رانی ناکستی کی حالت ملاحظہ ہو:

کہکتی ہوں طرح کوئل کے رو رو نہیں آنسو ہیں کھلنی خوں ہو ہو
ہوا کالا مرا منہ آنکھ ہیں لال برہ کا گرم دھک ٹھنڈا کرو حال
مری ہر بلند میں جانو کہ ہے جی پکارے گوشہ گوشہ کر کے پی پی
اسی دھک برگ ڈھاکہ کا جٹے ہے سحر خورشید نہ خوں ہو چلے ہے
اسی لوہو سے کندرو لال ہووے شجر سوکھیں گہوں شق بال ہووے
جہاں دیکھوں وہ سب ہو سرخ زیہات رتن جس جا کہے جا کون اب بات (۱۹۳)

راجا کے بخیر و عافیت گھر واپس آنے پر رانی اپنے شوہر کی آرتی اتارتے ہوئے کہتی ہے:

یہ جو بن اور تن من ہو نچھاور قہدق جان، پیارے مری تم پر
تھماری دلہ میں آنکھیں بچھاؤں قدم رکھو میں اپنا سر جھکاؤں
مرا دل آپ ہی کا یہ مکاں ہے تھماری دلہ آنکھوں کے میاں ہے
بدن ہوں میں اور اس کی جان تم ہو میں کارندہ، میاں، پرشان تم ہو (۱۹۴)

مشنوی سوہنی مہینوال

سوہنی مہینوال کے قصے کا تعلق بھی پنجاب کی سرزمین سے ہے اور ہیر و رانچھا اور سستی بنوں کی طرح یہ بھی ایک مقبول عام قصہ ہے۔

سوہنی مہینوال کا قصہ یوں ہے: بخارا کا ایک سوداگر عزت بیگ تجارت

۱۹۳ ایضاً ص ۲۷۶

۱۹۴ ایضاً ص ۴۷۴

کی غرض سے شاہجہاں کے زمانے میں ہندوستان آیا اور دہلی سے واپسی پر پتوراشیا کی تلاش میں لاہور وارد ہوا۔ کسی نے اس سے کہا کہ پنجاب کے ایک شہر گجرات میں ٹھکانا ایک کھال ہے جو بے مثال کوزے جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کی لگاؤ کھال کی حسین بیٹی سوہنی سے چار ہوئیں، تہات و غیرہ کا نشہ تو وہیں ہرن ہوا اور سر میں عشق کا سودا سلیا۔ عزت بیک نے ”مینوال“ نام اختیار کیا اور چرواہے کی حیثیت سے گجرات ہی میں رہنے لگا۔ سوہنی سے شناسائی پیدا کی اور عشق کی بے پایاں دونوں طرف سے رنگ لانے لگیں۔ ٹھکانا کھال کو جب یہ احوال معلوم ہوا تو اس نے مینوال کو شہر سے نکلوا دیا۔ مینوال نے گدائی اختیار کی اور بھیس بدل کر چناب کے دوسرے کنارے پر ڈیرہ ڈال دیا۔ سوہنی سے ہر شب ملاقات ہوتی اور مینوال پھولی کے کہاب سے اس کی ضیافت کرتا۔ ایک روز اتفاق سے پھولی ہاتھ نہ آئی تو مینوال نے اپنی ران کا حصہ کاٹ کر کہاب تیار کیے۔ مینوال تیرنے کے اہل نہ رہا تو سوہنی رات کو گھڑے کے سہارے حیر کر آنے لگی۔ ایک رات جب وہ سولہ سنگار کر کے نکلی تو اس کی نند نے دیکھ لیا اور دوسری رات کچے گھڑے کی جگہ کچا گھڑا رکھ دیا۔ سوہنی کو اندھیرے میں اس کا پتا نہ چلا، اس رات طوفان بھی آیا اور سوہنی جب کچے گھڑے کے سہارے حیرنے لگی تو اس نے زیادہ دیر ساتھ نہ دیا۔ سوہنی مین منہرہار میں مینوال، مینوال پکارتی ہوئی ڈوب گئی۔ مینوال نے بھی اس آواز پر لپک کہا اور موجوں کی تھینڑے کھاتا ہوا غرق ہو گیا۔

قصہ سوہنی مینوال پر مبنی فارسی قصوں کی تفصیل یہ ہے :

- ۱۔ مشغوی سوہنی مینوال، اثر صالح، سنہ تصنیف ۱۸۳۹-۱۸۳۱ء
- ۲۔ مشغوی ار ڈنگ عشق، عطا محمد زیرک کلانوری، سال تصنیف ۱۲۷۶ھ
- ۳۔ مشغوی قندلقت، نجم الدین، مسکین ساکن کوروال، سنہ تصنیف

۱۲۸۳ھ (۱۹۵) (۱۹۶)

۱۹۵ اور نکل کالج میگزین، مئی ۱۹۳۱ء، ص ۶۳

۱۹۶ جالبانی قیسہ قدسی زبان میں، ص ۱۹۲-۲۲۹ اور ۲۵۹

اردو میں بھی اس قیسے پر مبنی ایک مثنوی دستیاب ہوئی ہے، جو برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔ یہ لاہور سے ۱۸۷۱ء میں ۸۰ صفحات پر شائع ہوئی۔ اس کے مصنف کا نام اردو ڈارائے بتایا گیا ہے^(۱۹۷) اردو ڈارائے کا قصہ سوہنی میسوال ۱۸۷۱ء ہی میں پنجابی زبان میں بھی لاہور سے شائع ہوا۔ اس کا یہ ایڈیشن کتب خانہ انڈیا آفس، لندن میں محفوظ ہے۔^(۱۹۸) اس کے علاوہ اس کتب خانے میں فضل شاہ (لاہور ۱۸۶۹ء) گنگا رام (لاہور ۱۸۶۸ء) گوپال سنگھ (امر قسر ۱۸۷۵ء) اور قادر یار (لاہور ۱۸۶۷ء) کے پنجابی ایڈیشن بھی ہیں۔^(۱۹۹) اردو نثر میں اس قیسے کو اہت رام پنجاب نے لکھا۔ یہ کتاب لاہور سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔^(۲۰۰)

مثنوی سیلی سجنوں

میر سعادت علی سعادت تخلص کی ایک مثنوی سیلی سجنوں کا ذکر میر حسن^(۲۰۱) اور علی ابراہیم خاں^(۲۰۲) نے کیا ہے۔ لیکن اس کا کوئی شعر پیش نہیں کیا۔ میر سعادت علی کا ذکر میر تقی میر، قائم، شفیق، گردیزی، مصطفیٰ، قدرت اللہ قاسم، شیفتہ اور نساخ کے تذکروں میں بھی ملتا ہے۔ لیکن کسی نے اس مثنوی سے متعلق صراحت نہیں کی۔ صاحب گلزار ابراہیم نے فقط اتنا لکھا ہے کہ سیلی سجنوں نام کے دو عاشق و معشوق نواب قمر الدین خاں وزیر کے زمانے میں (۱۷۳۱ء-۱۷۳۹ء) دہلی میں گزرے ہیں۔ انھیں کے افسانہ عشق کو سعادت نے

۱۹۷ بلوم ہارٹ، برٹش کتب، ص ۲۷

۱۹۸ انڈیا پنجابی، ص ۳۵

۱۹۹ ایضاً نیز، پنجابی کتب برٹش کالم ۱۳ اور ۲۳

۲۰۰ فہرست کتب خانہ، ص ۳۳

۲۰۱ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۷۹

۲۰۲ تذکرہ گلزار ابراہیم، ص ۱۶۱

مثنوی کی شکل میں لکھا ہے۔ (۲۰۳) سعادت کا کوئی مجموعہ کلام دستیاب نہیں ہوتا اور غالباً گردشِ روزگار نے اس مثنوی کو بھی خاکِ لیم کی نذر کر دیا۔ یہ اگر موجود ہوتی تو اس کا شمار شمالی ہندوستان کی قدیم ترین مثنویوں میں کیا جاتا۔

میر سعادت علی امر وہے کے باشندے تھے۔ شاہی دربار سے متوسل ہو کر دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ میر تقی میر نے ذکرِ میر میں انھیں سے متعلق لکھا ہے: ”و آں عزیز مرا تکلیف موزوں کردن ریخت کرد“۔ تذکرہ نکات اشعرا میں ہے: ”ہابندہ رہا بسیار داشت“ (۲۰۴) ۱۱۵۲ھ اور ۱۱۶۵ھ کے مابین کسی سال میں انتقال کیا۔ (۲۰۵)

مثنویات قصہ شاہ لدہا

مثنوی قصہ شاہ لدہا از قائم چاند پوری

نکلیات سودا، مطبوعہ نول کشور ۱۹۳۲ء، جلد دوم میں ایک طویل مشقیہ مثنوی بغیر کسی عنوان کے ص ۸۵ سے ۱۰۰ تک درج ملتی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:

الہی شعلہ دن کر آتش دل

تپ دل دے بقدر خواہش دل

مثنوی کے خاتمے پر سودا کا تخلص یوں آیا ہے:

۲۰۳ ایضاً

۲۰۴ تذکرہ نکات اشعرا ص ۴۷

۲۰۵ عزیز محاسن کے لیے ملاحظہ ہوں۔ نوزن نکات، ص ۸۸، ریخت گویاں، ص ۱۹۳، گلشن ہند،

ص ۱۶۱، چمنستانِ شعرا ص ۳۹۸، شعراے اردو ص ۱۸۰، مجموعہ شعرِ جلد اول ص ۲۹۸،

ہندی ص ۱۱۶، گلشن ہے خد ص ۹۸، طلیٰ شعرا ۲۱۶، نکات جلد چہارم ص ۱۹۵، میر

کی آپ بیتی، پادرتی ص ۹

پس اسے سودا غموشی پیش کر تو
غنم کے طول سے اندیشہ کر تو (۲۰۶)

لیکن دراصل یہ مثنوی سودا کی نہیں بلکہ قائم چاند پوری کی تصنیف ہے۔ بعض وجوہ سے قائم کا بہت سا کلام سودا کے کلیات میں شامل ہو گیا ہے۔ اس میں سے کچھ کی نشان دہی شیخ چاند نے کی تھی۔ (۲۰۷) مذکورہ بالا مثنوی بھی الحاقی تھی۔ اس کی طرف مولوی عبدالحق نے مقدمہ تذکرہ مخزن نکات میں (۲۰۸) اور عبدالبہاری آسی نے اپنے ایک مضمون (۲۰۹) میں اشارہ کیا تھا لیکن انہوں نے اس سلسلے میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ حالانکہ شاہ محمد کمال کے تذکرہ مجمع الاحباب (سال تصنیف ۱۲۱۹ھ) میں یہ مثنوی قائم چاند پوری ہی کے نام سے درج ملتی ہے۔ (۲۱۰) اس مثنوی کا صحیح نام قدرت اللہ شوق نے تذکرہ طبقات الشعراء میں لکھ دیا ہے۔ قائم کے ترجمے میں لکھتے ہیں: "مثنوی شاہ لدہا کہ فقیرے کھکے دار عاشق مزاج بمخزن منش در لواحق پنجاب بود، بسیار بادہائے رنگین بستہ از اول تا آخر ہر اشعار انتظامی است"۔ (۲۱۱)

اس مثنوی میں جیسا کہ اوپر کہا گیا، پنجاب کے ایک درویش شاہ لدہا کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے یہ کہانی قلم بند نہیں ہوئی تھی۔ قائم نے اسے کسی راوی سے سنا اور اسی طرح قلم کر دیا۔ خود کہتے ہیں:

- | | |
|-----|--|
| ۲۰۶ | کلیات سودا جلد ۲۰ ص ۱۰۰ |
| ۲۰۷ | سودا، ص ۱۱۰ |
| ۲۰۸ | مخزن نکات، ص ۹ |
| ۲۰۹ | مطبوعہ رسالہ اردو جنوری ۱۹۳۹ء، ص ۶۵ |
| ۲۱۰ | مجمع الاحباب تھی سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد |
| ۲۱۱ | نور قلمی کتب خانہ آملیہ، حیدرآباد دکن ۸۶ ب، نور ملاحظہ ہو "قائم کی ایک مثنوی مثنوی"، نور احمد فاروقی، رسالہ سب رس، فروری ۱۹۶۰ء |

شب اک ماتم سراے خانہ عشق میاں کرتا تھا یوں النساء عشق
چنانچہ لوح^(۲۱۲) خوان بزم ماتم کرے ہے اس طرح سے نالش غم
مشغولی عشق کی تعریف سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد حمد باری
تعالیٰ، نصیب حضرت سید المرسلین، اور مناجات ہے جو ۲۵ اشعار پر مشتمل ہے۔
کہانی کا آغاز پنجاب کے ایک درویش کے ذکر سے ہوتا ہے:

کہ تھا پنجاب میں اک مرد درویش گرفتار بلائے صاحبِ خویش
ہمیشہ دسبِ دل سے پائے گواہاں سدا آشفہ سر جوں زلفِ خواہاں
مقام اس کا تھا اک جاگہ سراوہ بوضع نکلیے ہے جس سے تو آکر
یہ نکلیے ایسی پر فضا اور دل کشا جگہ پر واقع تھا کہ مسافر آتے جاتے
ہوئے یہاں سستانے کے لیے رک جاتے تھے۔ ایک بار ایک بارات لودھر سے
گزری اور تھوڑی دیر کے لیے سب وہاں آکر پڑے۔ دلہن کا ڈولا ایک طرف
اجرا گیا۔ گرمی غضب کی پڑ رہی تھی۔ دلہن ہوا کھانے کے لیے پردے سے باہر
نکلی۔ اتفاقاً درویش کی نگاہیں اس بازمین سے چار ہوئیں اور عشق کا تیر دونوں
کے دل سے پار ہو گیا:

دو چار اس سے ہوا یہ مرد درویش گیا بے چارہ اک جھپکی میں از خویش
نہ جانے تھی نگہ یا تیر یا ہار کہ بے تحریک وہ دل سے ہوئی پار
نگاہوں میں رہا صد بحث و تکرار نہ تھا ہر چند وہاں امکانِ گفتار
غرض ایہ مر تو جلتی تھی یہ دلریش لودھر لوٹے تھا آتش پر وہ درویش
نہ اس کو کچھ سخن کہنے کا پیدا نہ اس کو بخیرِ خموشی اور چارہ
یوں ہی باہم تھے یہ محوِ بلا کہ ناگہ وہاں نے وہ ڈولا اٹھایا
ہوئی وہ قوم جب نکلیے سے راہی اجلات لون نے اس محروں سے چاہی

دو دل بیٹھے بٹھائے بااے عشق میں گرفتار ہو گئے۔ بہار کی صورت ہی کیا تھی! بہار تھی جیسے آئی تھی ویسے ہی چلی گئی اور اس کے ساتھ دلہن کا ڈولا بھی۔ درویش ایک درخت پر چڑھ کر اسے تھٹکی لگائے دیکھتا رہا:

نظر آنے سے مطلق رہ گیا جب ہوا وہ روز اس پر حیرہ جوں شب
گرا اوپر سے نیچے واں یہ بھروح مٹی ونبال ڈولی کے چلی روح
غرض درویش تو اس طرح عشق کے پہلے ہی وار میں ختم ہو گیا اور لاوہر دلہن
آتش عشق میں اندر ہی اندر سٹپتی رہی۔ سسرال میں اس کی بڑی خاطر بہارات
کی گئی۔ طرح طرح کے بازائے گئے لیکن اس کی وحشت اور بے قراری میں
فرق نہ آیا۔ جب معاملہ علاج معالجے کے بس کا نہ رہا تو سسرال والوں نے دلہن
کے والدین کو خط لکھ کر بلایا کہ وہ آکر اسے لے جائیں۔ شاید گھر کے مانوس
ماحول میں اس کا جی بہل جائے۔ دلہن کے ماں باپ آئے اور اسے اپنے ساتھ
لیے واپس گھر کو روانہ ہوئے۔ راہ میں یہ قافلہ پھر اسی درویش کے نیچے پر
ستانے کے لیے ٹکا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا:

کہ جب وہ ہاڑ میں بکھیر میں آئی جبکہ درویش کی اک ڈھیر پائی
وہ پیش غم جو تھا خاطر میں مرکوز ہوا جوں پیش عقرب ہار آموز
شرار غم نے کی آخر شرارت بدن میں یک یک ایک حرارت
لگا کر ماہ سے اور تا بہاوی نظر میں چھا مٹی یکسر سیاہی
گری بے طاقتی سے واں پہ غم ناک طرح پانی کے لرزی ہر طرف خاک
اسی صورت سے یہ غلطیاں تھی کچھ دور کہ جذب عشق نے کھڑے کی وہ گور
نہ جانے پھر کہ واں کا حال کیا تھا بھی وہ گور تھی یا اڑوہا تھا
اسے اس گور نے اس طرح کھایا نہ مای بیچ ہوں بونس سہایا
ہوئی جوں آب پنہاں یہ نہ خاک رہے باہر وہ سارے مٹل خاشاک

اس کے بعد قائم نے دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا نقشہ کھینچا ہے اور اسی بیان پر مشغول ختم کر دی ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے مشغول کا قصہ نہایت سادہ اور مختصر ہے۔ اس کی حزن یہ ہے اور درد انگیزی اسے میر تقی میر کی مشغولوں کے قریب لے جاتی ہے۔ لیکن قائم کو جذبات نگاری پر وہ قدرت حاصل نہیں جو میر کا حصہ ہے۔ درویش کا کردار بھی پوری طرح ابھھر کر سامنے نہیں آتا۔ گو مشغول مقامی رنگ لیے ہوئے ہے، لیکن قائم نے ماحول کی موقع کشی اور جزئیات نگاری سے دلکشی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ قصے کے اعتبار سے قائم کی یہ مشغول سودا کی کوششوں پر بھاری ہے۔ سودا کی اکثر مشغولیاں بیانیہ ہیں اور ان میں قصے کا عنصر برائے نام ہے۔ قائم اپنے اسلوب بیان میں سودا سے متاثر تھے، لیکن مرصع زبان اور زور دار ترکیبوں کے استعمال میں وہ اعتدال سے کام لیتے تھے۔ ان کا لب و لہجہ دلنشین اور پُر تاثیر ہے۔ انھیں خوبیوں کی بنا پر ادبی اعتبار سے قائم کی یہ مشغول شمالی ہندوستان کی قدیم مشغولوں میں اونچا مقام رکھتی ہے۔

مشغول اعجاز عشق از راسخ عظیم آبادی

قائم چاند پوری کی مشغول شاہ لدھما میں جو قصہ ملتا ہے اور جس کا ذکر ابھی اوپر کیا گیا ہے، اسی قصے پر مبنی ایک مشغول کلیات راسخ میں بھی ملتی ہے۔ جس کا نام ”اعجاز عشق“ ہے^(۲۱۳) مظلوم ہوتا ہے یہ واقعہ یا قصہ اس زمانے میں خاصا مقبول و معروف تھا۔ قائم چاند پوری (وفات ۱۲۱۰ھ) اور راسخ عظیم آبادی (وفات ۱۲۳۸ھ) کی عمروں میں جو تفاوت ہے، اس کے پیش نظر یہ قیاس غلط نہ ہو گا کہ راسخ نے اپنی مشغول قائم کی مشغول کے بعد لکھی اور ممکن ہے کہ قائم کی مشغول راسخ کی نظر سے گزری ہو اور اسے دیکھ کر ہی انھیں یہ قصہ نظم کرنے کی ترغیب ہوئی ہو۔

راخ کی شہو میں اشعار کی تعداد قائم کی شہو سے تقریباً ڈگنی ہے۔
راخ نے حمد، نعت، مناجات عاشقانہ وغیرہ پر دس صفحات صرف کیے ہیں۔ اصل
حکایت اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

ہند کے بیچ نوجواں تھا ایک نہ جواں آفت جہاں تھا ایک
نوجوان کی شادی، برات کی رخصتی اور درویش کے بچے میں رکنا، یہ سب
واقعات اسی طرح بیان ہوئے ہیں جس طرح قائم کے ہاں ملتے ہیں۔ درویش اور
عروس کی نگاہیں چار ہونے کے موقع پر راخ نے بڑے گرم اور پُر سوز اشعار
نکالے ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں:

ناگہاں نو عروس زیا نے	مقصود جان ناگہیا نے
کھ اٹھیا جو مہد کا پردا	بہر تفریح طبع و کسب ہوا
برق سا چکا گوشہ سحر	آگہ اس سے ہوا وہ خستہ جگر
ہوش کا اس کے انقطاع کیا	ان نے اپنے تئیں دوار کیا
سوئے درویش وہ ستم گارہ	ہوئی اک ڈھب سے گرم نگارہ
کی نگہ طرفہ آستانہ	آپ سے ہو گیا یہ بے گانہ
عادت اس کی نگہ نے دل کو کیا	دیکھا اس ڈھب کہ جی نکال لیا

اس کے بعد چند اشعار میں سرپا کا بیان ہے:

اللہ اللہ وہ صافی سینہ	خاک سا جس کے آگے آئینہ
کیا فرہندہ حسن زانو و ساق	ان سے اٹھنا نکاو شوق پہ شاق
بیادے بیادے نگہیں اس کے پا	نرم ایسے کہ پھول ہیں گویا
کف پائے حنائی کیا محبوب	جلتی آنکھوں کو ان سے ملے خوب
آگے کیا وصف ہو سرپا کا	زہے حسن اس عروس زیا کا

راخ نے عاشق و معشوق کے اضطراب اور پریشانی کو بھی بڑے موثر اور دلکش

کیرا بے میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو :

بڑھ گیا کار شوق آخر کار نہ اٹھا بار شوق آخر کار
متصل مضطرب خطاں دل ہم ننگراں ہمدرد مقابل ہم
تھے فحش لیک کہتے تھے کیا کیا بے زبانی زبان تھی گویا
شوق ٹپکا پڑے نگاہوں سے حسرت اک نگے ان کی آہوں سے
عرصہ فرصت کا بے نہایت تنگ آرزو کی فراخیاں اس رنگ
ہم سخن ہونے کی کہاں جا تھی جز زبان تنگ کہ گویا تھی
دو گھڑی تھی یہ درمیاں صحبت اتنی ہی آسماں نے دی فرصت

آخر کہاؤں نے ڈولا اٹھایا، برات روانہ ہو گئی، اور :

دم رخصت کیو آہ کر نہ سکی
وانہیں اک نگاہ کر نہ سکی

جذبات نگاری میں تو راسخ، قائم سے آگے ہیں ہی، مرقع کشی میں بھی
ان کی مہارت اپنا لوہا منوالیتی ہے۔ مہد عروسی کے چلے جانے کے بعد درویش
کی حالت زار دیکھیے :

بڑھ گیا جب بہت فکر سے ڈور ہو گئی طاقت تنگ معذور
اک درخت کشیدہ سر پہ چڑھا مہد داں بھی نظر کے آگے بڑھا
ہو گیا آگے میں جہاں تاریک لے زمین سے یہ آسماں تاریک
لم فرقت میں ہائے خوب گھرا ہو کے بے جاں درخت سے دو گرا
مہد کے ساتھ جی روانہ کیا جسم پر بے وقار تھا نہ گیا

سچ میں موقع و محل کی مناسبت سے راسخ نے عشق کی جہاں کاریوں پر
چند اخلاقی اشعار بھی لکھ دیے ہیں۔ یہ واقعات کی رفتار میں حرام ہوتے ہیں
لیکن مثنوی کی درویش کا اثر ان سے ضرور گہرا ہو جاتا ہے۔ قہر کے انجام

میں راسخ نے خلیفہ سی تبدیلی کی ہے۔ عروس کے واپس جاتے ہوئے راسخ میں
 زکریٰ ہے تو اسے دایہ کے ذریعے باغبان سے معلوم ہوتا ہے کہ درویش کا انتقال
 ہو گیا ہے۔ یہ سمجھنے ہی عروس کی نگاہوں میں جہان تیرہ دتار ہو جاتا ہے، لیکن وہ
 سنبھل کر دایہ کو پھول توڑنے کے بہانے دور بھیجتی ہے اور خود درویش کی قبر
 پر آتی ہے۔ اپنے چہرے پر خاک ملتی ہے اور قبر سے نکلے لگ کر آہ و فریاد کرتی
 ہے۔ اس کے بعد قبر کا شق ہوتا اور عروس کے اس میں سما جانے کا واقعہ دہی ہے
 جو قائم نے بیان کیا ہے۔ قائم کے ہاں اس کے بعد قصہ شتم ہو جاتا ہے اور
 عروس کے عزیز و اقارب رو دھو کر اپنے گھر کی راہ لیتے ہیں۔ لیکن راسخ کی
 روایت کے مطابق عروس کے اس طرح غائب ہو جانے کے بعد کھرام بچ گیا اور
 اس کی تلاش شروع ہوئی۔ عروس کے آنچل کا پلو قبر سے باہر پھڑ پھڑا رہا تھا۔
 اس نے غمزدی کی اور بعض بے یہ لوگوں نے شہید اُلفت کی قبر کھود ڈالی۔ وہاں
 یہ منظر دکھائی دیا:

دونوں چہیدہ یک دگر پائے	کیا معیت سے دے نظر آئے
نہیں درویش تھی وہ حور اس طرح	معنی اجزائے لفظ میں جس طرح
سب نے چاہا کہ ہو انھوں میں فصل	پر ہو کیا فصل یوں ہو جن کا وصل
عشق پُرکار کے ہنر دیکھو	وصل و پیوند ہو کر دیکھو
کلا تھا کو بہن اسی سے ہوا	عل بھی ہو دمن اسی سے ہوا
دیکھو یہ اتصال روحانی	دور بچنی سکھوں کی حیرانی
کی درست اس شہید عشق کی گور	کئے روتے سب اپنے گھر کی اور

راسخ عظیم آبادی نے حسن و عشق سے متعلق نو مثنویاں لکھی ہیں۔ (۱۱۳)
 لیکن ان میں قصہ پن، منظر کشی اور جذبات نگاری کے اعتبار سے یہ مثنوی سب
 سے فائق ہے۔ واقعیت کی سادہ حقیقت نگاری کو اس زمانے کے قیسے کہانوں میں

زیادہ دخل نہ تھا بلکہ اس باغی الفطرت عنصر کو اہمیت دی جاتی تھی جو ماورائی قوتوں کی بدترکی کا احساس پیدا کر کے انسان کو حیرت اور استعجاب میں گم کر دے۔ عشق کی کرامتوں کو بھی اسی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ راسخ نے بھی کرامت ہی کی مدد سے عشق کی افضلیت ثابت کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ماحول کی کامیاب اور نچی مرقع کشی کر کے مشنوی میں واقعیت کی تہ کو گہرا کر دیا ہے۔ انھوں نے درویش اور عروس کے کردار کو بھی فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ راسخ کی مشنویوں کا عام نقص تنہید کی بے جا طوالت ہے لیکن یہ مشنوی اس سے پاک ہے۔ اشعار درد انگیز اور پُر تاثیر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ راسخ نے اس پر پورا زور سخن صرف کیا اور ایک ایک شعر جی ٹھونک کر لکھا ہے۔

مشنوی چھو منتر

اس مشنوی کا ایک قلمی نسخہ ادارۃ لہجات اردو حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ مشنوی چھو منتر کے مصنف میر ذوالفقار علی خاں متخلص بہ صفاء میر تقی میر کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ سے بنگالہ گئے اور وہاں سے وکن آئے۔ یہاں میر عالم اور ان کے بعد مہاراجہ چند لال کے مصاحب رہے۔ ذاکٹر زور کا خیال ہے کہ زیرِ نظر مشنوی ۱۲۲۳ھ میں یا اس سے قبل لکھی گئی۔ کیونکہ اس میں میر عالم کی مدح لکھی ہے اور وہ ۱۲۲۳ھ میں فوت ہوئے۔ خود ذوالفقار علی خاں کا انتقال ۱۲۶۰ھ میں ہوا۔ (۲۱۵)

مشنوی میں میر تقی میر کی مدح کے چند اشعار یہ ہیں:

ہاں اگر کچھ حسرت استاد ہے	تو بجا ہے یہ محلّ یاد ہے
مشنوی یہ عشق کی تصویر ہے	قابلِ نذرِ جناب میر ہے
سو تو یہ باقی فقط افسوس ہے	لکھنؤ اب ہم سے لاکھوں کوس ہے

یہ مثنوی بھی کسی مقامی لوگ روایت پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں ہمارے کے ایک طالب علم کا دل غراش قصۂ نظم کیا گیا ہے، جو ایک تاجر زاوے پر عاشق ہو گیا تھا۔ روگ یہاں تک بڑھا کہ اس نے نکلتا پڑھنا چھوڑ دیا۔ بد قسمتی سے معشوق کا کسی بیماری سے انتقال ہو گیا اور عاشق نے بھی وہیں چتا کے قریب جان دے دی۔

ادارۃ ادبیات اردو، حیدر آباد کا نسخہ ۸۷۷۸ھ میں لکھا گیا۔ اس مثنوی کا ایک اور نسخہ مولوی سید محمد کے کتب خانے میں ہے، جو مصنف کے حین حیات ۱۲۳۹ھ میں لکھا گیا تھا۔ تعداد اور اوراق ۱۲۔ (۲۱۶)

مثنوی جذبہ عشق

مصنف کی مثنوی جذبہ عشق قاضی عبدالودود صاحب نے رسالہ اردو، اپریل ۱۰۳۹ء (۲۱۷) میں شائع کی تھی۔ یہ مثنوی کتب خانہ مشرقیہ بانگی پور میں محفوظ دیوان اول اور دیوان پنجم دونوں نسخوں میں پائی جاتی ہے۔ دیوان اول میں وہ تمام کلام شامل ہے جو مصنف نے دہلی میں کہا۔ اس لیے اغلب ہے کہ یہ مثنوی مصنف نے ۱۱۹۸ھ یا اس سے قبل دہلی ہی میں تصنیف کی ہو۔

مثنوی جذبہ عشق ۱۲۳۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ پہلے ۱۳۵ اشعار میں عشق کی تعریف و توصیف ہے۔ اس کے بعد مصنف نے دہلی کے ایک جوہری کی بچی داستان عشق بیان کی ہے:

خاک دہلی میں اک جوانِ حسین صاحبِ وضع صاحبِ جنکس
گرچہ تھا جوہری وہ پاک نژاد عشق تھا اس میں جوہرِ فولاد
عاشق زار اپنی زن پر تھا بلبل اس خانگی چمن پر تھا

یہ عورت حسن و جمال میں بے مثال تھی۔ مصحفی نے اس کا سراپا بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے اور اس کے بازو انداز کی بوجہ تصویر کھینچ کے رکھ دی ہے۔

رنگ کندن سا جو دمکتا تھا جس سے جو بن پڑا چمکتا تھا
دی تھی یہ باز کی نے اس کو بہار جس سے ہر عضو اس کا تھا گلزار
دیکھ کافر کی شوخی رفتار دنگ رہتے تھے مردم بازار
اس کی چٹکن کی وہ نگاہ تھی قہر جس کو کرتا سلام سدا شہر
تس پہ وہ برچھیاں نکاہیں تھیں جس سے مڑکاں تمام آہیں تھیں
تھی وہ اس خوبی و صفا کے ساتھ ہوتی ٹیلی نظر سے جس کی گات

جوہری اس بازک اندام کا بندہ ہے دام تھا اور :

گھر سے بازار تک اگر جاتا دو قدم چل کے پھر وہیں آتا
دل نہ لگتا تھا جب کہ اور کہیں قبلہ کرتا تھا اس منم کے تئیں
بحر الفت میں تھا جو یکسر غرق وصل اور بھر میں نہ پایا فرق
غرض :

دن بدن چاہ بڑھتی جاتی تھی مرگ دیکھ ان کو مسکراتی تھی
بیش و عشرت میں پا کے ان کے تئیں کیا دونوں پہ ہنسم بد نے کہیں
چنانچہ زدہ جوہری کو بخار آنے لگا اور چند ہی دن میں وہ پھول کی طرح کھلائی۔
رنگ زرد پڑ گیا اور چہرہ نیلا نظر آنے لگا۔ گھر کے لوگ اس کی یہ حالت دیکھ کر سخت گھبرائے۔ یہاں مصحفی نے ہندوستانی عورتوں کی بدحواسی اور توہمات پرستی کا جو سچا نقشہ کھینچا ہے، وہ ان کی مشاقی اور قادر الکلامی کا نٹن ثبوت ہے۔ چند اشعار درج کیے جاتے ہیں :

کوئی بولی پری کے سائے تلے آجی ہے کہیں یہ بال کھلے
 کوئی بولی کہ دوڑ ہی جاو مرچیں جا کر کہیں پڑھا لاؤ
 کوئی بولی کہ صدقہ دو فی الحال کوئی بولی دکھاو جا کر قال
 کوئی بولی کہ بید کو لاؤ اس کی تاڑی تو اس کو دکھاو
 الغرض تھی بہت یہ ہانک پکار نہ کھلے تھا کسی پہ یہ اسرار
 کہ یہ نازک بدن جو کھلائی یک بہ یک اس پہ کیا بلا آئی
 جوہری نے بھی دوا دریاں میں کوئی کسرا اٹھا نہ رکھی۔ لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی
 منظور تھا:

الغرض جو جنم تھے سب دو کیے ایک بیمار مرگ کیوں کہ جیسے
 بعد یک چند وہ زن بیمار اسی حالت میں مر گئی یک بار
 زوجہ جوہری کے انتقال کے موقع پر مصحفی نے پرتا شیر لور و ورد انگیز
 اشعار لکھے ہیں لور مرقع نگاری کا بھی حق ادا کر دیا ہے۔ ان اشعار میں حزن و
 حرام کی وحشت سامانی ملاحظہ ہو:

لور سے لور ہو گئی صورت بن گئی جیسے کاٹھ کی صورت
 سر پہ مستی نے اپنے ڈالی خاک برگ پاں نے کیا گریباں چاک
 تھے کرن پھول وہ جو مظلہ چراغ غم فرقت میں ہو گئے تھے دماغ
 آغہیں جھٹو کی بھر بھرائی تھیں دل پہ بانگوں نے بانگیں کھائی تھیں
 انگلیاں ہو گئی تھیں یوں عریاں جیسے شاخیں گلوں کی دقت خزاں
 دیکھ چپا کلی کو خوں روتی سر پکھتے تھے مانگ کے موتی
 کر کے پاؤں کی انگلیوں کو یاد بھجھوے کرتے تھے دم بدم فریاد

آخر رو پیٹ کے ار تھی اٹھانے کا وقت آیا۔ مصحفی نے یہاں ہندو سراج سے اپنی
 گہری واقفیت کا ثبوت دیا ہے اور بعض رسوم بڑی خوبی سے بیان کی ہیں:

اجنے میں ار تھی کا جو تھا سماں لے کھاوے سے تاجہ بیڑا پاں
 ہوا حاضر وہیں پہ یک باری کی اٹھانے کی اس کی تیاری
 تالہ فریاد دل خراشی تھی آنسوہیں سے گلاب پاشی تھی
 دم پہ دم رام رام ست کی صدا جاتی تھی تا پہ سکندہ فطرا
 قدم اس دھج سے ان کے پڑتے تھے گویا بخت اور اجل سے لڑتے تھے
 پہنچے جتنا سے جب کہ ہو کر پار بیچ مرگھٹ کے با دل افکار
 اس دم اس تازنیں کو نہلا کر غوطے پانی میں کتنے دلوں کر
 ڈھیر میں لکڑیوں کے رکھوایا آگ دی اور ان کو بھڑکایا
 شعلہ اک گرم آسماں کو گیا نہیں معلوم وہ کہاں کو گیا
 وہ رنجبِ قمر تو وہیں خاکستر ہو گئی، لیکن جوہری اندری اندر شعلہ سا جلنے لگا بارہ
 دن تعزیت داری میں گزر گئے اور:

تیر ہواں دن ہوا جو ہیں یک بار آئی پھر وہیں مرگ عاشق زار
 آکے اُس خواب گہ میں بادل زار تان چادر کو سو رہا یک بار
 کھنچ گئی روح جہبِ محبوب ہو گئے ایک طالب و مطلوب
 نہ جدائی کا کچھ رہا دھڑکا ہو گیا صبح وصل کا ڈکا
 اس میں سوتے ہوئے جو دیر ہوئی بولی ماں یوں اسے جگا دے کوئی
 اک نے جا کر کے جو ہیں منہ کھولا نہ بے لب نہ منہ سے کچھ بولا
 مردنی زرخ پہ آشکار ہوئی دوڑیو دوڑیو پکار ہوئی
 سن کے اس ماجرے کو آخر کار ہو گیا بند جوہری بازار
 آخر میں مصنفی اس واقعے کے سچ ہونے کی تصدیق کرتے ہوئے کہتے ہیں:

قصہ یہ شہر میں ہوا مشہور آیا سب کی زباں پہ یہ مذکور
 بات مجھ تک بھی یہ جو ہیں پہنچی حد کڑھا اس گھڑی تو میرا جی

ایک انہام عشق تھا جو بھی اس کی ہمت پہ آفریں میں کبھی عاشقی میں یہ تازہ تھا مضمون میں نے اس کے تئیں کیا موزوں کوئی عاشق جو اس کو دیکھے گا دیوے کا طبع مصحفی کو دُعا مصحفی کی یہ مثنوی واقعیت پسندانہ نقطہ نظر سے نکھی گئی ہے۔ اس کی بڑی خوبی اختصار ہے۔ اشعار سادہ و پرتاثر ہیں۔ اس میں قصہ پن برائے نام ہے۔ لیکن یہ کسی مرقع کشی سے کسی حد تک پوری کر دی گئی ہے۔ مصحفی کا انداز بیان سلیس و دل نشیں اور گھٹتہ ہے جس سے قصے کی درونگیزی کا دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔

مثنوی کرشن کنور

کرشن کنور ڈیرہ گورکھپوری "میواڑ کے خاندان کی ایک حسین شاہزادی کرشن کنور کی دردناک داستان۔ فشی امیر احمد بینائی نے اس کی اصلاح کی"۔ (۲۱۸)

مثنوی جذب عشق

از میر شاہ حسین، متخلص بہ حقیقت، باشندہ بریلی۔ اس قصے میں مصنف نے ۱۴۰۳ھ بمقام سری نزد بندا رہن کا ایک آنکھوں دیکھا واقعہ بیان کیا ہے۔ سنہ تصنیف ۱۴۱۱ھ لورائق ۱۷۱۔ (۲۱۹)

مثنوی بدھو گل فروش

سعادت یار غلام رنگین (وفات ۱۴۵۱ھ بمطابق ۱۸۳۵ء) کی یہ مثنوی ان کی تصنیف "استخوان رنگین" میں شامل ہے، جو مجموعہ نورتن کا نواں حصہ ہے۔

۲۱۸ صدیق، ص ۵۳

۲۱۹ پولیس، ص ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲،

امتحان رتھیں کا سال تصنیف ۱۲۳۲ھ ہے۔ اس کا مخطوط انڈیا آفس میں محفوظ ہے۔ یہ مصنف کا ذاتی نسخہ تھا جو بہت مقام یافتہ ۱۲۳۶ھ میں لکھا گیا۔ تعداد اوراق ۳۳ (۲۲۰)

”امتحان رتھیں“ میں سعادت یار خاں رتھیں نے ۲۷ مختلف اصناف سخن کا ذکر کیا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے ان تمام اصناف میں کلام کہا ہے۔ مشنوی کے ذیل میں انھوں نے اپنی سات مشنویاں گنوائی ہیں۔ ان میں سے ایک مشنوی بدھوکل فروش ہے جس کی صراحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

”مشنوی بدھوکل فروش و وزیرین سبزی فروش یعنی کھنڈن کہ ہر دو خود را در چاہ انداختہ مردم و این معاملہ در شاہ جہاں آباد پہ روے چشم خود گزشتہ۔“

رتھیں نے دیباچہ ”امتحان رتھیں“ میں لکھا ہے کہ اس نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس مشنوی میں پانچ سو شعر ہیں۔ آغاز اس طرح ہوتا ہے:

الٹی چاہ کی اس دل کو دے چاہ بتا دے چاہ کی سیدھی اسے رو
کہ تا پہ چاہ گر تجھ کو سرا ہے ترے بن اور کو مطلق نہ چاہے (۲۲۱)

مشنوی قطب مشتری

وجہی کی مشنوی قطب مشتری اردو ادبیات میں تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ سلطان محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸-۱۰۲۰ھ) کے زمانے میں ۱۰۱۸ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس میں تقریباً دو ہزار اشعار ہیں، جنہیں وجہی نے بارہ دن میں کہہ ڈالا۔ اس مشنوی کا ایک مخطوط انڈیا آفس لندن میں ہے۔ (۲۲۲)

۲۲۰ بوم ہارت، انڈیا نمبر ۸۶

۲۲۱ بوم ہارت، انڈیا نمبر ۸۶

۲۲۲ بوم ہارت، انڈیا نمبر ۱۲۲/۲ مولوی عبدالحق سے تیار ہوا ہے۔ غالباً وہی مخطوط کو نسخہ برٹش میوزیم کہتے ہیں (مقدمہ ص ۱۸) برٹش میوزیم میں قطب مشتری کا کوئی نسخہ نہیں۔

دوسرا مولوی عبدالحق کے پاس تھا۔ انھوں نے ان دونوں مخطوطات سے مقابلہ کر کے اس مثنوی کو ۱۹۳۹ء میں شائع کر دیا ہے۔ (۲۲۳)

وجہی کے حالات جنوز پردہٴ خفا میں ہیں۔ البتہ اس کی تصانیف سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا ایک ممتاز شاعر اور ادیب تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں اسے بڑی وقعت اور عزت حاصل تھی۔ مثنوی قطب مشتری کے علاوہ اس کا نثری قصہ ”سب رس“ (۱۰۳۵ھ) خاصا مشہور ہے۔

اس مثنوی میں محمد قلی قطب شاہ کے عشق کو داستانوں کے ڈھنگ پر فوق فطرت اور طلسماتی واقعات کے ساتھ ملا کر پیش کیا گیا ہے۔ قصے کا انداز روایتی ہے۔ سلطان ابراہیم قطب شاہ کے اولاد نہ تھی۔ مدت کے بعد جب بیٹا پیدا ہوا تو بڑی خوشیاں منائی گئیں اور تعلیم و تربیت کا اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام کیا گیا۔ بڑا ہونے پر شہزادے (محمد قلی) نے ایک رات خواب میں ایک جنس حسین کو دیکھا اور دل و جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔ ہزار بہلانے پر بھی شہزادے کا دھیان اس سے نہ ہٹا۔ آخر ایک جہاندیدہ مشیر کو جو مصور بھی تھا، ساتھ لے کر شہزادہ اس پری تمثال کی تلاش میں گھر سے نکلا۔ راہ میں بڑے بڑے آقا م و مصائب کا سامنا ہوا۔ شہزادے نے شجاعت اور دلیری سے ہر مشکل کو آسان کیا اور مدتوں کی دشت نوردی کے بعد اپنے محبوب کے وطن بنگال پہنچا۔ مصور نے دربار میں رسائی حاصل کی اور اسے محل کو آراستہ کرنے کا کام سونپا گیا۔ اس نے ایک جگہ محمد قلی کی شبیہ بھی بنادی، جسے دیکھتے ہی مشتری مست و بے خود ہو گئی۔ آخر محمد قلی اپنے خوابوں کی ملکہ کو اپنے ساتھ گوکنڈہ لے آیا جہاں بڑی دھوم دھام سے دونوں کی شادی کر دی گئی۔

مثنوی قطب مشتری دکنی نردو کی مشہور مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔ وجہی کا انداز بیان فطری ہے۔ اشعار رواں دواں، شیریں اور پرتاثر ہیں۔ زبان آج سے سلاٹھ تین سو برس پہلے کی ہے۔ اس لیے غیر مانوس معلوم

۲۲۳ مثنوی قطب مشتری۔ پتھج علیہ مولوی عبدالحق، دہلی ۱۹۳۹ء، تعداد صفحات ۲۰/۱۱۹/۲۲

ہوتی ہے ورنہ اپنے زمانے کے معیار کی رو سے وجہی کا کلام صاف اور سلیس ہے اور اس میں تصنع نام کو بھی نہیں۔ ملاحظہ ہو دل دے بیٹھنے پر مشتری کا کیا حال ہوتا ہے :

صورت شہ کی حل حل بچھانے لگی	کھڑے قد پہ بلہار جانے لگی
دیک اس نقش کوں ہر حیران تھی	سو سہ پہ گنوا سب پریشان تھی
نہ ان بہوتا تھا نہ پانی اسے	ہوئی تلخ سب زندگانی اسے
وہی نقش تن تھا وہی نقش من	وہی نقش پانی وہی نقش ان
قلب جیوں قلب خد پر تعمیر ہے	وہاں مشتری پھرتی چہ پھیر ہے (۲۲۴)

محمد قلی کے فراق میں مشتری کی زبان سے کیا برجستہ شعر کہلائے ہیں :

کہاں ہے وہ شہ زما نوجواں	کہاں ہے دوش گنوتا گن ندھاں
کہاں ہے وہ لالہ منگی چال کا	کہاں ہے وہ سا جن لیے ہال کا
کہاں وہ چتر چھٹلا من ہرن	کہاں وہ گھٹڑا چلا ہے جن
ہوئے جل کھل نمین دیدار باج	نیکیلی کدھاں لگ رہوں یار باج
رقن تھے سو رتن پہ انگارے ہوئے	کہ کچھ چاند انجھو سوتا رہے ہوئے (۲۲۵)

وجہی کو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ وہ عربی فارسی الفاظ کو بھی ہندی لب و لہجے میں ڈھال کر انھیں اپنے انداز بیان سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ محمد قلی، اپنی محبوبہ کو دکن چلنے کے لیے کہتا ہے اور اپنے وطن کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے :

دکن سا نہیں خدار سنار میں	بچ فاضلاں کا ہے اس خدار میں
دکن ہے گھینہ انگوٹھی ہے جگ	انگوٹھی کوں حرمت گھینہ ہے لگ

۲۲۴ شہوئی قلب مشتری، حوالہ سابق، ص ۷۷

۲۲۵ ایسا

دکن ملک نوں دھن جب سانج ہے کہ سب ملک سر ہو ر دکن تاج ہے
دکن کوں جو دیکھے گی اے تاریوں نہ کرسی کدھیں یاد بنگالے کوں
دکن ملک بھو جیج خاصا رہے تلنگانہ اس کا خلاصا اہے (۲۲۶)

تاریخی حیثیت

اس مثنوی کو چنچ کر خیال گزرتا ہے کہ اس میں عشق و محبت کے جو واقعات افسانوی رنگ میں پیش کیے گئے ہیں، وہ محمد قلی کی عاشق مرانی کے عین مطابق ہیں اور ان کا درپردہ تعلق محمد قلی اور بھاگ متی کے تاریخی عشق سے ہے۔ اس ضمن میں مولوی عبدالحق کہتے ہیں: "ممکن ہے ایسا ہو، لیکن کتاب سے اس کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔ مثنوی میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں بھاگ متی کے عشق سے ان کا کوئی تعلق نہیں پایا جاتا۔ وجہی کا مقصد اس مثنوی کے لکھنے سے بادشاہ کے حسن و جمال، شہنشاہت اور لیاقت کی تعریف کرنا ہے اور بس۔"

بھاگ متی کا ذکر ابوالفضل نے "اکبرنامہ" میں اور فیضی نے "مطیہ فیاضی" میں خود محمد قلی کی زندگی میں کیا۔ فیضی اکبر اعظم کا خاص مشیر کار تھا اور شہنشاہ کو دکن کے حالات سے مطلع کرنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ یہاں سے اس نے موقع بہ موقع رازدارانہ طور پر جو عرضداشتیں اکبر کو بھیجیں، ان کا مجموعہ "مطیہ فیاضی" کے نام سے اسی زمانے میں مرتب ہوا تھا۔ اس کا جو نسخہ حیدر آباد کے سنٹرل ریکارڈز آفس میں ہے اس کے صفحہ ۱۶ پر یہ عبارت ملتی ہے:

"محمد قطب الملک مذہب تشیع دارذ و معصومہ ساختہ و عمارت پرداختہ بھاگ مگر بنام بھاگ متی کہ فاحشہ کہنہ و قدیم دوست" (۲۲۷)

فیضی کے دس بارہ برس بعد فرشتہ نے اپنی تاریخ میں بھاگ متی کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

۲۲۶ مثنوی قطب مشرقی، حوالہ سابق، ص ۱۰۰

۲۲۷ بحوالہ فاخر ذور، بھاگ متی اور بھاگ مگر، مشمولہ تذکرہ محمد قلی قطب شاہ، حیدر آباد ۱۹۵۸ء، ص ۲۱۸

”آں قطب فلک اجلال در اواکل پادشاهی بر فاحشہ بھاگ متی عاشق
شدہ ہزار سوار ملازم اوگر دانیدہ، تا بطریق امرائے کبار بہ دربار آمدہ شدی نمودہ
باشد۔“ (۲۲۸)

محمد قلی کے کلام میں بھاگ متی سے اس کے گہرے تعلق خاطر کے
اشارے مل جاتے ہیں۔ جلوہ بارہ پیاریوں اور بعض دوسری نغموں میں بھاگ
متی کا صریحاً ذکر کیا گیا ہے۔ (۲۲۹)

ان شواہد کی موجودگی میں ڈاکٹر زور کا مندرجہ ذیل بیان مثنوی قطب
مشرقی اور بھاگ متی کے تعلق کی حتمی کو بخوبی سلجھا دیتا ہے:

”محمد قلی نے بھاگ متی کو خود ہی حیدر محل کا خطاب دیا تھا۔ یہ اشارہ
تھا اس کی اس خواہش کی طرف کہ اس کی محبوبہ کو اس کے اصلی نام سے کوئی یاد
نہ کرے اور صرف خطاب یاد رکھے۔ اسی مصلحت سے تو اس نے اپنے شہر کا نام
بھاگ نگر سے حیدر آباد بدل دیا تھا۔

(محمد قلی کا جائزہ) محمد قطب شاہ بہت بڑا زاہد اور متقی پادشاہ تھا جس
نے مکہ مسجد کا سنگ بنیاد رکھا اور جس کی تہجد کی نماز بھی کبھی قضا نہیں ہوئی
تھی۔ اس پادشاہ نے اور اس کے استاد حضرت میر محمد مومن نے مسلسل یہ
کوشش کی کہ حیات بخشی بیگم ملکہ سلطنت کی والدہ بھاگ متی حیدر محل کے
بارے میں لوگ تذکرہ نہ کیا کریں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی کہ فیضی اور
فرشتہ نے اسے قاحشہ لکھ دیا تھا۔

اس واقعے کی پردہ پوشی کرنے کے لیے قطب شاہی عہد میں اسنے جتن
کئے گئے کہ درباری شاعر ملا وجہی سے ایک مثنوی بطور خاص بھاگ متی کی وفات
۱۰۱۷ھ کے بعد لکھوائی گئی، جس میں اصل واقعے کو کچھ اس طرح بدل دیا گیا کہ

۲۲۸ تاریخ فرشتہ، ج دوم، ص ۱۷۳

۲۲۹ محمد قلی قطب شاہ، کتابت ص ۹۰، ۱۶۱، ۱۶۳، ۲۱۷، ۲۵۷، ۲۶۸، ۲۶۹ اور ۳۱۲

(لوگ) اس کے مطالعہ اور اس سے نتیجہ اخذ کرنے میں اب تک غلطیاں و چٹپٹاں ہیں۔“ (۲۳۰)

مثنویات چندر بدن و مہیار

یہ ایک دکنی مثنوی ہے جس کا مصنف مقبلی ہے۔ تجلہ دوسرے اشعار کے جن میں شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے، وہ یہ ہیں:

شرح سٹ مقبلی پرت پیار کا قصہ کہہ توں پورا سو مہیار کا
دنا تو فنا ہے مقبلی سبھی رہے گی بچن کی نشانی یہی

اس مثنوی کا سہ تصنیف معلوم نہیں اور زمانہ تصنیف کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ ڈاکٹر زور اسے ۱۰۳۵ھ اور ۱۰۳۸ھ کے درمیانی عرصے کی تصنیف بتاتے ہیں۔ (۲۳۱) نصیر الدین ہاشمی نے ۱۶ کا زمانہ تصنیف ۱۰۴۳ھ سے ۱۰۵۰ھ تک کا لکھا ہے۔ (۲۳۲) حکیم شمس اللہ قادری نے لکھا ہے کہ مقبلی نے اسے ۱۰۹۸ھ میں نظم کیا ہے اور تاریخ اس طرح بیان کی ہے:

صدی بارہویں میں تھے کم سال دو لکھیا نظم کوں میں نے باطرز نو (۲۳۳)

مثنوی کے مطبوعہ متن میں یہ شعر ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ مثنوی چونکہ اپنے زمانے میں بہت مقبول تھی، اس کے نقلی نسخے ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں بکثرت ملتے ہیں۔ ”مجلس اشاعت دکنی خطوطات“ نے اس مثنوی کو محمد اکبر الدین صدیقی کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۵۶ء میں

۲۳۰ نذر محمد علی قلعہ، ص ۲۱۹

۲۳۱ ادارہ ادبیات جلد اول، ص ۳۸، نیز اردو شہ پارے، ص ۳۹-۳۷

۲۳۲ یورپ میں دکنی خطوطات ص ۳۱۰، دکن میں اردو، طبع چالٹ میں ص ۱۲۶، ص ۱۰۵ نبرست

سالار جنگ میں صرف ۱۰۳۸ھ، ص ۵۸۸

۲۳۳ اردو سے قدیم، نول کشور ایڈیشن، ص ۹۴

حیدر آباد سے شائع کر دیا ہے۔ مقدمہ ۷۳ اور متقن ۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔
 مقبلی کی شخصیت کا تعین ہنوز نہیں ہو سکا۔ دکن میں مندرجہ ذیل چار
 شخصیتیں مثنوی کے زمانہ قرن قیاس میں ایسی ہو گزری ہیں، لفظ مقیم جن کے
 نام کا حصہ تھا:

۱۔ میرزا محمد مقیم استر آبادی جو محمد عادل شاہ کے دور کا فارسی شاعر تھا۔
 ۲۔ مقیم مشہدی، مر قاضی نظام شاہ کے عہد کا امیر جو ملا محمد رضا
 مشہدی کا لڑکا تھا۔

۳۔ میرزا محمد مقیم سلمی، دور محمد عادل شاہ کا فارسی شاعر۔

۴۔ ملا محمد مقیم جو عبداللہ قطب شاہ کے دور کا امیر تھا۔

ڈاکٹر دور میرزا محمد مقیم استر آبادی کو مثنوی چندر بدن کا مصنف قرار
 دیتے ہیں۔^(۲۳۳) ان کا بیان ہے کہ ”احوال بادشاہان بیجاپور“ میں اس کے فارسی
 اور اردو کلام کا تذکرہ موجود ہے۔ نصیرالدین ہاشمی بھی ان کے ہم خیال
 ہیں۔^(۲۳۵) محمد اکبر الدین صدیقی ان چاروں کو ایک ہی شخص سمجھتے ہیں اور ان کا
 بیان ہے کہ میرزا محمد مقیم استر آبادی نہیں بلکہ مشہدی تھا۔^(۲۳۶) وہ فارسی کے
 علاوہ دکنی زبان میں بھی شعر کہتا تھا اور مثنوی چندر بدن اسی کی تصنیف ہے۔
 ڈاکٹر نذیر احمد ان سے متفق نہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اوپر جو نام درج کیے گئے
 ہیں، ان میں سے نمبر اور نمبر ۳ کے ایک ہونے کے امکانات ہیں۔ اس کا بھی
 امکان ہے کہ ان میں سے کوئی دکنی اردو میں شعر کہتا ہو اور مقبلی متخلص کرتا
 ہو۔ میرزا محمد مقیم استر آبادی جس کا ذکر ”فتوحات عادل شاہی“ میں آیا ہے،
 ابراہیم عادل شاہ کے دور کا شاعر نہیں اور اسے مقبلی قرار دینے کے قرائن بہت
 ضعیف ہیں۔^(۲۳۷)

۲۳۳ ادارہ ادبیات ہند بول، ص ۷۷

۲۳۵ دکن میں اردو، طبع ثالث، ص ۱۲۶

۲۳۶ مثنوی چندر بدن و مہار۔ مطبوعہ ص ۱۴ (مقدمہ)

۲۳۷ اردو نوپ و مہار ۱۹۵۷ء، ص ۵۲-۶۳

گارساں دتاسی نے ”تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی“ میں مثنوی چندر بدن کے قلمی نسخوں کا ذکر کرتے ہوئے نسخہ توپ خانہ لکھنؤ کے مصنف کا پورا نام ”محمد مقیم خاں“ لکھا ہے۔^(۲۳۸) لیکن اشپرا نگر نے توپ خانہ کے جس نسخے کا ذکر کیا ہے، اس کے مصنف کا نام محض ”مقیمی“ بتایا ہے۔^(۲۳۹) بہر حال دتاسی واحد راوی ہے جس نے مثنوی چندر بدن کے مصنف کے پورے نام کی اطلاع دی ہے چونکہ مقیمی کی اصلیت کے بارے میں ابھی تک بحث چلی آرہی ہے، گارساں دتاسی کی یہ اطلاع اس سلسلے میں اہم ہے۔

قصہ

شہر سندرجن کی شہر لوی چندر بدن حسن و جمال میں سر آمد روزگار تھی۔ سالانہ میلے کے موقع پر مہیار نای ایک سلطان سوداگر اس پر عاشق ہو گیا اور آگے بڑھ کر معشوق سے اپنی بے قراری کا اظہار کر دیا۔ لیکن چندر بدن نے مطلق التفات نہ کیا۔ مہیار نے انجم نگر کے پاوشاہ کی وساطت سے چندر بدن کے والدین سے درخواست کی جسے انھوں نے رد کر دیا۔ دوسرے برس میلے کے موقع پر وہ پھر چندر بدن کے قدموں میں گرا اور بڑی عاجزی اور فروتنی سے محبت کا اظہار کرنے لگا۔ چندر بدن نے ورشت لہجے میں کہا: کجنت، تو ابھی زندہ ہے۔ یہ سنتے ہی اس عاشق نامرولنے وہیں جان وے دی۔ مہیار کا جنازہ جب محبوب کے دروازے کے سامنے سے گزرنے لگا تو آگے نہ بڑھ سکا۔ معشوق کو جب اس کا علم ہوا تو حسل کر کے اس نے کلہ پڑھا اور پاک و صاف چادر لوڑھ کر سو گئی۔ جنازہ قبرستان پہنچا اور دفن کرنے کے لیے جب تابوت پر سے چادر ہٹائی گئی تو دیکھا کہ عاشق و معشوق دونوں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ انھیں علاحدہ کرنے کی کوشش کی گئی مگر بے سود۔ آخر دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا۔

۲۳۸ تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی جلد دوم، ص ۳۹۱، بحوالہ بلوم پریٹ انڈیا ص ۵۳

۲۳۹ اشپرا نگر نمبر ۶۷۱

تاریخی حیثیت

اس قصے کی تاریخی حیثیت مشتبہ ہے۔ دکنی مورخوں میں صرف قاضی سید نور اللہ نے اپنی کتاب ”تاریخ عادل شاہیہ“ اور ان کے بعد شاہ جہلی علی جہلی نے اپنی تاریخ ”توزک آصفیہ“ میں اس قصے کی اصلیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ یہ واقعہ ابراہیم عادل شاہ (۹۸۸-۱۰۰۳ھ) کے دور کا ہے جو بمقام کدوری کوٹ پیش آیا۔ انھوں نے خود کدوری کوٹ میں یہ قبر دیکھی اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں چند بدن اور مہیار دفن ہیں۔ (۲۳۰)

نصیر الدین ہاشمی کا بیان ہے کہ ”علاقہ مدراس کے ایک قصبے میں ان دونوں کی قبر موجود ہے اور زیارت گاہ عام ہے۔“ (۲۳۱) اکبر الدین صدیقی کہتے ہیں کہ ”یہ مقام مدراس سے شمال مغرب میں ۸۰ میل دور آج بھی موجود ہے۔“ (۲۳۲) قصے کی اصلیت خواہ کچھ بھی ہو، اس کے خاتمے میں جو فوق الفطرت عنصر ملتا ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ پداوت اور دوسری نیم تاریخی لوک کہانیوں کی طرح اس میں بھی نسب داستان کے لیے بعد میں بہت کچھ بڑھا دیا گیا اور واقعہ کچھ کا کچھ ہو گیا۔ بعض اوقات چھوٹے بچے سے بہت بڑا درخت اسی طرح پیدا ہوتا ہے۔

تبصرہ

مغربی کے کلام میں وہ شکستگی، جزالت اور زور نہیں جو غوامی، نصرانی اور ابن نفاطی کے ہاں پایا جاتا ہے۔ وہ قصے کو سیدھے سادے طور پر بیان کرتا ہے اور کسی بات کو پیچیدہ بنا کر طول دینے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کا انداز

۲۳۰ بحوالہ مقدمہ شہزادی چند بدن و مہیار، ص ۳۳

۲۳۱ دکن میں اردو، طبع ثالث ص ۱۲۶

۲۳۲ مقدمہ شہزادی چند بدن و مہیار، ص ۳۵

بیان تصنع سے پاک اور فطری ہے۔ صاف، آسان اور سہل زبان میں وہ اوائے مطلب پر قادر ہے۔ مہیار چندر بدن کے عشق میں گرفتار ہونے کے بعد اس سے یوں خطاب کرتا ہے:

نزدک جا کے بولیا کہ سن اے پری مجھے تجھ لطافت دیوانہ کری
دیوانہ ہوں حیرا دیوانے کے تئیں آپس تے نہ کر دور جانے کے تئیں
سو تج بن مجھ کوئی ہوتا نہیں کہ بن جل بھیجی کا سوچینا نہیں
کہتا ہوں تجھے میں کہ اے گن بھری توں کرنا ایسا کچ مری دل بری
لکھدار اس کوں لوطی بول یوں کچ کچ ایس کوں اے بے ذول توں
کہاں میں چندرماں کہاں تو دیوا سنا کیا موسے توں دیوانہ ہوا (۲۳۲)

جب جنازے کو قبر میں اتارنے لگے تو عالم ہی دوسرا نظر آیا:

ہوا خیوں عمل سب قبر کا تمام الضیا دفن کرنے کوں شے نیک نام
جو دیکھیا جنازے میں مہیار کوں تو اس جھٹ مل کر سواں نار سوں
کفن سچ آکر او چندر بدن گلے لگ کے سوتی ہے جو ایک تن
جدا ان کو ہر چند کرنے منگے کہ دونوں کوں دو شمار دھرنے منگے
نہ کہتے ایس میں جدائی پذیر کہ تھے عاشقاں میں یو دو بے نظیر (۲۳۳)

چندر بدن اور مہیار کا قصہ بعض دوسرے شاعروں کا بھی پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ فارسی میں یہ تین بار لکھا گیا۔ سب سے پہلے اسے آتش نے غالباً متحقی کے بعد تصنیف کیا۔ مؤلف توذک آصفیہ نے آتش کی مشق کے چند اشعار نقل کیے ہیں۔ دوسری فارسی روایت ایک شاعر عشق کی ہے جس کا ذکر بعد کے ایک شاعر چندہ حسینی واقف عرف جہاں صاحب بیجاپوری نے اپنی اردو مشق ”چندر بدن و مہیار“ میں کیا ہے۔ فارسی کا تیسرا نسخہ حکیم مرزا قاسم

۲۳۳ مشق متحقی، حوالہ سابق

۲۳۴ اپنا

علی بیک اٹھکڑ کا ہے۔ اس کا ایک مخطوط کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ (۲۳۵)
مثنوی چندر بدن قاری کا چوتھا نسخہ میرزا یار بیک یار کا ہے۔ شفیق اورنگ آبادی
نے یار اورنگ آبادی (متولد ۱۱۳۶ھ) کے ترشے میں لکھا ہے: ”قصہ چندر بدن و
مہیار کہ بزبان دکن بود بخاری نظم نمود“۔ (۲۳۶)

پنجابی زبان میں قصہ چندر بدن کو امام بخش نے نظم کیا۔ یہ نسخہ اردو
رسم الخط میں لاہور سے ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا۔ (۲۳۷) اردو نثر میں اسے ریاض
الدین احمد نے منتقل کیا۔ (۲۳۸) قصہ چندر بدن، اردو منظوم کا ایک جمیول المصنف
نسخہ لاہور سے ۱۸۷۵ء میں ۲۳ صفحات پر شائع ہوا۔ (۲۳۹) اس کا دوسرا ایڈیشن
بھی لاہور ہی سے ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا۔ (۲۵۰)

مثنوی کی مثنوی کے علاوہ اردو میں چندر بدن اور مہیار کے قصے پر مبنی
پانچ دوسرے شاعروں کی مثنویاں بھی ملتی ہیں۔ اس قصے کے بارے میں
عبد القادر سرور نے صحیح لکھا ہے: ”اس کا مقصد مذہب اسلام کی عظمت ظاہر
کرنا تھا۔ دکن میں ایسی کئی قبریں ملتی ہیں، جن پر دو تعویذ بنے ہوئے
ہیں۔“ (۲۵۱) چندر بدن اور مہیار ہی کے قصے پر بس نہیں، اس مقصد کے لیے کئی
دوسرے قصے بھی گھڑ لیے گئے اور انہیں سچا واقعہ بیان کیا جانے لگا۔ ان مثنویوں
کے متعلق ڈاکٹر عمیر الدین مدنی کا بیان ہے کہ ”مصلح اسلام کے لیے یہ بھی
ایک طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ مثنوی کا ہیرو مسلمان ہوتا اور ہیروئن ہندو۔“

۲۳۵ مقدمہ مثنوی چندر بدن، عمالہ ماسبق

۲۳۶ گل رعنا مثنوی، ورق الف ۵۵۰

۲۳۷ اطریا پنجابی، ص ۸۸ نیز پنجابی کتب برقی کالم ۲۲

۲۳۸ قریب کتب خانہ، ص ۶۲

۲۳۹ اطریا مطبوعات ص ۱۶۰

۲۵۰ ایضاً

۲۵۱ اردو مثنوی کا ارتقاء، ص ۴۹

دونوں میں قصے کے دور ان میں مذہب اور معاشرت کی برتری پر بحث ہوتی۔
آخر کار ہیروئن اپنا مذہب ترک کر کے مشرف بہ اسلام ہو جاتی۔“ (۲۵۲)

ذیل میں ہم ایسی سولہ اردو مشنویوں کے نام پیش کر رہے ہیں جن میں
ہیرو و مسلمان اور ہیروئن ہندو دکھائی گئی ہے۔ (۲۵۳) پہلی پانچ مشنویاں چندر بدن
اور مہیار ہی کے قصے پر مبنی ہیں۔ نمبر ۶ سے نمبر ۱۲ تک کی مشنویاں بھی دکن و
گجرات میں لکھی گئیں۔ چندر بدن و مہیار کے قصے سے ماخوذ نہیں، لیکن ان کے
قصے اس سے ملتے جلتے ضرور ہیں۔ آخری چار مشنویاں شہلی ہندوستان میں لکھی
گئیں۔ ان میں تبلیغ کا عنصر کم ہے یا بعض میں بالکل نہیں۔ بالخصوص آخری
مثنوی ”سریا سوز“ میں تو رواداری اور باہمی اخوت کی فضا ملتی ہے اور مختلف
مذہب کی بنیادی وحدت پر زور دیا گیا ہے۔ ان مشنویوں کے نام یہ ہیں:

- (۱) مثنوی عذرت عشق؛ (۲) مثنوی از واقف؛ (۳) مثنوی از بلبل؛
- (۴) مثنوی از محمد عبدالقادر شاکر؛ (۵) مثنوی از سیف اللہ (۲۵۴) (یہ پانچوں
- مثنویاں قصہ چندر بدن و مہیار پر مبنی ہیں)؛ (۶) مثنوی مغل اور ناگرنی؛
- (۷) مثنوی نازنین اور پنهان؛ (۸) مثنوی ہیرا لال؛ (۹) مثنوی نتھو و بانسی؛
- (۱۰) مثنوی طالب و موہنی؛ (۱۱) مثنوی صبح عشق؛ (۱۲) مثنوی بہلول صادق؛ (یہ
- سات دکنی مشنویاں قصہ چندر بدن و مہیار سے ملتے جلتے قصوں پر مبنی ہیں)۔
- (۱۳) مثنوی حبلہ شوق؛ (۱۴) مثنوی سوز و گداز؛ (۱۵) مثنوی دل پذیر؛ اور

۲۵۲ نوائے لب، جولائی ۱۹۵۳ء، ص ۱۰

۲۵۳ اردو عز میں بھی اس انداز کے قصے ملتے ہیں مثلاً قصہ عظیم شاہ و چڑیا کا قصہ ملکہ دہاں
و کام کڈلا

۲۵۴ مثنوی نمبر ۳ اور ۵ کے لیے ہمدانی مطبوعات کا مالک اکبر الدین صدیقی کا مقدمہ (حوالہ
مستحق) ہے۔ دہاسی نے تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی میں قصہ چندر بدن و مہیار کا
میدر علی دکنی کا ذکر کیا ہے، ص ۲۰۳ (حوالہ قاضی عبدالودود، سہ ماہی ۱۱، ص ۷۱) لیکن
ہم اس کی تصدیق سے قاصر ہیں

(۱۶) مثنوی سرپا سوز (یہ چار مثنویاں شمالی ہندوستان میں لکھی گئیں۔ ان میں بھی ہیر و مسلمان اور ہیر و زن ہندو ہے)۔ اب فردا فردا ان سولہ مثنویوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

قصہ چندر بدن پر مبنی مثنویاں

مثنوی ندرت عشق

اس مثنوی میں ایک دلکش شاعر محمد باقر آگاہ نے چندر بدن و مہیار کا قصہ بیان کیا ہے۔ مثنوی کا سال اختتام ۱۲۱۳ھ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں (۲۵۵) اور دوسرا کتب خانہ انجمن ترقی اردو میں محفوظ ہے۔ (۲۵۶) آگاہ نے قصے میں تصوف بھی شامل کر دیا ہے۔ زبان نسبتاً عام فہم اور انداز بیان دلنشین ہے۔ چندر بدن کی تعریف میں یہ شعر ملاحظہ ہوں:

اگر نکلے وہ غیرت ماہتاب شب تار میں سیر کو بے نقاب
چکوروں کو ہو چاندنی کا خیال ہو موروں کا بکلی سے آشفقہ حال
مئے رس بھری بات اس کی اگر تو سب رس ہو تلخی سے بک میں پھر (۲۵۷)
تھی ناگن کچھ ایسی وہ زلف رسا کہ جی سے گیا جس کو اس نے ڈسا (۲۵۸)

مثنوی از واقف

واقف کا پورا نام بابا چند حسین واقف عرف پیراں صاحب ہے۔ وہ بھاپوری شاعر تھا اور اس نے یہ قصہ ۱۲۲۷ھ میں نظم کیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ

۲۵۵ سالار جنگ، ص ۶۷۳

۲۵۶ مثنویات، ۶۶

۲۵۷ پیرچہ معنی مشہور

۲۵۸ ندرت عشق قلمی نسخہ انجمن، مثنویات، ص ۶۶

کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ (۲۵۹) مصنف نے صراحت کر دی ہے کہ اس نے یہ قصہ آگاہ کی دیکھی اور عشق کی فارسی مثنوی سے اخذ کیا۔ مگر واقف کی مثنوی دوسروں کی نسبت بہت طویل ہے۔ مثلاً چند بدن کے سراپا ہی پر واقف نے ۷۰ اشعار لکھ دیے ہیں۔ نمونہ:

کہ ایسے میں وہاں سے آئی ولبر کل جیوں اور سے خورہید انور
جو دیکھا حسن کا آتا ہے ہونا وہ جیسا شمع پر پروانہ ٹوٹا
گرا اس کے قدم پر جا کے اک بار نہایت عاجزی کے ساتھ مہیار
کہا قدموں پہ گر "عاشق ہوں تیرا" کہ تجھ پر جان و دل قربان میرا

مثنوی از بلبل

یہ آنتھی کی فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ لوارء لویات اردو کے کتب خانہ میں ہے۔ (۲۶۰) منہ تصنیف معلوم نہیں اور شاعر کے حالات بھی تاریکی میں ہیں۔ ڈاکٹر زور کا بیان ہے کہ یہ مثنوی مقیمی کے بہت بعد لکھی گئی ہے۔ اس کی زبان زیادہ قدیم نہیں۔ یہ مثنوی شاعرانہ شخصیت اور لطافت کے اعتبار سے بھی مقیمی کی مثنوی سے بہتر ہے۔ ملاحظہ ہو مہیار کے اظہار عشق کرنے پر چند بدن یوں نغمہ بار ہوتی ہے:

قدم سوں اس کے سر کوں مار شوکر کئی بکنا ہے کیا دیوانہ ہو کر
کہاں میں چاند ہوں ہو تو دیوا ہے سوے دیوانہ بے ہودہ ہوا ہے
نہیں ہے تاب ذرہ وصل خورشید کرے کیا قطرہ با دریائے اُمید
یہ کہہ کر اس کے سر کو مار شوکر کرشمہ ناز ہو غمزدے میں ہو کر

پری بیکر نرغ نیکو شاکل کری سپہار کوں فزے سوں گھائل (۲۷)
مثنوی از شاکر

حاجی شیخ محمد عبدالقادر شاکر ربیع و اتم ہاڑی (مدراں) نے بھی اس قصے کو مثنوی کے چرائے میں بیان کیا ہے۔ یہ مثنوی ”قصہ گلزار شاکر“ کے نام سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس مثنوی میں مذہبی مباحث اور تصوف کا عنصر زیادہ ہے۔ سبب تالیف میں شاعر نے بتا دیا ہے کہ اس نے اپنی مثنوی کی بنیاد باقر آگاہ کی مثنوی (عذرت عشق) اور ایک ”پرانی کتاب“ (غالباً روایت عشقی یا آتش) پر رکھی۔ شاکر کا انداز بیان کلفت اور اشعار شیریں ہیں:

اس کے بعد آئی وہاں چند بدن گلبدن، غنچہ دہن، رشک چمن
زعفرانی رنگ اور زریں لباس ان لباسوں پر جب پھولوں کی پاس
وہ مہادیوی کے آگے شاد شاد مانگتی تھی مجھ سے اپنی مراد
پا کے بو چند بدن کی ماہیار ہو کے آیا پاس اس کے بے قرار
فرط الفت سے لپٹ کر رو دیا کچھ جھجک کر اس سے ہٹ کر رو دیا
قہر سے چند بدن نے یہ کہا ”اے موے چل، کیا تو دیوانہ ہوا“

مثنوی از سیف اللہ

سیف اللہ نے بھی اپنی مثنوی میں کم و بیش وہی باتیں بیان کی ہیں جو دوسروں کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ اس مثنوی کے بارے میں غلام یزدانی صاحب نے اپنے مضمون مطبوعہ رسالہ ساقی میں مفصل تبصرہ کیا تھا۔ ان کا مملوکہ نسخہ ناقص الاخر ہے اور موجودہ حالت میں اشعار کی کل تعداد ۸۷۹ ہے۔ سیف اللہ چند بدن کی تعریف میں یوں رطبہ لکھتا ہے:

سندر، سادری، مست، جوین بھری کلفت جبین، شیر سن بھری
 دو زلفاں اسے ہانکی کالیاں نین مرگ سی ستولیاں
 غضب ناک اور چست و چالاک تر پٹ اچلی، شر ہاک تر
 پوتر رہی پوجا اور پٹ میں رکھے گیان کا دھبہ رات میں

قصہ چندر بدن اور مہیار سے ملتی جلتی یاں

مثنوی مغل اور ناگرنی

اس مثنوی کا ذکر ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے کجرات کی مثنویوں کے
 ضمن میں کیا ہے۔ اس کا قصہ یوں ہے: ایک مغل زادہ کسی ناگر عورت پر فریفتہ
 ہو گیا۔ حبشی غلام کے ذریعے نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے تو ناگر عورت
 نالقی رہی، جب مغل زادے کے عشق کا یقین ہو گیا تو وہ اس شرط پر شادی کے
 لیے رضامند ہو گئی کہ وہ دریا میں کودے گی۔ اگر مغل زادہ اسے بچالے تو وہ اس
 کی ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آخر ناگر عورت مسلمان ہو گئی اور دونوں
 ایران چلے گئے۔

اس مثنوی کا مخطوطہ کسی شخص صہبہ اللہ نے بمقام راجہ چنپر (کجرات)
 میں ۱۲۵۳ھ میں لکھا۔ اس سے مصنف اور سن تصنیف کے بارے میں کوئی
 معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ زبان کی قدامت سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ مثنوی
 بارہویں صدی ہجری کے نصف اول میں لکھی گئی ہوگی۔

مثنوی کے کرداروں کی مناسبت سے دکنی اردو کے علاوہ فارسی اور
 کجراتی کا استعمال بھی کیا ہے۔ ناگر عورت کو دیکھتے ہی مغل زادے کی یہ حالت
 ہوتی ہے:

ناگری بہاؤ میں کاگری لیتے لٹ نکلتے چال میں آئی
 دیکھتے ہی مغل گھیر کھا پڑا رونہہ میں یہ بندھائی

اپنے حبشی غلام کو قاصد بنا کر بھیجتا ہے :

بشنو خبر من بگویم بائی کے جاگے تنکوں راکھا

یک سخن برساں مجھ غریب اصلہاں کا

ناگرنی قاصد کی باتیں سن کر کہتی ہے :

چنڈ پرو موڑ دیستو رہ نکسیں کالو موٹہ ہوئی نے آدو

(برے ہٹ کہاں سے یہ کالا منہ لے کر یہاں آیا)

کیا نومگل، کیا نوویڑو، کیا نی دات توں ایوی لیا دو

(کہاں کا مغل، کون سا وقت، کہاں کی بات تو ایسی لایا) (۲۶۳)

مثنوی نازنین اور پشمان

اس مثنوی کا قصہ بھی گزشتہ مثنوی سے ملتا جلتا ہے۔ مصنف کے بارے میں کوئی معلومات نہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ حامد شخص کرتا تھا۔ یہ مثنوی غالباً ۱۲۰۱ھ - ۱۲۱۰ھ کے لگ بھگ لکھی گئی۔ قصے کی داخلی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو نازنین اور پشمان کا یہ قصہ سورت کے ایک نواب حسدی تنج بیک خاں (۱۱۳۵-۱۱۳۹ھ) کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ (۲۶۳) ڈاکٹر محمد باقر کا بیان ہے کہ قصے میں کل ۱۲۷۳ اشعار ہیں جو ۲۶ صفحوں پر پھیلے ہوئے ہیں (۲۶۳) حامد کا صوت کلام ملاحظہ ہو :

دیوانا ہوا دیکھ اس کا جمال نہ دیکھی تھی بگ میں اسی کی مثال
پشمان اپنے دل میں کیا یہ فکر کہ اس نازنین سے کروں کچھ ہنر

۲۶۳ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۱۹

(یہ اشعار مثنوی کی بحر میں نہیں ہیں)

۲۶۳ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، خواجہ باقی جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۶

۲۶۳ نثر و شاعری، ۱۹۵۶ء، ص ۲۸۷

اسی وقت وہ نار نہا کے چلی۔ اندر اس جواں کے گلی عملی (۲۹۵)

مشہور قصہ نازنین و پنهان کا ایک مطبوعہ نسخہ کتب خانہ انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے۔ یہ قصہ علی خاں کے منظوم قبولِ نردو اور عاجز کی مشہور لال و گوہر کے ساتھ گجراتی رسم الخط میں بھتی سے ۱۸۷۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شاعر کا نام حامد علی درج ہے۔ (۲۹۶)

مشہور ہیرا لال

یہ مشہور گجرات کے ایک شاعر پرہین (پرہین) سے منسوب کی گئی ہے۔ مشہور کا سن تصنیف ۱۲۱۶ھ ہے اور یہ ۱۳ اشعار پر مشتمل ہے۔

قصہ یوں ہے کہ گجرات میں ریواندی کے کنارے بادوت قصبے میں ہیرا لال ایک عورت رہتی تھی۔ ایک روز وہ ندی سے پانی بھرنے گئی جہاں اس پر قصبہ و جہول کی ایک پنهان کی نظر پڑی جو اسے دیکھتے ہی فریفتہ ہو گیا۔ ہیرا نے پنهان کو برا بھلا کہا اور ڈرایا و دھمکایا۔ اٹھائے گنگو میں نہ ہی بحث چھڑ گئی۔ پنهان نے اسلام کی خوبیاں بیان کیں اور ہیرا نے اپنے مذہب کے محاسن بتائے۔ بالآخر ہیرا لال جواب ہو گئی اور پنهان کے ساتھ و جہول چلی گئی، جہاں قلعہ نے دونوں کا عقد کر دیا۔

اس مشہور میں ایک جدت یہ برتی گئی ہے کہ ہیرو کی زبان اردو ہے اور ہیروئن کی گجراتی۔ وہ پنهان کو دھمکاتے ہوئے کہتی ہے:

سی کو کو کرے جیسے مارا کان ماں جسے آبرو تیری ایک آن ماں
(کیا بک رہا ہے میرے کان میں جائے گی آبرو تیری ایک آن میں)

پنهان جواب دیتا ہے:

۲۹۵ ایضاً ص ۲۸۸

۲۹۶ انڈیا مطبوعات، ص ۱۲۳

تیرے بن مجھے کچھ سو بھاتا نہیں تجھے اب لیے بن سو جاتا نہیں (۲۶۷)

مثنوی نھو و ہامنی

یہ مثنوی ایک غیر معروف گجراتی شاعر حاجی محمد کی تصنیف ہے جو ۱۲۹۰ء میں بمبئی سے شائع ہوئی۔ اس میں منگردول ریاست کا ضیاءواثر کا ایک قصہ بیان کیا گیا ہے۔ منگردول کے محکم کا ایک سپاہی نھو ایک ہامنی پر عاشق ہو گیا۔ ہامنی نے التفات نہ کیا۔ دونوں نے اپنی اپنی مذہبی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی اور مدتوں بحث و تکرار ہوتی رہی۔ آخر جنگ آکر ہامنی نے کہا کہ اگر تو عاشق صادق ہے تو میری خاطر شہر کی فصیل سے کود کے دکھلا۔ نھو نے ایسا ہی کیا۔ ہامنی کا دل سنبھلا اور وہ اس سے علانیہ محبت کرنے لگی۔ ہامنی کے عزیز و اقارب کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ معاملہ نواب تک پہنچا۔ ہامنی نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور اس کا عقد نھو سے کر دیا گیا۔

شاعر نے صراحت کر دی ہے کہ یہ قصہ پہلے سے موجود تھا، جسے اس نے مکمل ترین صورت میں نظم کیا ہے۔ شاعر کو زبان پر قدرت حاصل ہے اور بعض جگہ سحرے اشعار نکالے ہیں۔ ہامنی کے حسن و جمال کو یوں بیان کیا ہے :

نظم اس کا سانچے میں گویا ڈھلا قیامت وہ قد تھا، اسی کا بلا
وہ آنکھوں میں کاہل لگا تھا غضب وہ رفتار اس کی قیامت غضب
عجب اس کے تن کا سبھی تھا شیوگ نگہ تیر جیسی تھی ہمالے کی نوک

مثنوی طالب و موہنی

اُردو میں طالب اور موہنی کے قصہ عشق کو ایک دکنی شاعر سید محمد والہ موسوی نے نظم کیا۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ ایشیا آفیس لندن میں محفوظ

۲۶۷ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۳ء، ص ۱۰

۲۶۸ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۳ء، ص ۱۶

ہے (۲۶۹) اور ایک حال ہی میں ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں دستیاب ہوا ہے (۲۷۰) جسے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اپنے مقدمے کے ساتھ حیدر آباد سے شائع کر دیا ہے۔ (۲۷۱) اس مثنوی کے ایک مخطوطے کا ذکر اشہر انگر کے ہاں بھی ملتا ہے۔ (۲۷۲)

سید محمد والد، سید محمد باقر خراسانی کے فرزند تھے۔ عالم شباب میں لاہور اور وہاں سے دہلی آئے۔ دہلی سے نظام الملک آصف جاہ کے ساتھ ۱۱۳۷ھ میں دکن آئے۔ مختلف عہدوں پر فائز رہے اور ۱۱۸۲ھ میں نظام ترچناپلی فوت ہوئے۔ (۲۷۳) فارسی میں صاحب دیوان تھے۔ ڈاکٹر زور نے مثنوی طالب و موہنی کے علاوہ ان کی دس اور تصانیف کی نشان دہی کی ہے۔ (۲۷۴)

والد جس زمانے میں دکن میں وارد ہوئے، اپنی نشاطی کی مثنوی پہلوئیں کا بڑا شہرہ تھا۔ یہ مثنوی انھیں پسند نہ آئی اور اسی کے جواب میں انھوں نے طالب و موہنی کا قصہ نظم کیا۔ والد نے صراحت کر دی ہے کہ اس مثنوی میں انھوں نے ایک مقامی قصے کو بیان کیا ہے۔ اورنگ آباد اور احمد نگر کے جنوب میں موجود عثمان آباد کے قریب قلعہ پرچڑہ ایک تاریخی مقام تھا، وہاں ایک بوڑھے برہمن نے والد کو طالب اور موہنی کی داستان عشق سنائی۔ والد کے دل پر اس کا گہرا اثر ہوا اور انھوں نے اسے مثنوی کے انداز پر لکھ ڈالا۔ (۲۷۵)

قصے یوں ہے : طالب نامی ایک مسلمان نوجوان نے مہاجن کی لڑکی

۲۶۹	ایام ہدایت المذاہر ۷۲
۲۷۰	ادارہ ادبیات، جلد سوم، ص ۹۱
۲۷۱	طالب و موہنی مرتبہ ڈاکٹر زور، حیدر آباد، ۱۹۵۷ء
۲۷۲	اشہر انگر، ص ۳۰
۲۷۳	تذکرہ محبوب الحرمین، ص ۸۸۵
۲۷۴	مثنوی طالب و موہنی، حوالہ ماستی
۲۷۵	مثنوی طالب و موہنی، ص ۳۰

موہنی کو پچھٹ پر پانی بھرتے دیکھا اور اس پر شیدا و مفلوک ہو گیا۔ اس نے موہنی کا تعاقب کیا اور مہاجن کے گھر کے سامنے دھرتا دے کر بیٹھ رہا اور کھانا پینا بند کر دیا۔ لوگوں میں اس کے عشق و جنون کا چرچا ہونے لگا۔ تین چار روز گزرنے پر مہاجن نے اس ڈر سے کہ خون ناحق اس کے سر نہ جائے، طالب کو کھانا پیش کیا مگر طالب نے اسے ٹھکسنے سے انکار کر دیا۔ آخر لوگوں کے کہنے سننے پر مہاجن نے موہنی کے ہاتھ کھانا بھیجا جو طالب نے قبول کر لیا۔ بات بڑھتے بڑھتے شہر کے عامل تک پہنچی اور وہ بھی اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ آخر مہاجن نے ایک چال چلی اور خبر اڑائی کہ موہنی بیمار ہے۔ کچھ روز بعد مشہور کر دیا کہ موہنی مر گئی ہے اور اس کا جنازہ اٹھایا گیا۔ طالب بھی ماتم کرتا ہوا ساتھ ہولیا۔ موہنی کے اعزاء و اقربا نے لعنت ملامت کی کہ محبوب کے مر جانے کے بعد بھی تو زندہ ہے کون کہتا ہے کہ تو عاشق صادق ہے؟ غرض:

دو طالب عاشق صاحب وفا تھا عشق میں روزِ اول سوں فدا تھا
یہ طعنہ جب سنا غیرت میں آیا دو ڈولی سوں ایس کا کھ پھریا
دنیا کا میں اتنا پانی بیوں حیف مرے موہنی اور اس بن میں جیوں حیف
نظر آیا تمام آفاق کالا ایس کو بے دھڑک ہادلی میں ڈالا
مرا اور جیوں دیا سر نہیں اُٹایا فنا مشتاق یک غوطہ نہ کھایا (۲۷۶)

موہنی کو اس حادثے کی اطلاع ملی تو وہ بھی اسی کنویں میں کود کر مر گئی۔ دونوں لاشیں باہر نکالی گئیں تو باہم بیوست تھیں۔ عامل نے نماز جنازہ ادا کی اور دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا۔

والہ کے لب و لہجے میں فارسی کا اثر نمایاں ہے۔ دکنی لہجہ نا پخت ہے۔ اشعار ہموار نہیں۔ دکن کے قدیم گاؤں پرچندہ کی تعریف ان الفاظ میں سنئے:

دیکھے کیا چو کدن بہتی رنگیں ہے پریندا میں جنت کی گل زمیں ہے

گھر وہاں کے زمیں عالی بنا تھے نکاہاں کے گندہاں مارسا تھے
 دو گلشن سب در و دیوار دستے خیابان چمن بازار دستے
 ہوا یوں چارگی کی ہاس لاتی کہ گویا زلف کے کوپے سے آتی
 ہر اک گلشن میں تھے موزوں نہالاں گل افشاں جیوں دل نازک خیالاں
 پر پڑا یوں اتھا والہ جو دیکھا اتنا کچھ نہیں رہا عالم کا لیکھا (۲۷۷)
 والہ نے اپنی مثنوی ابن نشاطی کی پھولین کے جواب میں لکھی تھی
 لیکن اس کی شہرت کا عشر عشر بھی اسے نصیب نہ ہوا۔

مثنوی شمع عشق

یہ مثنوی کسی شاعر انور کی تصنیف ہے جس نے اُسے ۱۴۵۹ھ میں
 لکھا۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ جامع مسجد بہمنی میں محفوظ ہے (تعداد صفحات ۹۱)
 اس مثنوی کا قصہ والہ کی مثنوی ”غلاب و موہنی“ سے ملتا جلتا ہے یعنی ایک
 مسلمان لڑکا ایک برہمن لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ بدنامی سے بچنے کے لیے لڑکی کی
 موت کی جھوٹی خبر مشہور کی گئی۔ عاشق نے سنا تو گنگا میں ڈوب کر خود کشی
 کر لی۔ اس پر لڑکی نے بھی ایسا ہی کیا جب دونوں کی لاشیں دریا سے نکالی گئیں تو
 باہم بیوستہ تھیں وغیرہ۔ (۲۷۸)

مثنوی بہلول صادق

یہ مثنوی ایک دکنی شاعر لطفی کی تصنیف ہے۔ میر لطف علی نام اور
 لطفی حقیقی تھام۔ درویش محمد خاں صوبہ دار برار کے نواسے تھے۔ ۱۴۰۰ھ میں
 انتقال ہوا۔ (۲۷۹) ان کی مثنوی بہلول صادق کا واحد نسخہ انڈیا آفس لندن میں

۲۷۷ مثنوی غلاب و موہنی، ص ۳۲

۲۷۸ بحوالہ مقدمہ مثنوی چندر دھن دھیار، حوالہ سابق، ص ۵۵

۲۷۹ محبوب الرحمن تذکرہ شعرا دکن، ص ۹۷

ہے۔ (۲۸۰)۔ نقد اور لفظی سات۔

مثنوی کا قصہ ”پنتر بدن و مہیار“ اور ”طالب و موبہنی“ سے ملتا جلتا ہے۔ بہلول نامی ایک مسلمان بنارس کے گھاٹ پر اٹھان کرنے والی ایک ہندو لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ نوبت دیوانگی تک پہنچی۔ آخر دریا میں کود کے مر گیا۔ لڑکی نے بھی اسی طرح جان دے دی۔ موبہنی دونوں نعشوں کو ساحل پر لے آئیں تو دونوں آپس میں بغلیں پائے گئے۔ آخر دونوں کو سپرد آتش کرنے کے بعد ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ (۲۸۱)

ادبی اعتبار سے مثنوی پست اور پمکی سیٹھی ہے۔

مثنوی شعلہ شوق

میر تقی میر نے اس مثنوی میں پر سرام اور اس کی بیوی کا دردناک قصہ بیان کیا ہے۔ مثنوی کا آغاز عشق کی تعریف سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد پر سرام کی تصویر یوں پیش کی گئی ہے :

خوش اندام و خوش قامت و خوش خرام	کہ داں اک جواں تھا پر سرام نام
گلستاں سے کام اس کی خوبی پہ تک	جوانی کے نکشٹن کا وہ آب و رنگ
قیامت اور سے نمودار ہو	جدھر کو وہ تک گرم رفتار ہو
وہیں روئے مقصود جاں دیکھے	سراپا میں اس کے جہاں دیکھے

پرس رام کو اپنے ایک چاہنے والے سے گہرا ربط و اختلاص تھا۔ اس دوران میں پرس رام کی شادی ہو گئی اور وہ اپنی بیوی کی محبت میں ایسا گرفتار ہوا کہ اپنے قدیمی عاشق کے پاس اس کی آمد و رفت کم ہونے لگی۔ عاشق نے گلہ کیا تو پرس رام نے کہا:

۲۸۰ بوم ہارٹ ایشیا نمبر ۷

۲۸۱ یورپ میں دکنی مخطوطات، ص ۵۳۹

نہ فرصت مجھے صبح ہے اب نہ شام طرف اس کے ہے دل کو ملبہ تمام
اسے بھی مرے ساتھ اخلاص ہے دلوں کو بہم رابطہ خاص ہے
نکلا ہوں گھر سے جو میں ایک آن تو پاتا ہوں جا کر اسے نیم جاں
نہ دیکھے جو مجھ کو تو سر جاوے وہ وہیں جی سے اپنے گزر جائے وہ

سننے والے نے اسے عورتوں کا کمرہ فریب قرار دیا۔ چنانچہ دونوں نے مل کر
امتحان لینے کی ٹھانی۔ پرس رام کی موت کی جھوٹی خبریں ہی گھڑی گئی کہ وہ دریا
پر نہانے گیا تھا کہ ڈوب کر مر گیا۔ ایک شخص یہ خبر پرس رام کی بیوی کو سنانے
کے لیے بھیجا گیا۔ اسے سنتے ہی وہ درد مند ایک آہ کے ساتھ زمین پر گر کر اور
جاں بحق ہو گئی:

گری ہو کے ہے جان وہ درد مند ہوا شور نوے کا گھر سے بلند
موتی غم میں اس جملہ تن ناز کے مٹی جان مہرہ خن ساز کے
وہ آیا جو تھا دل پریشاں گیا کہ اس واقعہ سے پشیاں گیا
خبر لے گیا اس کئے زود تر جو تھا درپے امتحان ہے خبر
کہ وہ رشک مرہ امتحان دے مٹی محبت کے ناموس کو لے مٹی
بیوی کی موت کے سانچے کے بعد پرس رام پر جنوں کی سی کیفیت
طاری ہونے لگی:

جگر غم میں یک لخت خوں ہو گیا زکا دل کہ آخر جنوں ہو گیا
کھو یاد کر اس کو نالاں رہے کھو تک جو بھولے تو حیراں رہے
ہوئی رفتہ رفتہ جو وحشت زیاد لگا بھاگنے سب سے وہ نامراد
کھو جا کے صحرا سے لاویں اسے کھو روتے دریا پہ پاویں اسے

ایک دن ایک بلی گھرنے پرس رام کو بتایا کہ رات کو دریا کے کنارے
ایک شعلہ اترتا ہے اور ”پرس رام“، ”پرس رام“ پکارتے ہوئے کناروں پر

دوڑنے لگتا ہے۔ چنانچہ چند دوستوں کے ساتھ پرس رام رات کو کشتی کی سر کے بہانے دریا پر پہنچا۔ تھوڑی دیر کے بعد دریا کے دوسرے کنارے پر روشنی نمودار ہوئی اور:

لب لب آپ وہ شعلہ جاں گداز	ترب کر بہت ہا زبان دراز
پکارا کہاں ہے پرس رام تو	محبت کا تک دیکھ انجام تو
یہ بے تاب سن کر ہوا بے قرار	سینے سے اترا بعد اضطراب
ہوا ہم دم اس آتش انگیز سے	کہا اس بلائے دل آویز سے
کہ میں ہوں پرس رام خانہ غراب	مراد دل بھی اس آگ سے ہے کہاب
محبت تری برق خرمن ہوئی	تری دوستی جی کی دشمن ہوئی
خن مختصر کچھ وہ شعلہ چلا	کچھ اک اپنی جاگہ سے یہ دل جلا
بیم گرم جوشی سے یک جا ہوئے	کہ گزری تھی مدت بھی تنہا ہوئے
وہ شعلہ رہا ایک جا مشتعل	کہے تو قتل ہوئے جان و دل
یہ ایک ہلک کر وہ چلنے لگا	بھر ایدھر اودھر پھرنے چلنے لگا
کیا پاس پانی کے آکر صعود	رہی روشنی سی کوئی دم مسود
بھر آگے کسی پر نہ پیدا ہوا	نجانا کہ شعلہ وہ بھر کیا ہوا (۲۸۲)

پوری مثنوی درد و اثر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ میر کی طبیعت کو پاس و الم کے مضامین سے خاص مناسبت تھی۔ اس مثنوی کا قصہ ماخوذ ہے۔ لیکن میر کے سونہ دروں کی آنچ قدم قدم پر محسوس ہوتی ہے۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کا بیان ہے (۲۸۳) کہ اس مثنوی کا قصہ میر کی اختراع نہیں۔ شوق نیوی نے اسے یادگار وطن میں بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں پٹنہ کا ایک مسلمان محمد حسن ایک مہاجن کی

۲۸۲ کلیات میر، مرحہ مہارہادی آسی، ص ۸۹۰

۲۸۳ میر تقی میر، ص ۲۲۷

لڑکی شام سندر پر عاشق ہو گیا۔ جنوں یہاں تک بڑھا کہ معشوق کے گھر میں رسائی پیدا کرنے کے لیے وہ پنڈت بن گیا اور پرس رام نام رکھ لیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد شام سندر کی شادی کسی اور سے ہو رہی تھی اور محمد حسن پنڈت کی حیثیت سے رسوم ادا کر رہا تھا کہ گھر میں آگ لگ گئی۔ اس نے شام سندر کی جان بچائی اور بعد میں اس سے نکاح کر لیا۔ ایک سال محمد حسن چھتر کے میلے میں گیا ہوا تھا کہ شام سندر نے اس کی کشتی کے غرق ہو جانے کی خبر سنی اور اس صدمے سے مر گئی۔ محمد حسن کسی طرح ہاتھ پاؤں مار کر کنارے پر آگیا۔ اسے شام سندر کی موت کا احوال معلوم ہوا تو ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ دوستوں نے بتایا کہ رات کو دریا کے کنارے ”ایک تند و تیز روشنی آسمان سے اترتی اور ”حسن حسن“ پکارتی ہے۔“ محمد حسن اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں گیا، جب شعلہ نمودار ہوا تو وہ اس کی طرف پکا، تھوڑی دیر بعد سطح آب پر دو تیز و تند روشنیاں ابھریں اور حسن، شام سندر، حسن — شام سندر، کہتی ہوئی ایک دوسرے کی طرف بڑھیں، بھٹک سے ٹپیں اور بجلی کی سی چمک سے سارا دریا منور ہو گیا۔ اس کے بعد محمد حسن کی لاش کا پتا نہ چلا۔

ڈاکٹر موصوف نے شمیم رضوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ محمد حسن نے دریا میں اترنے سے پہلے اپنی صدی کی جیب میں ایک تحریر چھوڑی تھی، جسے میر کے ہم عصر تانیہ عظیم آبادی نے اپنے ایک خط کے ساتھ شاہزادہ جہاں دار کو بھیج دیا۔ تانیہ کے خطوط کا مجموعہ ”زبدۃ المنقبات“ کے نام سے شائع ہو گیا۔ اس میں محمد حسن کے خط کی نقل موجود ہے۔ (۲۸۴)

قاضی عبدالودود کا بیان ہے کہ تانیہ کے خطوط کا مجموعہ ”ریاض المنقبات“ میرے پاس تھا۔ اس میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں۔ (۲۸۵) شمیم رضوی سے کراچی میں زبانی گفتگو ہوئی۔ انھوں نے تانیہ کی تحریر خود نہیں

۲۸۴ میر تقی میر، ۱۹۵۴ء، ص ۴۳۰

۲۸۵ معاصر، ص ۱۸۴

دیکھی۔ کراچی میں مختلف اصحاب سے گفتگو کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ تانیہ کی کوئی تحریر ابوالعاس صاحب کے پاس نہ تھی۔ (۲۸۲)

دراصل اس واقعے کی اصلیت کا تھا ثبوت شوق نیوی کا مندرجہ بالا بیان ہے جسے انھوں نے اپنی مثنوی ”سوز و گداز“ کے آغاز میں بھی درج کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ”..... یہ قصہ کچھ فرضی نہیں ماضی ہے، جس کو تقریباً ڈیڑھ سو برس گزرے ہوں گے۔ اس کی اصلیت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود وہ مرحوم عاشق اپنے حالات آپ لکھ گیا ہے جس کو تانیہ عظیم آبادی (المتوفی ۱۲۰۶ھ) نے اپنے خط میں بعید نقل کر کے شاہزادہ جہاندار شاہ کے حضور میں روانہ کیا ہے۔ پھر ان کے بیٹے قسما مرحوم نے اس خط کو زبدۃ المستعانت میں درج کیا ہے۔ تانیہ نے اس خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ ”مکان عالی شان آں مہاجن کے قریب چوک بود، بعد حادثہ آتش زدگی بنام آں نوروس اشتہار یافتہ“۔۔۔۔۔ فی الواقع چوک کے قریب ہائے کے گلی کے پاس ایک چھوٹا سا محلہ سندھ بازار نام مشہور ہے جو آج تک مہاجنوں سے آباد ہے۔ واقعہ حسرت ناک و پرسوز کو۔۔۔۔۔ ہاقر علی خاں ہاقر لکھنوی مرحوم نے بھی نثر فارسی میں لکھا ہے۔“ (۲۸۳)

شوق نیوی نے قصے کی جو روایت بیان کی ہے اس کا مطالعہ اگر جاری رہی شاہد کی روشنی میں کیا جائے تو وہ صحیح ثابت نہیں ہوتی۔ مثنوی محلہ شوق اور شوق نیوی کے بیان کیے ہوئے قصے میں جو فرق ہے وہ تفصیل کا محتاج نہیں۔ میر تقی میر (المتوفی ۱۲۳۵ھ) اور شوق نیوی (المتوفی ۱۳۲۲ھ) کے زمانے میں تقریباً ایک صدی کا فاصلہ ہے۔ حوالی قصے کہانیوں میں یہ بات عموماً دیکھی گئی ہے کہ تھوڑی سی مدت میں وہ کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں۔ مختلف لوگ انھیں مختلف انداز پر بیان کرتے ہیں اور بعض اوقات تو قصہ اتنا بدل جاتا ہے کہ اصل اور

۲۸۶ مکتوب قاضی عبدالودود بنام مولف

۲۸۷ دیباچہ مثنوی سوز و گداز، شوق نیوی طبع جانی ۱۹۲۳ء، پلڈ، ص ۲

نقل میں مطابقت دشوار ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی معاملہ اس قصے کا بھی ہے۔ شوق نیوی نے قصے کی جو روایت بیان کی ہے وہ اصل سے مختلف ہے اور یقیناً بعد کے زمانے کی ہے۔ ایک سو برس کے عرصے میں عوام کی زبان پر چڑھ کر اس قصے میں بہت سے افسانے ہو گئے۔ ہیرد کو مسلمان اور ہیردئی کو ہندو قرار دے کر قصے میں مذہب کا عنصر بھی داخل کر دیا گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس قصے کی اصل روایت وہی ہے جو میر نے بیان کی ہے۔^(۲۸۸) باقی تمام باتیں بعد کے لوگوں نے زیب داستان کے لیے بڑھادیں۔ شوق نیوی نے اپنے زمانے میں جس طرح لوگوں کی زبان سے اس قصے کو سنا بغیر کسی تحقیق کے اسی طرح ”پادگار وطن“ میں لکھ دیا اور اسے اپنی مثنوی ”سوز و گداز“ میں بھی بے کم و کاست نظم کر دیا۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میر کے زمانے کی لکھی ہوئی ایک فارسی مثنوی میں بھی اس قصے کو تقریباً اسی طرح بیان کیا گیا ہے، جس طرح میر نے ”قطعہ شوق“ میں نظم کیا ہے۔ میر کے دیوان اول کا قلمی نسخہ جس میں مثنوی قطعہ شوق شامل ہے، ۱۱۹۲ھ کا مرقومہ ہے۔^(۲۸۹) اس سے بہت پہلے کی لکھی ہوئی ایک فارسی مثنوی ”تصویر محبت“ (۱۱۵۶ھ کی تصنیف، نام تاریخی) کا ذکر اشیرانگر نے کیا ہے۔^(۲۹۰) اس کا بیان ہے کہ اس میں رام چند کا قصہ ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کے پاس ایک عیاض ہے جس میں یہ مثنوی موجود ہے (ناقص الاول) ”اس فرق کے ساتھ کہ میر نے نام پر سرام لکھا ہے اور فقیر نے رام چند۔ قصہ دونوں کے یہاں ایک ہی ہے۔ کم از کم اس حصے میں جو میر سے پاس ہے، کوئی ایسی اہم بات جو میر کے یہاں نہ ہو

۲۸۸ میر کے دیوان اول قلمی نسخہ ۱۱۹۲ھ خزائنہ لائبریری اردو نمبر ۳۳ میں مثنوی قطعہ شوق کے آغاز میں یہ عبارت ملتی ہے: ”آغاز قصہ جاننا کہ در عہد محمد شاہ در عظیم آباد پیش وضع و شریک بہ تصویر رسیده بود“۔ میر، ص ۵۹

۲۸۹ لائبریری اردو، ص ۱۰۸

۲۹۰ اشیرانگر، ص ۳۹۵

نہیں ملتی۔ (۲۹۱)

مثنوی سوز و گداز

محمد ظہیر احسن شوق نیوی عظیم آبادی کی اس مثنوی کا تعلق جیسا کہ پہلے بتایا گیا پرس رام (یا رام چندر) کے روایتی قصے سے ہے۔ شوق نیوی نے قصے کو بالکل اسی طرح نظم کرویا ہے، جس طرح وہ ان کے زمانے میں مشہور تھا۔ اس میں ہیرو اور ہیروئن کا مذہب باہم مختلف بتایا گیا ہے اور اسی اختلاف کی مدد سے قصے میں روایتی رکاوٹوں کی کشاکش کو شدید تر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شوق نیوی کی مثنوی میں محمد حسن اپنی محبوبہ کے لیے چنوت کا بھیج دیتا ہے، پرس رام نام رکھواتا ہے اور اشلوک از پر کر کے رملائن کی کٹھنا سنا تا ہے:

بھرا پھر روپ اک دن برہمن کا جنہیں پر قہقہہ خوں رنگ کھینچا
کیا کٹھنی سے سونگ اپنا نرالا لیا نام صنم چنے کو مالا
حاصل دوش پر زناں ڈالی بغل میں ایک پوٹھی بھی دہالی
بدل کر بھیج سوئے چوک آیا بکت سے ایک عالم کو بھایا

میر نے شادی سے پہلے پرس رام کا تعلق کسی امر و سے بتایا ہے۔ شوق نیوی کے ہاں ایسا نہیں بلکہ قصہ محمد حسن اور شام سندھ کے معاشقے سے شروع ہوتا ہے۔ شوق کے ہاں پرس رام کے ڈوبنے کا واقعہ بھی بدلا ہوا ہے۔ میر کہتے ہیں کہ پرس رام کی بیوی کی آزمائش کے لیے پرس رام کے ڈوب مرنے کی جھوٹی خبر مشہور کی گئی۔ شوق نیوی کے ہاں ایک میلے سے آتے ہوئے پرس رام کی کشنی بھنور میں پھنس کر الٹ جاتی ہے اور لوگوں کو پرس رام کے ڈوب مرنے کا مظاہرہ ہوتا ہے:

حسن کچھ لوگ لے کے اپنے گھر سے گیا اک سال میلے میں چھتر کے

کئی دن پیش و عشرت میں بسر کی پکایک لہر آئی دل میں گھر کی
 قدم اپنا برنگ موج اٹھایا پہنچ کر گھاٹ پر بڑا منگایا
 سوار اس میں ہوا اسباب کے ساتھ چلا گھر کی طرف احباب کے ساتھ
 مثال کشتی دل پھٹ گئی پال تڑپ کر رہ گئے سب بے پرواہ
 حسن آغوشِ دریا میں جو آیا بہنور نے اپنی چھاتی سے لگایا
 بہت کچھ ہاتھ پاؤں اس نے مارے تو کوسوں بہرہ کے جا پہنچا کنارے
 یہاں لوگوں نے اس سے ہاتھ دھویا یہ کبھے موجِ دریا نے ڈھویا (۲۹۲)

محمد حسن کے ڈوبنے کی خبر سننے ہی شامِ سندر کے کلیجہ پھٹ کے
 مر جانے اور راتوں کو دریا کے کنارے روشنی اترنے کا باقی قصہ بدستور ہے۔
 سارے قصے میں صرف یہی ایک واقعہ فوق الفطرت ہے اور اسی کی بنا پر قصے کی
 واقعیت تسلیم کرنے میں تاثر ہوتا ہے۔

مثنوی دل پذیر

اس مثنوی کا دوسرا نام ”مثنوی مر جہیں و ناز میں“ ہے۔ اسے سعادت
 یار خاں رتھن نے تصنیف کیا۔ اس کی تاریخ لالہ بان سنگھ نے لکھی ہے جس سے
 مثنوی کی تصنیف کا سنہ ۱۲۱۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس کے دو مخطوطے پنجاب
 یونیورسٹی لاہور میں ہیں (۲۹۳) ایک انڈیا آفس میں (۲۹۴) اور ایک برٹش
 میوزیم (۲۹۵) میں۔ تعداد اشعار ۱۸۶۵۔

اس مثنوی میں شیرازہ مر جہیں اور ناز میں کی محبت کا حال نظم کیا گیا
 ہے۔ قصے کا خلاصہ یہ ہے: بلخار کے بادشاہ خادو شہ کو نجومیوں نے بتایا کہ

۲۹۲ مثنوی سوز و گداز، ۱۹۲۲ء، ص ۳۵

۲۹۳ مثنوی مر جہیں و ناز میں (تلمی)، بحوالہ صابر علی خاں، سعادت یار خاں رتھن، ص ۳۱

۲۹۴ جہانِ ہند، شمارہ نمبر ۲۱

۲۹۵ جہانِ ہند، برٹش، ص ۳۰

حصارے جیٹا جھگو ہو سکتا ہے جب تم کسی پری کو اپنی ملکہ بنادو۔ بادشاہ نے حق شناس نازی زہد او۔ وزیر کو ساتھ لیا اور سحر کے حصار میں پہنچا۔ یہاں اسم اعظم کی بدولت دیوؤں اور زہن جادوگر سے مقابلہ کرنے کے بعد پری کو قبضے میں لیا جس سے ایک لڑکا مد جنیں پیدا ہوا۔ چودہ برس کی عمر میں اس نے ایک مرقع میں کسی کی تصویر کھینچی اور بے ہوش ہو گیا۔ وزیر کے بیٹے دانشور نے مد جنیں کے دل کا راز پالیا اور وہ دونوں مرقع والی شہزادی کی تلاش میں گھرے سے نکل کھڑے ہوئے۔ راہ میں کئی طلسمات آئے اور ایک رانی نے شہزادے کو جادو کے زور سے مینڈھا بنا دیا۔ سرانمدیپ کی مہارانی اوجھ سے گزری تو اس نے شہزادے کو پھر سے انسان بنایا اور دور دراز کے قاصد ملے کرنے کے لیے کچھ مقرر بنائے۔ شہزادہ اور وزیر زادہ دونوں بنارس آئے۔ یہاں انھیں معلوم ہوا کہ جس حسینہ کی تلاش میں وہ خراب و خوار پھر رہے ہیں وہ کشمیر کی شہزادی ہے اور اس کا نام ہارنین ہے۔ غرض یہ دونوں کشمیر پہنچے اور زنانہ لباس میں جا بجا کر رانی کا دل رہمانے لگے۔ لیکن جب کام چنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو شہزادہ بنارس سے فوج لے کر آیا اور دھاوا بول دیا۔ فریقین میں صلح اس شرط پر ہوئی کہ رانی مسلمان ہو جائے۔ غرض وزیر نے قاضی کو بلا کر دونوں کی شادی کرا دی۔

رنگین بڑے زندہ دل اور طبع شاعر تھے۔ ان کا مشاہدہ تیز تھا۔ مثنوی کے سیدھے سادے قصے کو انھوں نے طول دے کر بیان کیا ہے اور بات میں بات پیدا کی ہے۔ بعض اشعار محض بھرتی کے ہیں۔ زبان پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ جہاں ان کی طبیعت زور دیتی ہے، اشعار برجستہ اور ٹکافت نکلتے ہیں۔ مثنوی میں ایک جگہ ہولی کا منظر کھینچا ہے، اس سے چند شعر ملاحظہ ہوں :

چلتی ہے دو طرف سے پککاری مینہ برستا ہے رنگ کا ہماری
 بادل آئے ہیں گھر گھال کے لال کچھ کسی کا نہیں کسی کو خیال
 ہیں جو مصروف سب صغیر و کبیر اڑ رہا ہے گھال اور میجر

بن مجھے ہیں ہوا میں وہ بادل اور زمیں میں پڑے ہیں قتل کے قتل
 اور اٹھا کر کسی نے ہماری گیند کپٹی میں کسی نے ماری گیند
 اور مٹی میں اپنی بھر کے گمال ڈال کر رنگ منہ کیا ہے لال
 جس کے بالوں میں پڑ گیا ہے گیر بڑھاتی ہے یہ وہ ہو دل گیر
 ایسی ہولی کا کھو جڑا جاوے کوئی توج ایسے کھیل میں آوے
 جس کے لگا ہے قلم ہماری ہاتھ سے وہ پنگ کے پچکاری
 کہتی ہے یوں پیار کر جھولی ستیاں ہو ترا ہولی
 جس نے ڈالا ہے حوض میں جس کو وہ یہ کہتی ہے کوس کر اس کو
 یہ ہنسی حیرتی بھاڑ میں جاوے تجھ کو ہولی نہ دوسری آوے (۲۹۶)

مثنوی سراپا سوز

یہ مثنوی قاضی محمد صادق خاں اختر کی تصنیف ہے۔ اشپر انگر نے اس کا
 سنہ تصنیف ۱۲۳۱ھ لکھا ہے (۲۹۷) جو غلط ہے۔ امام بخش نانچ کے قطعہ تاریخ سے
 جو مثنوی کے آخر میں درج ہے، سال تصنیف ۱۲۳۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس
 مثنوی کا ایک مخطوط کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ (۲۹۸) اس کا
 ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کے پاس بھی تھا۔ (۲۹۹) مصنف کی زندگی ہی
 میں یہ مثنوی لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی لکھنؤ ہی سے نکلا
 تھا جس کا تصانیف محمد علی شاہ میکیش اکبر آبادی رسالہ اردو ادب میں کرا چکے
 ہیں۔ (۳۰۰) اس مثنوی کا ایک اور ایڈیشن بھی ہماری نظر سے گزرا ہے جو لکھنؤ ہی

۲۹۶ بحوالہ سعادت یاد خاں رنگین، حوالہ ماسبق

۲۹۷ اشپر انگر، ص ۵۹۹

۲۹۸ سالار جنگ، ص ۶۸۷

۲۹۹ مثنوی سراپا سوز رسالہ اردو ادب، جنوری ۱۹۶۰ء

۳۰۰ اردو ادب، مارچ ۱۹۵۳ء، ص ۵۷

سے ۱۸۵۸ء میں چھپا تھا۔ حسرت موہانی نے اس مثنوی کو محبت خاں محبت کی مثنوی "سہرا محبت" اور آغا علی شمس لکھنوی کی "طلعت الشمس" کے ساتھ "مجموعہ" کے نام سے اردو سے معنی پرپس سے شائع کیا تھا۔

قاضی محمد صادق خاں 'اختر' ہنگلی کے رہنے والے تھے۔ وطن چھوڑ کر لکھنؤ آئے اور قاتل کے شاگرد ہوئے۔ انھیں غازی الدین حیدر نے ملک الشعراء کا خطاب دیا تھا۔ اشپرا نگر نے ان کی فارسی سوانح عمری "صبح صادق" کا ذکر بھی کیا ہے۔ (۳۰۱) ۱۸۵۸ء میں انتقال کیا۔ (۳۰۲)

قاضی محمد صادق خاں کی تصانیف میں فارسی شعرا کا تذکرہ آفتاب عالم تاب بھی قابل ذکر ہے، جس کا قلمی نسخہ اسٹیٹ لائبریری راجپور میں محفوظ ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کا بیان ہے کہ "صبح صادق مشکل سے سوانح عمری کہی جاسکتی ہے۔" (۳۰۳)

مثنوی سرپا سوز کا قصہ یوں ہے: ہمارے ایک حسین نوجوان ایک روز بازار میں چلا جا رہا تھا کہ ناگاہ اس کی نگاہیں سناہ کی دختر زیبا سے چار ہوئیں۔ اس پری تھمال کا سامنا ہوتے ہی نوجوان بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑا۔ اس کے احباب اسے وہاں سے اٹھا کر گھر لائے اور ایک شخص کو پیانی بنا کر سناہ کی لڑکی کے پاس بھیجا۔ سناہ کی لڑکی کو اپنے عاشق صادق کے حالِ دار پر رحم آیا، لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور کہلوا بھیجا کہ تم مسلمان ہو، میں ہندو، ہم دونوں کا ساتھ ممکن نہیں۔ نوجوان نے جو کیوں کاروپ دھارن کیا اور گلے میں زہر ڈال کر سناہ کے گھر کے آگے دھونی ربا کے بیٹھ گیا۔ بات محلے برابری میں پھیلی اور یہاں تک بڑھی کہ وہ نوجوان لڑکی کے عزیزوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ لڑکی یہ دیکھ کر جوشِ غم سے پاگل ہو گئی اور نوجوان کی نقشب سے لپٹ کر آہِ دہری کرنے لگی۔

۳۰۱ اشپرا نگر، حوالہ سابق

۳۰۲ تاریخ نوپ اردو، ص ۳۰۷، غم خاتہ ہانویہ، نظم، نیز سرپا سوز، ص ۱۰۷

۳۰۳ مکتوب ہام مولف

سوز دروں سے اس کا تن بدن بھٹی کی طرح جلنے لگا اور آن کی آن میں وہ ڈھیر ہو گئی۔ عشق نے دو دیوانوں کو ہمیشہ کے لیے ملا دیا۔

مشوی مختصر ہے۔ کہیں کہیں قصص سے کام لیا ہے۔ مجموعی طور پر اشعار رواں اور ہندو شمس چست ہیں۔ شاعر کے کلام سے اس کے زور طبیعت اور ہنجلی کا پتا چلتا ہے۔ نوجوان کے مارے جانے کے بعد سنا کی لڑکی کی حالت ملاحظہ ہو :

دیکھ کر نعش یار سینہ ڈھار لگی کہنے بہ دیدہء خونبار
اے مرے جاں نثار رملہ وفا کشتہ شج و صخر اندا
ہائے اے میرے چاہنے والے بات اپنی نہا بنے والے
گر تو ملکب عدم کا عازم تھا چھوڑ جانا مجھے نہ لازم تھا
مجھ پہ سوچی سے یوں مرے گا کون باز برداریاں کرے گا کون (۳۰۴)

اس مشوی کی خصوصیت یہ ہے کہ بجائے کسی ایک مذہب کی برتری اور افضلیت ثابت کرنے کے اس میں باہمی رولوباری، آشتی اور دونوں مذہبوں کی بنیادی وحدت اور یکجہی پر زور دیا گیا ہے۔ سنا کی لڑکی نے جب یہ کہلوا بیٹھا کہ ہندو اور مسلمان کی تفریق ہماری رملہ میں حائل ہے تو نوجوان اس کا جواب یوں دیتا ہے :

جس جگہ عشق کی ہے جلوہ گری ہے وہ منزل دوئی سے پاک و بری
ان کے آگے جنہیں ہے عشق سے کام دین کیا چیز کفر کس کا نام
انہیں اسلام ہے رہنجاناں کفر ہے اس پہ خال ملک افشاں
غور کیجئے تو ہیں یہ دونوں ایک اس میں کب ہے تفاوت بدو نیک
ہے حرم کی اگر اڑاں ناموس دیر کا یہ وہ دار ہے ناقوس
خاتہ کعب ہو کہ کعبہ دیر یاں سوا ایک کے نہیں ہے غیر (۳۰۵)

۳۰۴ مشوی مرلیا سوز، ٹیکسٹ ۱۸۵۸ء

۳۰۵ ایضاً

پانچ مزید ملتی جلتی مشنویاں

ذیل میں پانچ مزید ایسی مشنویوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے جن میں عاشق و معشوق کا تعلق مختلف مذاہب سے دکھایا گیا ہے۔ اس سے پہلے سولہ ایسی مشنویوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان پانچ کو ملا کر اس قسم کے قصوں پر مبنی اُن اردو مشنویوں کی کل تعداد اکیس ہو جاتی ہے جو ہمارے علم میں ہیں۔

مثنوی حسن و عشق، راسخ

مثنوی سراپا سوز میں قاضی محمد صادق خاں، اختر (وفات ۱۲۷۵ھ) نے جو قصہ بیان کیا ہے اس سے ملتا جلتا قصہ راسخ عظیم آبادی (وفات ۱۲۳۸ھ) ان سے پہلے اپنی مثنوی ”حسن و عشق“ میں نظم کر چکے تھے۔

مثنوی کے شروع میں ”عشق عاقبت سوز“ کی تعریف ہے، جو تقریباً آٹھ سطحوں کو محیط ہے۔ چند اشعار جن میں ہندوستانی تلمیحات بڑی بے تکلفی سے استعمال کی گئی ہیں، ملاحظہ ہوں:

ہیں طرفہ فسون ترے فسانے سامع ان کے سبھی دوائے
آرام وطن دکن سے چھوٹا فل حیرے سبب وطن سے چھوٹا
جوگی بنا کاروہ تھ سے کھو بیٹھا وہ رنگ روپ تھ سے
بے چین ہوئی اُدھر لہ کام کھویا دونوں کا تو نے آرام

ایک نوجوان ایک ہندو لڑکی سے عشق کا دم بھرتا تھا۔ رفتہ رفتہ عشق کی لاگ بڑھنے لگی اور عاشق کے ہاتھوں سے نوبت رسوائی تک پہنچی۔ معشوق پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ آخر عاشق ایک دن کشاں کشاں محبوب کے آستان پر آیا۔ لیکن ناتوانی اور فقاہت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ سجدہ کرتے ہی روح پرواز کر گئی۔ معشوقہ کو معلوم ہوا تو وہ دوڑی ہوئی دروازے پر آئی اور:

آنکھوں میں ہوا جہان تاریک بیٹھی جا لاش کے دو نزدیک
سر زانو پہ اپنے اس کا رکھ کر کی ایک نگاہ یاس اس پہ
آنکھوں سے ہوئی وہ خون دل پاش اپنے اس شوق کشتہ کی لاش
یوں کھینچی بٹل میں تنگ اک دم ہو جاذب ریش جیسے مرہم
منہ پر رکھ اس کے منہ دیا جی عاشق پہ غرض فدا کیا جی

اختر نے اپنی مثنوی میں عاشق اور معشوق دونوں کو بالقصرح مختلف مذاہب سے دکھایا ہے۔ لیکن راجح نے فقط معشوق کی تخصیص کی ہے یعنی وہ ”دشت ہندو“ تھی۔ اس کے علاوہ راجح کے ہاں بداس کا بھی کوئی ذکر نہیں، جب کہ اختر نے اس قصے کی جائے وقوع بنارس بتائی ہے۔ اختر کی مثنوی میں بعض دوسرے اضافے یہ ہیں کہ لڑکی کے والد کو زرگر دکھایا گیا ہے اور نوجوان عاشق لڑکی کے عزیزوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ اس کے برعکس راجح کی مثنوی میں وہ کشتہ عشق خود بخود مر جاتا ہے۔ ان اختلافات سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ راجح کی مثنوی اختر کی نظر سے گزری تھی اور انھوں نے قصے میں بعض باتیں بڑھا کر اسے زیادہ دلچسپ طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔

راجح نے پہلے پہل اپنی یہ مثنوی لکھتے میں غازی الدین حیدر کو نذر کی۔ دوسری مرتبہ انھوں نے اس میں ایک طویل تہنید اور خاتمے کے دعائیہ اشعار بڑھا کر اسے ”سرکار کبھی انگریز بہادر“ کو پیش کر دیا۔ ”مثنویات راجح“ میں اصل مثنوی ۱۳ صفحوں میں اور اضافہ شدہ اشعار ۳۶ صفحوں پر شائع ہوئے ہیں^(۳۰۶) خاتمہ کے اشعار میں سے ’جو کبھی کی مدح میں ہیں‘ چند ملاحظہ ہوں:

روزی کی فکر سے ہوں حیراں ہے طبع مری بہت پریشاں
مدح فقط ہوں کبھی کا محمود ہوں کیوں نہ ہر معنی کا
یہ نذر اگر قبول ہووے مطلب دل کا حصول ہووے

مثنوی کشش عشق

راخ عظیم آبادی نے اپنی اس مثنوی میں ایک درویش اور راجپوتی کا درناک قصہ نظم کیا ہے۔ اس مثنوی کا تقریباً دو تہائی حصہ حمد و نعت و منقبت، مناجات، وصف عشق، مدح نواب، صفت ہزارہا، وصف عمارت، وصف مسجد، وصف امام ہازہ و غیرہ پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی پہلے نواب آصف الدولہ کو نذر کی گئی جن کی مدح میں تقریباً ایک تہائی اشعار صرف کیے گئے ہیں۔ لیکن حک و اضافہ کے بعد راخ نے اسی مثنوی کو لارڈ مینٹو سے منسوب کر دیا اور خود کو کمپنی کا خیر خواہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ میں دو ان راخ قلمی مکتوبہ ۱۲۲۳ھ میں یہ مثنوی اپنی اصلی شکل میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد نے اصلی متن کو تبدیل شدہ متن کے ساتھ ”مثنویات راخ“ میں شائع کر دیا ہے۔ (۳۰۷)

مثنوی ایک ایسے درویش کے ذکر سے شروع ہوتی ہے جو سوائے عشق کے دنیا کے تمام طوائف سے آزاد تھا۔ پھر پھر اتادہ بنداس میں آیا۔ یہاں ہر صورت ہوش رہا اور قصہ روزگار دکھائی دی۔

زہ شہر محسود باغ بہشت	زن و مردوب حور و غلام سرشت
ہر اک غیرت افزائے ماہ تمام	کرے صبح عاشق کو زلف ان کی شام
پڑے چشم جس گوشہ بام پر	خدا ہی کی آجائے قدرت نظر
لب بحر جاوے اگر کوئی داس	تو دیکھے عجب طرح کا اک ساس
ہر اک ست خیل پری دش زباں	بہم گرم ہاری و غوطہ زباں
کوئی دست بستہ سوئے آفتاب	کوئی شرمیلیں کوئی نہ بے حجاب
کوئی بانہ سے ہاتھوں کو سونا سے	کوئی کھولے زلفیں اک انداز سے

درویش نے بھی وہیں گنگا کے کنارے ڈیرا ڈال دیا۔ ایک دن راجا کی بیٹی وہاں

اشنان کے لیے آئی۔

نہاتی تھی خورشید انور کی طرح بدن اس کے جھمکے تھا گوہر کی طرح
عیاں نکس رو اس کا یوں آب میں نظر آوے خورشید جوں آب میں
بیاں کیا کردں اس کے جلوے کی لاگ کہے تو کہ لا کے ہے پانی میں آگ

قتدار اس درویش نے راجیکاری کو دیکھا اور لگا ہیں چار ہوتے ہی ہوش و حواس
ہار گیا۔ دن پریشانی اور راتیں بے خوابی میں گزرنے لگیں۔ راجیکاری ہر روز صبح
کے وقت گھاٹ پر آئی۔ درویش نظارے کی تاب نہ لاسکتا اور غش کھانکے گر
جاتا۔ لوگوں نے اسے بہت سمجھایا کہ کیوں ناحق روتے کڑھتے ہو۔ شاہ و گدا میں
میل کیسا۔ وہ عالی نسب تھے فرومایہ کو کیوں پوچھنے لگی۔ لیکن درویش بھی چراغ
محبت کا پروانہ تھا۔ راو عشق میں ثابت قدم رہا۔ جب یہ روز روز کا تماشا رسوائی
کی شکل اختیار کرنے لگا تو راجیکاری کی سہیلیوں نے مشورہ دیا:

تو اس تنگ کو درمیاں سے اٹھا یہ فتنہ نہ جانے کہاں سے اٹھا
بٹھا اس کو تو آبِ تدبیر سے مبادا یہ شعلہ بلندی کرے
کہ اس سے اگر مجھ پہ عاشق ہے تو یہ دعویٰ جو ہے اس میں صادق ہے تو
تو جا ڈوب دریا میں شکلِ حباب نہ کر جان کا صرف خاکہ خراب

غرض راجیکاری نے ایسا ہی کیا اور درویش یہ سنتے ہی:

ہوا مضطرب سا وہ اس جا کے سج کنارے پہ تھا یا کہ دریا کے سج
ہم آغوش موجوں سے جا ہو گیا نظر پھر نہ آیا کہ کیا ہو گیا

درویش کے ڈوب جانے کے بعد راجیکاری بھیگی سی محسوس کرنے لگی۔ اس کے
چہرے کا رنگ پیکا بن گیا۔ سہیلیاں اسے گھر لائیں۔ لیکن ہر لکھ اس کی بچاؤ
بڑھنے لگی اور کاشمیر غم سے وہ اندر ہی اندر گھٹنا شروع ہو گئی۔ ایک رات وہ بستر
خواب سے اٹھی، آئینے کے سامنے آئی اور:

گلی کہنے دل سے نہ ہو تو اواس کہ چلتے ہیں آج اس ستم کش کے پاس
 کیا شانہ ہر بار گیمو کے تئیں بنایا بہت زلفِ خوشبو کے تئیں
 حنا سے کعبہ دست رنگیں کیے بہت پائے نازک نگاریں کیے
 دایہ کو ساتھ لے کر یہ جگر تفتہ رات کے وقت گھاٹ پر آئی اور عین اسی جگہ
 موجوں سے ہم آغوش ہو کر غرق ہو گئی، جہاں درویش نے ڈوب کر جان دی
 تھی۔ اعزہ و اقارب کو پتا چلا تو گھر میں کھرام مچ گیا۔ دریا میں دام ڈالواے گئے۔
 بالآخر پختے بھر کی کوشش کے بعد دونوں کی نعشیں ایک ساتھ برآمد ہوئیں:

نہ کہہ مجھ سے راح کہ حیرت ہے یہ سری جان آخر محبت ہے یہ
 نہ حیراں ہو یہ کام ہیں عشق کے یہی کچھ تو انجام ہیں عشق کے
 مثنوی کا قصہ بس اتنا ہی ہے۔ لیکن شروع میں راح نے اس سے ڈمنے
 اشعار مدح و طیرہ پر صرف کیے ہیں، جو ایک عشقیہ مثنوی میں بالکل بے ربط
 معلوم ہوتے ہیں۔ راح نے مثنوی کے اس حصے سے ایک طولانی قصیدے کا کام
 لیا ہے۔ ان اشعار کو اگر حکایت والے حصے الگ کر دیا جائے تو بہائے خود ایک
 مدحیہ مثنوی کہے جاسکتے ہیں۔ راح کی عشقیہ مثنویوں کی یہ ایک عام کمزوری ہے
 کہ وہ اصل کی نسبت فرع پر کہیں زیادہ زور طبع صرف کرتے ہیں (مثال کے
 طور پر ملاحظہ ہو مثنوی نیرنگ محبت اور حسن و عشق) اس مثنوی میں بھی طویل
 تمہید کا اثر حکایت پر نہ اچھا ہے۔ نہ صرف یہ کہ مثنوی کے دونوں حصوں میں
 کوئی ربط و توازن نہیں، بلکہ قصے پر بھی پوری توجہ نہیں کی گئی اور تمہیدی اشعار
 کے انتہار میں قصے کی انفرادی حیثیت دب کر رہ گئی ہے۔ قصے کے انجام میں بھی
 کوئی ندرت نہیں۔ عاشق و معشوق کی نعشوں کا ایک ساتھ برآمد ہونا اس زمانے
 کے اکثر قصوں میں پایا جاتا ہے۔ خود راح نے اپنی ایک اور مثنوی ”جذب عشق“
 میں بھی موت کے بعد عاشق و معشوق کی یہی حالت دکھائی ہے۔ ان خامیوں
 کے باوجود قصے کی ایسے سادگی دل پر اثر کرتی ہے۔ راح نے ہمارے کے مقامی

ماحول کو کامیابی سے پیش کیا ہے اور وہاں کے گھر خوں کی تصویریں بھی بڑی خوبی سے کھینچتی ہیں۔ میر کی مشعوہوں کے قصوں کی طرح اس مشعوہ میں بھی واقعیت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ زبان صاف، سادہ اور سلیس ہے اور اس کی یہی خوبی اسے دہلوی شاعروں کی مشعوہوں سے قریب لے جاتی ہیں۔

مشعوہی راجہ و چیری

یہ مشعوہی جرأت کے مطلوبہ کلیات میں شامل نہیں، بلکہ کلیات جرأت کے رام پور اور پٹنہ کے قلمی فنون میں درج ہے۔ اس میں کل ۲۰۳ اشعار ہیں۔ آغاز یوں ہوتا ہے:

اٹھی درو الفت کر معایت مجھے اپنی بہت کر معایت

ایک راجا کی بہت سی چیریاں (کنیزیں) تھیں، لیکن وہ ان میں سے کسی پر ملکت نہ تھا۔ ایک دن وہ سیر کو گیا اور اس کی نگاہیں ایک ایسی عورت سے چار ہوئیں، جو محسن و مباحث میں چودھویں کا جائز تھی۔ راجا اسے دل دے بیٹھا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس کے بھائی کی کنیز تھی۔ راجا کی بے قراری دیکھ کر کنیز نے تحافل برتن شروع کیا اور وصال کے لیے یہ شرط رکھی کہ راجا سفر اختیار کرے اور جوگی رتن سین کا اتا پتا محفوظ رکھے۔ بالآخر راجا جوگی کی تلاش میں روانہ ہوا۔ راہ میں ایک دریا آیا۔ راجا کشتی میں بیٹھ کر دریا عبور کرنے لگا کہ بیچ تن کی یاد آئی اور وہ مسلمان ہو گیا۔ دوسرے کنارے پر راجا کی ملاقات ایک درویش سے ہوئی۔ اس نے بھارت دی کہ راجا واپسی پر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گا اور جوگی رتن سین کا سرخ مل جائے گا۔

شاعر نے قصے کو یہیں چھوڑ دیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر زندگی رہی تو باقی کہانی ختم کریں گے۔ قصہ بے رجا اور غیر دلچسپ ہے۔ شاعر نے اعتبار سے بھی اس میں کوئی خوبی نہیں۔ جرأت کی طبیعت کو سراپا نگاری سے خاص مناسبت تھی۔

اور انھوں نے اس موضوع پر بعض مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں۔ زیرِ نظر مشقوں میں بھی کئی کسرپا مفضل بیان کیا گیا ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ ماہ چہارہ تھی ایسی چہری اجالا کر دکھاوے جو اندھیری
سرپا آہ شکلِ برق تھی وہ غرض تاز و ادا میں غرق تھی وہ
ہند سے جوڑے کا عالم کہے کیا ہائے کہ ہر سو جن کا تھا دام بلا ہائے (۳۰۸)

مشق حسن و عشق، بسمل

بسمل فیض آبادی کی اس مشق کا تعارف ۱۹۳۹ء میں عبدالہادی آسی نے رسالہ اردو میں کرایا تھا۔ (۳۰۹) یہ مشق ۱۲۰۳ھ میں لکھی گئی۔ اس میں مجبور اور منوہر چند کے غیر فطری عشق کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ قصہ بسمل کو جواہر علی خاں خواجہ سرا نواب ناظر نے سنایا اور اسے نظم کرنے کی فرمائش بھی کی۔ اس میں بھی عاشق و معشوق کا تعلق باہم مختلف مذہب سے بتایا گیا ہے۔
بسمل کا پورا نام محمد جواد اور عرف مرزا لالہ تھا۔ ان کے والد حکیم علی حسین خاں اپنے زمانے کے نامی اور شاعری طیب تھے۔ بسمل بھی ایک وقت تک نواب آصف الدولہ کے دربار سے متعلق رہے۔ عبدالہادی آسی نے مشق حسن و عشق کے علاوہ ان کی ایک اور مشق پارساتامہ کا بھی ذکر کیا ہے، جو ۱۲۱۳ھ کی تصنیف ہے۔ بسمل ۱۲۱۹ھ تک حیات تھے۔

مشق حسن و عشق خاصی طویل ہے اور ۱۳۱۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز حمد و نعت اور جواہر علی خاں نواب ناظر کی مدح سے ہوتا ہے۔ قصہ یوں ہے: ایک سوداگر کا حسین و جمیل لڑکا مجبور نام، انجاکا عاشق مزاج تھا۔ آخر یہ سودا اتنا بڑھا کہ دیوانہ ہو کر گھر سے نکل گیا۔ مدتوں جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ ایک دن اتفاقاً اسے ایک روٹے پر خند آگئی۔ خواب میں ایک حسین نظر آیا،

۳۰۸ بکریہ ڈاکٹر گیان چند جین

۳۰۹ رسالہ اردو، جنوری ۱۹۴۹ء، ص ۶۵-۱۱۴

جس نے اپنا نام منور بتایا اور کہا کہ تجھے کچھ خبر بھی ہے، میں تیرے غم میں خراب و خوار پھرتا ہوں۔ منور چند ملک چنپاٹن کے راجا کالاکا تھا۔ اس نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا اور شوریدگی کے عالم میں شہروں شہروں پھرنے لگا۔ آخر اسی روئے کے قریبی گاؤں میں آیا۔ یہاں ایک ہیراگی کی بدولت اس کی ملاقات مجبور سے ہوئی۔ ہیراگی نے منور کے باپ راجا اتم چند کو پورا واقعہ سنایا اور نصیحت کی کہ یہ عشق کے اسرار ہیں۔ ان دونوں کو ہمیشہ ساتھ رکھنا۔ لیکن کچھ دنوں بعد لوگوں نے راجا کو بدگمان کر کے مجبور کو وہاں سے نکلوا دیا۔ اس کے جانے کے بعد منور بیمار ہوا اور مدق ہو گیا۔ بیٹے کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر راجا نے مجبور کو واپس بلایا، لیکن وقت نکل چکا تھا۔ بالآخر منور مر گیا۔ لوگ جب اسے چنایں رکھ کر جلانے لگے تو انھوں نے دیکھا کہ مجبور بھی ایک درخت سے لگا ہوا خود بخود جل کر خاک ہو گیا تھا۔

مثنوی کا قصہ غیر فطری ہے، لیکن یہ شاعر کا طبع زاد نہیں۔ بہل نے دراصل اپنے زمانے کی روش خاص کی پیروی کی ہے اور جس طرح یہ قصہ انھیں سنایا گیا، انھوں نے ویسے ہی اسے قلم کر دیا۔ فنی اور ادبی اعتبار سے یہ مثنوی کئی خوبیوں کی حامل ہے۔ بہل نے مجبور اور منور کی واقعت مزاحی، عشق کی صفات، ماں باپ کے اضطراب، سرپا اور بھرا کے بیان میں پورے طور پر زور قلم صرف کیا ہے۔ منظر کشی بھی نہایت عمدہ ہے۔ گو بعض جگہ طویل ہیں، لیکن ان سے مثنوی کی وحدت تاثر میں فرق نہیں آیا۔ شاعر کو زبان پر پورا عبور حاصل ہے اور اشعار شیریں، دل نشیں اور مرصع ہیں۔ نمونے کے طور پر یہ اشعار دیکھیے جن میں بیٹے کا اپنی ماں سے ہدا ہونا دکھایا گیا ہے :

یہ حالت دیکھ کر ماں چلپلائی	بکڑ دسب پر کو تھلائی
ہوا تھا رنگ چہرہ اس کا کای	سرپا نصیحت طمات چای
علم آرا ہوئی دیوانگی تھی	کھیب و مبر سے بیگانگی تھی

طلب کر اپنے ہر اک ہم نفس کو رکھ ان کے پاؤں کے اوپر جہیں کو
یہی کہتی تھی ان سے کھینچ کر آؤ عزیزو جاتا ہے میرا یہ دل غولہ
اگر سننے تو تم اس کو سنبھالو اسے چاہ محبت سے نکالو
مثنوی کے آخر میں بے ثباتی عالم کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ان اشعار کی
پختگی اور حسن کاری دیکھیے:

غیبت ہے اسے خالم کوئی دم یہ عرصہ زندگانی کا بہت کم
کہ طبع بزم ہستی آہ فریاد سدا رہتی ہے زہد و امن پار
جو آیا اس گزرگہ میں سو گزرا نہ وامق ہی رہا آخر نہ عذرا
نہ سودا ہی رہا ہے اب نہ یاں درد ملے جا کیسے کیسے خاک میں مرد
یہی خورشید ہووے اور یہی ماہ یہی وضع زمانہ اور یہی رملہ
کچھ اشیا سے یہاں کی کم نہ ہوویں یہ سب کچھ ہوں ہی ہوں اور ہم نہ ہوویں

مثنوی گلدستہ مسرت

غنی معانی علی خاک کی یہ مثنوی مطبع نظامی کانپور سے ۱۲۸۵ھ میں ۱۲
صفحات پر شائع ہوئی۔ اس کا سال تصنیف ۱۲۸۳ھ ہے۔ جیسا کہ ظہور علی ظہور
کے اس قلمہ تاریخ سے ظاہر ہے:

دیکھی جو مثنوی یہ ہم نے ظہور جس دم بے شبہ اس کو پایا گلدستہ مسرت
آئی یہ اپنے جی میں تاریخ اس کی لکھی دل نے کہا "بتایا گلدستہ مسرت"

۱۲۸۳ھ

اس مثنوی میں مسودہ (مطلع فتح پور، اتر پردیش) کا ایک سچا واقعہ بیان کیا
گیا ہے۔ اس کی تصدیق واحد علی وحید کے اس قلمے سے بھی ہوتی ہے جو مثنوی
کے آخر میں درج ہے:

وحید مشغولی جو یہ عطا علی نے کہی معاملہ ہے قریب جوار ہوا کا
 خنسن کا قصہ ہے روپا ہے اسکی جان عزیز یہ قصہ دید کے لائق ہے دل ہے شیدا کا (۱۵)
 مشغولی کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے۔ یہ ۱۴ اشعار پر مشتمل ہے۔
 اس کے بعد ۸ اشعار شاعر نے اپنے مرشد کی تعریف و توصیف میں لکھے ہیں۔
 چند یہاں درج کیے جاتے ہیں:

شاہ عبدالسلام فخر زماں زب اورنگ کشور عرفاں
 عابد حق شناس و ہا ایماں زاہد پاک و حافظِ قرآن
 جاے ہوا ہے اس سے رشک لرم عام ہیں اس کے فیض لطف و کرم
 قصے کے آغاز سے پہلے مصنف نے اپنے اُستاد کا ذکر یوں کیا ہے:

نام برہان دین ہام ہمیں بہر دین نبی دلیل متین
 بسکہ ہے پارسا وہ مرد خدا ہے تخلص بھی پارسا اس کا
 بالغ ہوا کی ہے بہار اس سے ہے مجھے پائے وقار اس سے
 عطا علی خاک نے سبب تالیف میں لکھا ہے کہ ایک دن ہوا میں وہ
 اپنے دوست و واحد علی وحید کے ہاں بیٹھے تھے کہ منظوم قصوں کا ذکر چل نکلا۔
 کوئی شیریں فرہاد کا نام لیتا تھا۔ کوئی لیلیٰ مجنوں کا قصیدہ پڑھتا تھا۔ کسی نے بیرو
 رانجھا کی داستانِ عشق بیان کی مگر عطا علی نے کہا کہ قدیم قصوں کو جانے دیجیے۔
 اب بھی جذبہ عشق میں حرارت باقی ہے اور عشق و محبت کا ایک درد انگیز واقعہ
 یہیں گزرا ہے:

کوئی مجنوں کا ذکر کرتا تھا کوئی لیلے و شوں پہ مروتا تھا
 کوئی کرتا تھا ذکرِ رانجھا و بیرو کوئی سکتے میں صورتِ دلگیر
 بولا میں بھی یہ سن کے قال و مقال ہے عبث قصہ کہن پہ خیال
 جذبہ عشق اب بھی باقی ہے جام رنگیں بدست ساقی ہے

ابھی اک ماجرا یہیں گزرا حال میں نے وہ سب بیان کیا
 سن کے وہ ذکر خوش ہوئے اکثر بولے کر نظم اسے سخن پرور
 اس کی خواہش ہر اک سعید نے کی کہ زیادہ مگر وحید نے کی
 اس کے بعد شاعر نے دعویٰ کیا ہے کہ اصل قصے سے وہ انحراف نہیں
 کرے گا:

نظم کرتا ہوں یہ نیا قصہ یعنی جس طرح سے کہ ہے گزرا
 کرتا ہوں حال واقعی تحریر لائیں اس کا یقین سفیر و کبیر
 آغاز قصہ کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ عطا علی خاک اس واقعے
 کے یحییٰ شاہد نہیں تھے بلکہ انھوں نے اسے کسی دوسرے سے سنا تھا۔

راوی معترف جہاں پایا کہ وہ نقل ہے اس فسانے کا
 مجھ کو اس طرح سے بتایا ہے کہ وہ آنکھوں سے دیکھ آیا ہے
 سوہ کے قریبی علاقے میں ایک گل فروش رہتا تھا۔ اس کی نوجوان بیٹی
 روپا اپنے حسن و جمال کی بدولت گاؤں بھر میں مشہور تھی۔ کم سنی میں اس کی
 شادی ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی گونا نہیں ہوا تھا اور وہ ماں باپ ہی کے گھر رہتی
 تھی۔ صبح و شام گاؤں کے کنویں سے پانی بھر لاتا اس کا معمول تھا۔ اس کنویں کے
 قریب زمیندار کے کارندے شیخ حسن کا مکان تھا۔ ایک دن ناگہاں دونوں کا
 سامنا ہوا اور روپا دل و جان سے حسن پر فدا ہو گئی۔

ہوش جاتے رہے نگاہ جو کی بل میا آسمان آہ جو کی
 تھی وہ یلی مگر بنی بھنوں چشم پیار سے وہ روئی خوں
 پانی چمڑکا نہ ہوش میں آئی اور بھی آگ اس نے بھڑکائی
 لائے گھر تک ولے جگر تھا بے کوئی بازو کوئی کمر تھا بے
 کی دوا جس نے جو کہ بھلائی یک آئی نہ کچھ توتائی

بڑھی دو دن میں ایسی بیماری جیسے برسوں کا کوئی آزاری
 نہ کھلا اس کا کچھ بھی راز بطون بڑھ چلا رفت رفت اور جنون
 آخر ایک ہم راز داہیہ کو ہمدرد و مونس جان کر روپا نے احوال دل بتا دیے۔ وہ اس کا
 پیغام لے کر حسن کے پاس گئی۔ لیکن حسن بدنامی کے خیال سے ملاقات کے
 لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے مشورہ دیا:

کس لیے در ہے مصیبت ہے کہ اسی طرح تھہ کو الفت ہے
 چاہ پے بہر آب روز آنا دیکھ کر مجھ کو گھر چلی جانا
 میں بھی دیکھوں تجھے بہانے سے لطف ہو ایسے آنے جانے سے
 زور سے دونوں کا نگارہ ہو کوئی جانے نہ اور اشارہ ہو
 کیا کروں ہے خیال بدنامی دیکھیے کیا کرے یہ ناکامی
 تو کمری جائے گی جفا کے ساتھ ہوں گا مشہور اس خطا کے ساتھ
 مگر وہ یہ بھی بڑی پرفتن تھی۔ وہ مکر و حیلے سے حسن کو روپا کے گھر لے ہی آئی۔

پھونکنے کے بہانے گھر میں گیا ہوئے اک جا دو مہر و ماہ لقا
 زندگی پائی جسم مردہ نے کھول دی آنکھ اس سرودہ نے

روپا عشق میں وارفتہ و بے خود ہو چکی تھی۔ اس نے حسن سے صاف
 صاف کہہ دیا کہ وہ اس کے بغیر ایک ہل بھی زندہ رہنے کو تیار نہیں۔ لیکن حسن
 روپا عشق کو وضع احتیاط سے ملے کرنا چاہتا تھا۔ وہ بغیر کسی قسم کا وعدہ کیے اپنے
 مکان پر لوٹ آیا۔ غرض اس کی بے اتفاقی سے روپا کی حالت روز بروز بگڑنے
 لگی۔ ملاحظہ ہو عطا علی خاک نے ان کیفیات اور حالات کو کیسی روانی اور برجستگی
 سے ادا کیا ہے:

ایک دن بھی نہ پھر قرار آیا قہر تھریا بدن بخار آیا
 دل میں کہنے لگی نہیں جو یار تو یہ جینا صہٹ ہے آخر کار

باپ ماں سے بہانہ کر کے اٹھی دل دھڑکتا تھا ہاتھ دھر کے اٹھی
کتنی تھی اپنے دل سے وہ تاداں جان کیا ہے اگر نہیں جاناں
جب نہ راضی کسی کا دلیر ہو پھر تو عاشق کو موت بہتر ہو
روپا کی دیوانگی اس حد تک بڑھ گئی:

چاہ میں ہو کے پاؤں اک بار مگر پڑی وہ کتوں میں آخر کار
بولیں پنہاریں یہ چلا کر کہ گری گل فروش کی دختر
دوڑی خلقت کتوں کے گرد آئی بھجے ہو گئے تماشائی
لوگوں کی بروقت مدد سے روپا کی جان بچ گئی۔ اس حادثے میں حسن کے اوسان
بجائے تھے۔ وہ دل ہی دل میں خوف زدہ تھا کہ کہیں راز عشق عیاں نہ ہو جائے۔
مگر روپا نے انتہائی ضبط اور رازداری کا ثبوت دیا۔

نہ کیا پر کچھ اس نے ذکر ذری سخت مہیوب کبھی پردہ دری
آئی تھی یاں پہ بہر آب کشی ناگہاں اتفاق سے ہوں مری
اس مقام پر عطا علی خاک اپنے تاثرات یوں پیش کرتے ہیں:

واہ محبوب ہو تو ایسا ہو اور مطلوب ہو تو ایسا ہو
غل کہاں کا تھا اور کہاں کی دمن دیکھو کیا کر گئے وہ غولہ دمن
پد منی کون تھی کہاں کا رتن مل گئے کیسے کیسے خاک میں رتن
یک دگر تھے فدائے یک دیگر نہ کھلا راز دل کسی پہ مگر

راہ وفاق میں روپا کی حاجت قدی اور عشق میں اس کی شوریدہ سری کا
حسن پر گہرا اثر ہوا۔ یاد پار غلط بن کر تپانے لگی اور آخر اس نے دایہ کے
دریے روپا کو اپنے مکان پر آنے کی اجازت دے دی۔ روپا کے دل کی سرلانہ
آئی۔ وہ موقع پا کر گھر سے بھاگ نکلی اور ماہ و مشتری ایک دوسرے کے قریب

آئے۔ نگلی محلے والوں کے خوف سے حسن نے آبادی سے دور ایک مکان لیا اور روپا کو اس میں ٹھہر لیا۔ مگر چند ہی روز میں روپا کے والدین کو اس کی خبر ہو گئی اور ایک دن جب حسن کام سے باہر گیا ہوا تھا، وہ روپا کو پکڑ کر زبردستی اپنے گھر واپس لے آئے۔ روپا سے کہا گیا کہ وہ حاکم شہر کے سامنے فریاد کرے کہ حسن نے اسے اغوا کیا ہے اور اس سے سخت بیدار ہوئی ہے۔ لیکن روپا اس کے لیے تیار نہ ہوئی۔ بلکہ یہ جواب دیا:

اس پہ ہو جاؤں دم میں بس قرباں کچھ میں شیریں نہیں نہ بھلے جاں
ہندہ عشق ہے تو جاؤں گی یا اسی کو یہاں بلاؤں گی
اس کے بعد وہ پھر موقع کی تاک میں رہی۔ غرض ایک رات:

فیند میں جب ہوئے وہ سب نافل بام پر آئی اپنا تھا پے دل
کودی یکبار جو شمش خوں سے جیسے نوئے ستارہ گردوں سے
چست و چالاک آئی پیش حسن غیرت گل سے گھر بنا گلشن
عید آئی بزم طے دونوں کہہ چلے اپنا اپنا غم دونوں (۳۱۰)

روپا نے اپنی وفا شعاری، بلند ہمتی اور ایثار کی بدولت حسن کو اپنا گرویدہ بنا ہی لیا تھا۔ دوسرے ہی دن محبوب نے عاشق کی خاطر مذہب تبدیل کیا اور دونوں کا نکاح ہو گیا۔ غرض اس طرح عشق نے اپنی راہ سے ساتھی رکاوٹوں اور مذہبی بندشوں کے کاٹنے نکال دیے اور:

مل گئی اپنے دلربا سے وہ جھوٹی رنج و غم و جفا سے وہ
دونوں جانب عجب کھام رہے وصل سے دونوں شاد کام رہے
عطا علی خاک اردو کے ان بد نصیب شاعروں میں ہیں، جو لطفِ سخن کے باوجود قبولِ عام سے محروم رہے۔ ان کی مثنوی میں لڑائی شان موجود ہے۔

قصے کو انھوں نے بڑی سادگی، سلاست اور روانی سے نظم کیا ہے اور بعض مقامات پر نہایت تکلف و شیریں اشعار بھی نکالے ہیں۔ واقعات کے تسلسل میں کہیں جھول نہیں۔ روپا کے کردار کو ایسی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے کہ اس کی سیرت کے بنیادی اوصاف نمایاں طور پر سامنے آ جاتے ہیں۔ لیکن ان خوبیوں کے باوجود یہ مشنوی مشہور تو کیا، غائبانہ اپنے حلقے میں معروف بھی نہ ہوئی۔

باب چہارم

ہند ایرانی قصے

ہند ایرانی قصے

مثنوی پھول بن

یہ مثنوی دکنی شاعر ابن نشاطی کا زندہ جاوید کارنامہ ہے۔ اسے مجلس اشاعرہ دکنی مخطوطات نے پروفیسر عبد القادر سروردی سے مرتب کرا کے شائع کر دیا ہے۔^(۱) پروفیسر موصوف اس کا سنہ تصنیف ۱۰۷۶ھ قرار دیتے ہیں۔^(۲) اٹلیا آفس کے مخطوطہ پھول بن میں اس مثنوی کا سال تصنیف ۱۰۶۶ھ بتایا گیا ہے^(۳) اور پھول بن کا یہی نسخہ سب سے قدیم ہے۔ اٹلیا آفس میں پھول بن کا ایک اور مخطوطہ بھی ہے، لیکن اس میں سنہ تصنیف درج نہیں ہے۔^(۴) پروفیسر سروردی کو حیدر آباد میں اس مثنوی کے جو چھ نسخے دستیاب ہوئے ہیں، ان میں سے چار میں سنہ تصنیف ۱۰۷۶ھ ہی درج ہے۔^(۵) ان نسخوں میں سے تین کتب خانہ سالار جنگ میں^(۶) ایک جامعہ عثمانیہ میں اور ایک کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہیں۔^(۷) ایک نسخہ آغا حیدر حسن کے پاس ہے۔ لواریہ ادبیات اردو میں پھول بن کے تین مخطوطے دریافت ہوئے ہیں۔^(۸)

- | | |
|---|--|
| ۱ | پھول بن، ابن نشاطی مرتب، عبد القادر سروردی، حیدر آباد ۱۹۳۸ء، تعداد صفحات ۱۱۹ / ۱۷۳ |
| ۲ | ایضاً، مقدمہ، ص ۱۲ |
| ۳ | علوم دہات اٹلیا نمبر ۱۰۳ |
| ۴ | ایضاً، مشمولہ "مجموعہ" نمبر ۱۲۲ |
| ۵ | پھول بن، مقدمہ، ص ۱۲ |
| ۶ | سالار جنگ، ص ۵۹۵ |
| ۷ | آصفیہ ج ۲، ص ۱۵۰۰ |
| ۸ | لواریہ ادبیات ج ۱، ۲۹، ج ۲ ص ۲۲۲ اور ۲۲۳ |

مشغی پھول بن کا ایک ایڈیشن حال ہی میں انجمن ترقی اردو، پاکستان نے بھی شائع کیا ہے۔^(۹)

ابن نثاطی کا پورا نام شیخ محمد مظہر الدین ابن شیخ فخر الدین تھا۔ وہ قطب شاہی سلطنت کے پایۂ تخت کوکنڈہ کا باشندہ تھا۔ پھول بن کے علاوہ اس کی کسی اور تصنیف کا بنورِ پنا نہیں چلا۔ وہ سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۵۳۵ تا ۱۵۸۳ء) کے دربار کا معزز عہدہ دار اور مشہور نثر نگار تھا۔ اس کا سنہ وفات پردہِ خفا میں ہے۔^(۱۰)

ابن نثاطی کی مشغی پھول بن ایک فارسی مشغی ”باتیں“ سے ماخوذ ہے، جیسا کہ اس نے ان اشعار میں صراحت کر دی ہے :

اچاں خوب یک تازہ حکایت ایچھے گا عشق کا جس میں روایت
باتیں جو حکایت فارسی ہے محبت دیکھنے کی آری ہے
اسے ہر کس کے تیں سکا کے قول بول دکن کی بات سوں سرزین کو کہ کھول^(۱۱)

جس مشغی ”باتیں“ کا ذکر ابن نثاطی نے کیا ہے، اس کا کوئی نسخہ ہندوستان یا یورپ کے کسی کتب خانے میں نہیں۔ لیکن پھول بن کو محض ترجمہ یا تلخیص نہیں کہا جاسکتا۔ قصہ ایرانی انداز کا ہے مگر اس میں جگہ جگہ شاعر کے مقامی ماحول کی جھلک ملتی ہے۔ منظر نگاری اور مرقع کشی کے رنگ تو تمام تر ہندوستانی زندگی سے ماخوذ ہیں۔ اس سے گمان گزرتا ہے کہ ابن نثاطی نے اصل قصے میں کچھ اضافے بھی کیے، جس سے یہ قصہ صحیح معنوں میں ہند ایرانی بن گیا۔ مشغی پھول بن کا قصہ یوں ہے :

شرق میں ایک شہر کنجن چن یعنی سونے کا نگر کہلاتا تھا۔ یہاں کے

۹ پھول بن مرتبہ شیخ چاندنا بن حسین، کراچی، ۱۹۵۵ء

۱۰ ایذا

۱۱ پھول بن حوالہ ماسبق، ص ۲۲

بادشاہ نے خراب میں ایک درویش کو دیکھا اور اس کا معتقد ہو گیا۔ آخر وہ درویش بادشاہ کو مل گیا اور دربار میں آکر بادشاہ کو روز سننے سننے قہے سناتے لگا۔ پہلا قصہ کشمیر کے بادشاہ کا ہے۔ اس کے باغ میں ایک نادر اور نہایت خوشبودار پھول تھا۔ ایک کالا بلبل روز آکر اسے چھیڑنے لگا۔ جس سے پھول مر جھا گیا۔ آخر بلبل کو پکڑ کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ دراصل نعتن کے سوداگر کا لڑکا ہے۔ پھول گجرات کے زاہد کی بیٹی ہے، جس سے اسے عشق ہو گیا تھا۔ زاہد نے ناموس کو برہا ہوتے دیکھ کر دونوں کو بددعا دی جس سے وہ اس شکل میں تبدیل ہو گئے۔ بادشاہ کو گل و بلبل کی حالت پر افسوس ہوا۔ اس نے آئیہ انکر سی پڑھ کر دونوں پر ایک خاص خاص انگوٹھی کو پھیر لیا۔ اس سے دونوں اپنی اصلی شکل میں آ گئے۔ شاہ کشمیر نے بڑی دھوم دھام سے ان دونوں کا بیاہ کر دیا۔ سوداگر کے بیٹے کو منصب و اعزاز سے نوازا اور وہ ہر روز نئے نئے قصوں سے بادشاہ کا دل بہلانے لگا۔ ایک راجا جو گیوں کا بڑا عقیدت مند تھا۔ جو گیوں نے اس پر مہربان ہو کر اسے نقل روح کا منتر سکھایا۔ راجا نے ایک کزور لمبے میں یہ منتر اپنے وزیر کو بتا دیا۔ وزیر مکار اور دھوکے باز تھا۔ ایک دن شکار کے دوران میں راجا نے تقریباً اپنی روح ایک مردہ بدن کے جسم میں داخل کی۔ وزیر نے فوراً اپنی روح راجا کے خالی جسد میں منتقل کی اور اس طرح دغا بازی سے سلطنت کا مالک بن گیا۔ راجا کی باعصمت رانی ستوتی نے جب راجا کی چال وصال میں فرق محسوس کیا، تو اس سے کہنے لگی۔ اوجھر اصلی راجا نے اپنے وزیر کی غداری دیکھ کر ہرن کا جسم چھوڑا اور توتے کی شکل اختیار کر لی۔ اس توتے کو نقل راجا یعنی وزیر نے خرید لیا۔ ایک دن موقع پا کر توتے نے اپنی رانی یعنی ستوتی سے بات چیت کی۔ جب اسے رانی کی وفاداری کا یقین ہو گیا، تو اس نے وزیر کی مکاری اور اپنا ماجرا کہہ سنایا۔ دونوں نے مل کر اسے ختم کرنے کی چال چلی۔ وزیر جب رات کو رانی سے اظہار محبت کرنے لگا، تو رانی نے کہا کہ اصلی راجہ تو نقل روح کا فن جانتا تھا، اگر تم وہی ہو تو سامنے کی مردہ قمری میں اپنی روح

مختل کر کے دکھلا۔ وزیر ہوس میں دیوانہ ہو رہا تھا، اس نے ایسا ہی کیا۔ تو تاک میں تھا، فوراً اپنے اصلی جسم میں آگیا۔ قمری کو ہلاک کر کے اسے پھینک دیا اور راجا پھر سر پر آرائے سلطنت ہوا۔

تیسرا اور آخری قصہ مصر کے شہزادے ہمایوں فال اور ملک مجسم کی شہزادی سمن پر کا ہے۔ دونوں کے دل عشق کے تیر میں چمکے ہوئے تھے۔ والدین کے خوف سے وہ اپنے اپنے ملک سے نکل کر ہندوستان میں پناہ گزین ہوئے اور ملک سندھ میں رہنے لگے۔ شاہ سندھ نے ایک ماہن سے سمن پر کے حسن و جمال کا شہرہ سنا تو ہوس کے ہاتھوں دیوانہ ہو گیا۔ وزیر سے مشورہ کر کے بادشاہ نے ہمایوں فال کو کشمیری کی سیر اور شراب نوشی کی دعوت دی۔ دعوت کے دوران شطرنج کا دور چلا، شہزادے کو مات ہوئی اور اسے دریا میں اتر کر کنول کا پھول توڑ لانے کو کہا گیا۔ شہزادہ جیسے ہی پانی میں اترا، ایک مچھلی نے اسے نگل لیا۔ شاہ سندھ نے شہزادی سمن پر پر ڈورے ڈالنے چاہے لیکن کامیابی نہ ہوئی اور سمن پر جو گن کا بھیس بدل کر شہزادے کی تلاش میں روانہ ہو گئی۔ شاہ مصر کو اپنے اکلوتے بیٹے کے دریا میں ڈوبنے کی خبر ملی تو اس نے سندھ پر دھاوا بول دیا۔ مصریوں کو فتح ہوئی۔ اپنی جاں بخشی کے لیے شاہ سندھ نے ایک طلسمی مچھلی کو حکم دیا کہ وہ شہزادہ ہمایوں فال کی خبر لائے۔ معلوم ہوا کہ جس مچھلی نے شہزادے کو نگلا تھا، وہ اسے جزیرہ سمن پر آنگھ آئی ہے اور اب شہزادہ پریوں کی قید میں ہے۔ اس دوران میں سمن پر شہزادے کی کھوج میں ایک پری ملک آرا کی مملکت میں پہنچی۔ اس نے مدد کا وعدہ کیا۔ جزیرہ سمن کے بادشاہ کو خط لکھے کہے۔ بالآخر پریاں شہزادے کو جزیرہ سمن سے واپس لے آئیں۔ شہزادہ اپنی محبوبہ سمن پر اور اس کے بعد اپنے والدین سے ملا اور ہر طرف خوشی کے شادیاں منجھتے لگے۔

اس قصے میں سنسکرت اور عربی فارسی قصوں کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ قصے میں قصہ پیدا کرنے کا اصول بید ہائے کی کہانیوں اور لطف لیلی سے لیا

گیا ہے۔ تمہیدی قصوں کے بعد جو داستانیں بیان کی گئی ہیں، ان میں بھی اسلامی اصل پر ہندی ہوندرکاری بڑی خوش اسلوبی سے کی گئی ہے۔ کچھ نچن، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، ہندوستان ہی کا کوئی شہر ہے۔ خواب میں درویش کا نظر آتا اور بادشاہ کا اس کی تعبیر چاہتا، قصہ گوئی کا ایرانی انداز ہے۔ پہلی کہانی میں میر قصہ نقشن کے سوداگر کا لڑکا ہے۔ لیکن قصے کی جائے وقوع کشمیر اور اس کی ہیر دین گجرات کے زاہد کی بیٹی ہے۔ دوسرا قصہ خالص ہندوستانی ہے۔ راجا کی جوگیوں سے عقیدت، روح کی منتقل مکانی اور پرمندوں کا انسانوں کی طرح باتیں کرنا، فلک سپ تھی، جیٹال بچھیری، بیچ تنز وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ تیسرا قصہ ایرانی انداز کا ہے۔ اس کا ہیر اور ہیر دین دونوں اسلامی ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن جس باغ میں ان دونوں کی ملاقات دکھائی گئی ہے، اس کا ذکر پڑھ کر ذہن بے اختیار ہندوستان کے قدرتی مناظر کی طرف منتقل ہوتا ہے:

دن کی مستی آتی کہ لالے کھڑے تھے بہت میں لے لے کے پیالے
ہرے ہور لال پہلے پات جھڑ کر چمن میں ہر طرف ہر ٹھار پڑ کر
بھنور پھولاں پو بیٹھے سود سے یوں کہ کچھ پر گل رنخاں کے خال ہے جیوں
پھریں پھولاں پہ بلبل کھول یوں بال کہ اڑتے ہیں چنگ جیوں شمع اپراں
ہتھیر بانہ پہلے پلکاں آئے کنواریاں کر منجھی کیاں ہامیس دیکھائے
ہونٹوں آئے سوراں ناچنے کوں کرے تھے لال طوطیاں پان کھاموں

شہزادہ اور شہزادی دونوں مصر و عجم سے فرار ہو کر ہندوستان میں پناہ لیتے ہیں اور شہر سندھ میں گنگا کے کنارے ایک محل میں رہنے لگتے ہیں۔ اس زمانے میں قاصدوں کی دوری کی وجہ سے غالباً ابن نشاطی کو شمالی ہند کے جغرافیے کا صحیح علم نہ تھا ورنہ وہ دریائے گنگا کو سندھ کے علاقے میں بہتا ہوا نہ دکھاتا۔ شاعر نے ملک سندھ اور دریائے گنگا کے منظر کو یوں بیان کیا ہے:

کہتے تھے تانوں اس کا شہر سندھ قرار یوں تھا کہ وہ ہے اصل ہند کر

تھے گھر پر کمریچے اس شہر میں ڈاٹ کر وہاں پارے کے نیں تھا غصے کوں ہٹ
 اتھا نیر اس ندی کا دودھ صاف مٹائی میں کرے دو شہد پر لاف
 خچل نیر اس ندی کا دیکھ جیوں شیا غیرت سوں دریا میں آپس کوں
 دیکھ اس آب رواں کوں شیطا بغداد پڑیا غیرت سوں جا دریا میں آزاد
 دیکھ اس میں خوب گن پیدا و پنیاں چھا ظلمات میں جا آب میواں
 حباب اچھے جو اس ابرار کے تھے مگر دیدے اولی الابصار کے تھے

شاہ سندھ اور بادشاہ مصر میں جنگ کے بعد شہزادی اپنے ”گوبرگم
 شدہ“ کی تلاش میں نکلتی ہے تو جوگن کی وضع اختیار کرتی ہے۔ ایسا بعض دوسری
 اُردو مشنویوں میں بھی پایا گیا ہے۔ مثلاً مشنوی سحر الہیان میں نجم القند مشنوی عالم
 (تصنیف نواب بادشاہ محل صاحبہ ۱۸۵۳ء) میں بزم افروز اور دل پذیر اور مشنوی
 لذت عشق میں بیدار بخت میر قصہ کا سراغ لگانے کے لیے یہی وضع اختیار
 کرتے ہیں۔ گاؤں گاؤں گھومنے کے لیے کسی عورت کا جوگن کی وضع اختیار کرنا
 قدیم ہندوستانی حالات میں مناسب ترین طریقہ تھا۔ ملاحظہ ہو، ابن نشاطی ایک
 ایرانی شہزادی کو ہندوستانی روپ میں کیسی کامیابی سے پیش کرتا ہے :

بھسوتی اپنے سوں کو پھر لگائی ہم کا چاند ہول میں چھپائی
 برو کے درد دک سوں پدھنی دو چلی ہواس لے ہراگنی دو
 پڑی ڈک غم کی آسینے آپر سل چلی پھرتی جنگل کی ہو کے کوکل
 یو بازک باز کی تاری نویلی یو بازک چھند کے چھب کی چھیلی
 کدھیں پھولاں اپر چلتی جو جاوے جھلے پاواں کوں آکر تھلاوے
 وہ ایسی باز کی تے ہاتھ دھو شوخ دیکھو نکل ہے کیوں پردیس تے شوخ

یہ جوگن جگہ جگہ اپنے دلبر کو تلاش کرتی ہوئی ایک جزیے میں پہنچتی
 ہے۔ یہاں سونے چاندی سے جگمگاتے ہوئے محلات میں طرح طرح کے نقش و
 نگار بنے ہوئے ہیں۔ شاعر جہاں ترکوں کی رزم کا منظر دکھاتا ہے، وہاں قلب

شاہیوں کی بزم کی تصویریں بھی پیش کرتا ہے :

کہیں ہنورے کہیں تیر کھسے تھے کہیں بلبل کوں پھولوں پر کھسے تھے
کھسے تھے قطب شاہاں کی کہیں بزم کھسے تھے ترکمان کی کہیں رزم
چڑھایا چھڑے تھے چھڑے تھے حیراں چین کے خاش سارے
ابن نشاطی کے دل میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔
مصر کا بادشاہ جب ملک سندھ پر چڑھائی کرتا ہے تو شاہ سندھ اسے وزیر کے
ذریعے کھلوا بھیجتا ہے :

ہمیں ہندی اگر جھڑے پہ آویں کھڑی میں بد مصریاں کوں بھگادیں
ہمارا فن ہے کرنا ترک بازی ہمارا کام ہے شمشیر بازی
دلیری میں جو ایسے ہیں دلیراں ان کو دیکھ جنگل پکڑے شیراں
نہیں چمک سوں کوں کام اس خار انوں کی بات سوں جھڑتی ہے انکار
اگر نکلیں جو لیں ہاتھوں میں بھالے وہی ہانچے خدا جس کو سنبھالے

مثنوی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن نشاطی نہایت
قادر الکلام شاعر تھا۔ حیرت ہے کہ ایسے صاحب کمال فن کار کا ابھی تک صرف
ایک کارنامہ معلوم ہوا ہے۔ قدیم دکنی معیار کی رو سے اس کی زبان ایسی صاف
اور انداز بیان ایسا سمجھا ہوا، پختہ اور بے رنڈ ہے کہ پھول بن کو اس کی اولین
تصنیف قرار دینے میں ہمیں تاثر ہے۔ دلی سے خوشتر کے تمام دکنی لہجہات میں
سوائے محمد تقی کے ابن نشاطی ہی ایک ایسا شیوا بیان شاعر ہے، جس کے کلام
میں آورد کا نام و نشان نہیں۔ اس کی طبیعت ایک ایسا چشہ ہے، جس سے شیریں
اشعار کا جھرنا ہمیشہ بہتا رہتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ پھول بن میں ۳۹ صنعتیں
استعمال کی گئی ہیں۔ اس کے پادشہ مثنوی کی زبان بڑی سادہ، سلیس، لکھتے اور
دکھتے ہے۔ جو لوگ دکنی شاعری سے لطف اندوز ہونے کا ذوق و شوق رکھتے
ہیں، وہ جانتے ہیں کہ زور تخیل اور روانی طبع میں نشاطی کا وجہی اور نواہی سے

کوئی مقابلہ نہیں۔ کہیں کہیں تو اس کا قد نصرتی سے بھی نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ الفاظ کا ساحر ہے اور ان کے مناسب ترین استعمال پر حیرت انگیز قدرت رکھتا ہے۔ دوسرے قصے میں راجا توتے کی شکل میں اپنی وفا شعار رانی کا امتحان لینے کے لیے پوچھتا ہے کہ اے گل گلشن خوبی! تیری جوانی کا رنگ کیوں برباد ہوا رانی آہ کھینچ کر جواب دیتی ہے کہ ”جب دیا نہ ہو تو رات کے سہاتی ہے۔ جب منہ میں پان نہ ہو تو چہرہ کیونکر بھلا لگتا ہے۔ فراق میں جان دینا آسان ہے لیکن پیا کے انتظار میں زندہ رہنا مشکل! پریشانی اور دوسے کا فکار ہوں لیکن محبت میں ثابت قدم ہوں۔ شمع کی مانند جھل رہی ہوں، مگر اپنی جگہ سے ٹلی نہیں۔“ اصل اشعار یہ ہیں:

کہ سب عالم لو پر روشن ہے پو بات	دیوا نہیں سو سہاویے کس سندھ رات
جو نہیں جس کے اچھے کاموں میں تنہا	وہ کیوں کر خوب دستاموں سوتوں بول
برہ میں جیو دنیا بھوت آساں	ہے جینا بیو بن مشکل مگر جاں
پریشانی میں گرچہ میں علم ہوں	محبت میں ولے ثابت قدم ہوں
اگرچہ شمع کے نئے جلی ہوں	ولے جاگے تے اپنے نہیں ٹلی ہوں

ان تشبیہوں اور استعاروں کی داونہ دینا ظلم ہے۔ جزئیات کے بیان، مکالموں کی بر جستگی اور مناظر کی تصویر کشی میں بھی ابن نفا علی اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اس کا زور طبیعت بلند اور پست کسی شے کو خاطر میں نہیں لاتا اور اس کے قلم میں بلا کی روانی اور برش ہے۔ اس کے اشعار دل سے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی آواز میں رس ہے اور اس کے زبان و بیان کا لہجہ، اس کی مدح و تہلیل اور سر بٹاپن دل پر گہرا اثر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پھول بن دکنی مشویوں میں امتیازی مقام کی مستحق ہے۔ شاعرانہ لطافت اور انداز و بیان کی خوبیوں کے باوصف اس مشوی کی عظمت کا ایک گوشہ یہ بھی ہے کہ اس میں ایک مخلوط قصہ پیش کرتے ہوئے ہند ایرانی معاشرے کے ذوق و احساس کو ملحوظ

رکھا گیا ہے۔ دکنی ادبیات میں ایسی مشنویوں کی کمی نہیں جو مقامی قصوں سے ماخوذ ہیں یا عوامی بنیاد کی روایات پر لکھی گئی ہیں۔ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک سے جو مخلوط معاشرت پیدا ہوئی تھی اور اس کا جو اثر اپنے زمانے کے قصوں پر پڑا، دکنی مشنویوں میں اس کی بھرپور اور کامیاب نمائندگی مشنوی پھول بن ہی کرتی ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سردری نے صحیح کہا ہے کہ پھول بن کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ شاعر نے قصے کو اپنے زمانے اور ماحول کے چوکھٹے میں بٹھایا اور اس میں اپنے گرد و پیش کے مخلوط معاشرتی کوائف کی جھتی جاتی تصویریں پیش کی ہیں۔^(۱۲)

مشنوی سحر البیان

میر حسن کی یہ مشنوی اردو ادب کا لافانی شاہکار ہے۔ میر حسن نے یوں تو کئی مشنویاں لکھیں، لیکن جو قبول عام سحر البیان کو نصیب ہوا اور کسی مشنوی کے حصے میں نہ آیا۔ یہ قول میر حسن انھوں نے اس کہانی میں اپنی عمر صرف کردی تب کہیں جا کے بڑھاپے میں یہ مشنوی لکھی گئی۔ (سنہ اختتام ۱۷۸۳ء / ۱۱۹۹ھ) چان گل کرائسٹ کی فرمائش سے ۱۸۰۳ء میں میر بہادر علی حسینی نے اس کو نثر میں منتقل کیا۔^(۱۳) کتب خانہ انڈیا آفس، لندن کی مطبوعہ ہندوستانی کتابوں کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ مشنوی میر حسن کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۰۳ء میں ۱۵۲ صفحات پر اور دوسرا ۱۸۰۵ء میں ۱۶۳ صفحات پر شائع ہوا۔ اس مشنوی کے ۱۸۰۳ء سے ۱۸۸۱ء تک کے ۱۹ مختلف ایڈیشن انڈیا آفس میں محفوظ ہیں۔^{(۱۴) (۱۵)} ۱۸۵۰ء میں مشنوی سحر البیان، نہال چند لاہوری کی نگل بکاؤلی

۱۲ عبدالقادر سردری، اردو مشنوی کا ارتقا، ص ۷۵

۱۳ بلوم ہارٹ، برٹش کتب ۱۱۳

۱۴ انڈیا مطبوعات، ص ۱۶۳

۱۵ بلوم ہارٹ، برٹش کتب ۱۱۳

کے ساتھ بمبئی سے شائع ہوئی۔ تب سے اب تک اس کے بے شمار ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

اس قصے کو مندرجہ ذیل مصنفین نے اردو میں ڈرامے کے طور پر لکھا:

- (۱) نوشیرواں جی مہربان جی، آرام^(۱۶) (منظوم)
- (۲) رونق بخاری (پارسی و کنوریہ تھیٹر یکل کمپنی) (۱۷)
- (۳) غلام حسین عرف حسینی میاں، ظریف^(۱۸)
- (۴) حافظ محمد عبداللہ (تمنائے دل پذیر آگرہ، ۱۸۸۹ء) (۱۹)
- (۵) فقیر محمد تنج^(۲۰)
- (۶) آغاے دہلوی (شکوہ عشق) (۲۱)
- (۷) فقیر محمد (بمبئی ۱۸۷۹ء اور ۱۸۸۱ء) (۲۲)

انگریزی سے اس کا ترجمہ C.E. Bowdler Bell نے ۱۸۷۱ء میں نکلتے سے شائع کیا^(۲۳) M.H.Court نے بہادر علی حسینی کی نثر سے انگریزی میں ترجمہ کیا جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۹ء میں نکلتے سے شائع ہوا۔^(۲۴)

مثنوی سحر البیان کا ہندی ترجمہ آگرہ سے ۱۸۶۳ء میں^(۲۵) اور نکلتے سے

۲۱	اردو ڈرامہ عشرت رحمانی، ص ۱۸۳ اور ۲۰۴
۱۷	ایضاً، ص ۲۱۲
۱۸	ایضاً، ص ۲۲۰
۱۹	ایضاً، ص ۲۲۶ اور اظہار مطبوعات، ص ۹۹
۲۰	ایضاً، ص ۲۲۶
۲۱	صدیق، ص ۷
۲۲	اظہار مطبوعات، ص ۹۹
۲۳	بلوم ہارٹ برٹش کتب، ص ۱۱۳
۲۴	بلوم ہارٹ، برٹش فیئر ۱۶۷، اس کا پہلا ایڈیشن ۱۷۷۱-۱۸۷۱ء میں الز آباد سے شائع ہوا
	مقالات دہلی ص ۲۱۱
۲۵	ہندی کتب برٹش، کالم ۶۵

۱۸۸۱ء میں (۲۶) کشائے ہوا۔ ”نگہیت بدر منیر“ کے نام سے یہ مہر تھ سے بھی ۱۸۷۶ء میں چھپا۔ (۲۷) پنجابی زبان میں اسے امام الدین نے ”قصہ بدر منیر“ کے نام سے منتقل کیا۔ یہ ترجمہ اردو رسم الخط میں لاہور سے ۱۸۷۷ء میں شائع ہوا (۲۸) پشتو زبان میں مشنوی میر حسن کا منظوم ترجمہ ملا احمد قراہی نے کیا۔ یہ کتاب نرگ سے ۱۸۸۲ء شائع ہوئی۔ (۲۹)

مشنوی کا قصہ ساوہ اور مختصر ہے: کسی شہر مینو سولا کے بادشاہ کے ہاں بڑی منتوں اور سراووں سے لڑکا پیدا ہوا۔ بے نظیر نام، حسن و جمال سے ہمراہ مند تھا۔ نجومیوں نے چشبین گوئی کی کہ یہ بارہ سال کی عمر میں رنج و تعب میں گرفتار ہوگا۔ بارہویں سال کی آخری رات کو شاہزادہ کو شے پر چاندنی میں سویا ہوا تھا کہ ایک پری لاجر سے گزری۔ صورت دیکھتے ہی فریفت ہو گئی۔ اور شاہزادے کو تخت پر اڑا کر پرستان لے آئی۔ شاہزادہ ایک رات پری کے دیے ہوئے گل کے گھوڑے پر سیر کرتا ہوا سراو پ جا نکلا۔ یہاں اس کی نظریں سراو پ کے بادشاہ مسعود شاہ کی گل اندام بی بی بدر منیر سے چار ہوئی۔ دونوں گرفتار عشق ہو گئے۔ لاجر ایک دیو نے پری کو اس واقعہ کی خبر کردی اور پری نے اس جرم کی پاداش میں شاہزادے کو ایک کنویں میں قید کر دیا۔ بدر منیر کی سہیلی وزیر زادی نجم النساء بے نظیر کی تلاش میں جوگن بن کے نکلی اور جنوں کے بادشاہ کے بیٹے فیروز بخت کی مدد سے بے نظیر کو رہا کروا لائی۔ سب کے نرے دن پھرے۔ چھڑے ملے۔ بے نظیر کا بدر منیر سے اور فیروز بخت کا نجم النساء سے بیاہ کیا گیا اور بے نظیر خوش و خرم وطن لوٹ آیا۔

میر حسن کی چادو بیانی اور سحر طرازی نے قصے کو واقعی سحر الہیائی بنا دیا۔

۲۶ اطرا ہندی، ص ۶۸

۲۷ ہندی کتب برقی، کالم ۱۱

۲۸ اطرا پنجابی، ص ۱۸ نیز پنجابی کتب برقی کالم ۲۲

۲۹ پشتو کتب برقی کالم ۲۱

میر حسن نے نئی طرز اور نئی زبان کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ صحیح بھی ہے۔ زبان نئی اس لیے کہ جس زمانے میں یہ مثنوی لکھی گئی، لکھنؤ کے شاعر دبستان دہلی کی شیریں بیانی اور سادہ گوئی کی روشوں سے مخرف ہونے لگے تھے۔ نئی طرز اس لیے کہ یہ نہ کسی فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے اور نہ کسی ہندو کے قصے پر مبنی ہے۔ میر حسن کا قصہ طبع زاد ہے اور اس کا رنگ و آہنگ مخلوط تہذیب و معاشرت سے لیا گیا ہے۔ حیرت و استعجاب کا عنصر پیدا کرنے کے لیے میر حسن نے قصے کی جائے وقوع کو سینہ راز میں رکھا ہے۔ بے نظیر کا باپ کسی ”شہر مینو سواد“ کا بادشاہ تھا۔ یہ شہر کون سا ہو سکتا ہے، مثنوی کے ان اشعار پر نظر ڈالتے ہی اس کا جواب مل جاتا ہے:

عمارت تھمی گچھ کی دہاں پیشتر	کہ گزرے صفائی سے جس پر نظر
کہیں چاہ شمع کہیں حوض و نہر	ہر اک جا پ آب لطافت کی لہر
کروں اس کی وسعت کا کیا میں بیان	کہ جوں اصفہاں تھا وہ نصیب جہاں
ہنرمند داں اہل حرفہ تمام	ہر اک نوع خلقت کا تھا ازدحام
یہ دلچسپ بازار تھا چوک کا	کہ غصیرے جہاں پر دہیں دل لگا
جہاں تک کہ رستے تھے بازار کے	کہے تو کہ دستے تھے گزدار کے
کہوں قلعہ کا اس کے میں کیا شکوہ	مئے دب بلندی کو دیکھ اس کی کوہ

قلعہ، بازار، چوک، شہر ان کا ذکر آتے ہی ذہن فوراً دہلی مرحوم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ مثنوی کا دوسرا منظر سراندیپ کا ہے، جہاں بے نظیر اور بدر منیر کی ملاقات ہوتی ہے۔ یہ نام بھی محض خیالی ہے ورنہ دہاں کے قدرتی نظاروں اور معاشرت و تمدن سے بھی اہل دہلی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ بدر منیر کا لباس اور پہناوا قلعہ معلیٰ کی شہر لویوں کا سا ہے۔ ہندوستان کی آب و ہوا کے مد نظر یہ لباس عربی و ایرانی لباس کے مقابلے میں نازک تر اور ہلکا پھلکا ہے۔ آب و ہوا کی پشتلا، جالی کی حجاب سی اوڑھنی اور جواہر نگار ہار یک کرتی،

زیرِ دروں میں بازوؤں پر ڈھلکے ہوئے نورِ تن اور بھجند۔ گلے میں جڑوا ہار اور ڈھکڈکی، کانوں میں کرن پھول اور ہالیاں، نیچے موتی کے دو لڑے اور پنج لڑے، چپاکی چمکتی ہوئی، زمرہ کی کینچی اور پاؤں میں بھجئے۔ یہ سب سنگار ہندی عورت کی تصویر پیش کرتا ہے۔ بدر منیر کی چوٹی میں کنارہ ہے، ماتھے پر ٹیکا، آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پر مستی اور پان کا لکھونا:

وہ مسی وہ اس کے لب لعل فام	سوار دیار بدخشاں کی شام
وہ آنکھوں کا عالم وہ کاجل غضب	کہے تو پڑی نرگسجاں میں شب
لکھونا وہ پانوں کا مستی کے ساتھ	کہ جوں دامن شب شفق کے ہو ہاتھ
وہ پشوا اک ڈانگ کی چمکتگی	ستاروں کی تھی آنکھ جس پر لگی
وہ اک سوڑھنی چالی مقیش کی	پڑی چاندنی سی مے پیش کی
جو دیکھے وہ انگیا جواہر نگار	فرشتے ملے ہاتھ بے اختیار
وہ باریک کرتی مثال ہوا	عیاں سو بہو جس سے تن کی صفا
ڈانگ سرخ نیچے کی ابھری ہوئی	کلاہی سی گرد ایک تہ دی ہوئی
بھری مانگ موتی سی جلوہ کنایاں	نمایاں شب حیرہ میں کھنکھایاں
وہ ماتھے پہ نیچے کی اس کے جھک	سحر چاند ستاروں کی جیسے چمک
وہ بالے کی تابندگی زیرِ گوش	جسے دیکھ از چائیں بکلی کے ہوش
وہ بھجئے پہ چپاکی کی بھین	کہ سورج کے آگے ہو جیسی کرن
وہ چھاتی پہ الماس کی ڈھکڈکی	رہے آنکھ سورج کی جس پر جھکی
وہ موتی کے مالے لٹکتے ہوئے	رہیں دل جہاں سر چمکتے ہوئے
وہ بھجند بازو کے اور نورِ تن	کہ جوں گل سے ہو شاخ زیرِ چمن
وہ کینچی زمرہ کی اور دست بند	نراکت میں بھی شاخ گل سے دو چند
وہ پانوں کی بو رشک منگ تھن	وہ ڈوبا ہوا عطر میں حیران

اور یہ صرف پہناوے یا سلاہ آرٹس ہی میں نہیں، بلکہ سارے کاسمارا بن سہن

ہندوستانی ماحول کی تصدیق کرتا ہے۔ بے نظیر، بدر منیر سے ملاقات کے لیے بارغ میں آنے والا ہے۔ ملاحظہ ہو، میر حسن نے اپنے زمانے کے دیوان خانے کی کیسی جچی تصویر پیش کی ہے:

بچھا فرش اور کر چھپر کھٹ کو صاف مرصع کا اس پر لڑھا کر خلاف
دھری کیا ریاں اک طرف بے شمار جتنی اک طرف ڈالوں کی قطار
چھپر کھٹ کے پاس اک مستند بچھا اور اس پر قنای کے عجبے لگا
چنگیریں بنا اور رکھ پاندان قرینے سے اس میں رکھے ہارپان
کئی عطر داں داں مرصع دھری انوکھی کڑت کے کئی چو کڑے
دھرا اک طرف جھنڈ خوش قماش دھری اک طرف چو پڑ غم تراش
جھمی ایک چوکی، پڑا تودہ پوش کریں دیکھ کر غش جسے بادہ نوش
ایک اور مقام پر بدر منیر کے گھر کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

درد کا موڑھا چمن میں بچھا وہ بیٹھی عجب آن سے دل رہا
غواں ایک ہڈ لیے تھی کڑی کہ لالے کی جتنی تھی اس میں پڑی
وہ شیشہ کا ہڈ مرصع کا کام مفرق زری کا وہ بچے تمام
کوئی سوہ جہل لے کوئی بیک دان کوئی لے چنگیر اور کوئی ہار پان
رہلی چھیلی بنی تھک و چست لباس اور زیور سے ہر اک درست
کڑی نیچی آنکھیں کیے بالادب اسی شرم سے پر قیامت غضب
یہ خواہیں، کتیریں، لوطیاں، مظاہیں وغیرہ سب کی سب ہندوستانی ہیں اور
مقار دھن سہن کی جھک پیش کرتی ہیں۔ ان کے لباس، پوشاک، نشست و
برخواست اور آداب و ادب و اخلاق و معاملات کی اس معاشرت کی یاد دلاتے ہیں جس
میں ایرانی اور ہندی رنگ مل جل کر ایک ہو گئے تھے۔ میر حسن کے شعر آفریں
غم نے ان مرقعوں کے نقوش ایسی چابک دستی سے نمایاں کیے ہیں کہ ان کی
رجحین اور دلکشی ہمیشہ کے لیے قائم ہو کے رہ گئی ہے۔

جہاں تک عشوی کی حیثیت و ترتیب کا تعلق ہے سحر البیان میں فارسی مشنویوں کا مجموعہ کیا گیا ہے۔ ابتدا میں حمد و نعت اور اس کے بعد ”مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات“ کا عنوان ہے۔ شاہ عالم کی مدح میں چند شعر ہیں۔ پھر آصف الدولہ کی مدح سرائی ہے اور شاعر اپنے مجز و انکسار کے ذکر سے قصہ شروع کرتا ہے۔ فارسی مشنویوں کی طرح قصے کے ہر نئے بیان کا عنوان ہے اور اسے ساقی نامے کا التزام رکھتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ افراتو قصہ کے نام بھی ایرانی ہیں۔ بے نظیر، بدر منیر، فیروز بخت، بنم النساء، ماہ رخ، مسعود شاہ، لیکن ان کا طریق زندگی، طرز معاشرت، آداب و اطوار اور کردار و گفتار مقامی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ بادشاہ اپنے بیٹے کی امید میں بیٹیں مانتا ہے اور مسجدوں میں جا چاکر دیے جلاتا ہے۔ بیٹے کی پیدائش پر شہنائی اور قرنا بھایا جاتا ہے۔ بھاڑ اور بھکڑوں کا ہجوم ہے۔ خواصوں اور خوجوں کو جوڑے دیے جاتے ہیں اور مشائخ اور عیرو زلوں کو جاگیریں تقسیم ہوتی ہیں۔ پھر بے نظیر کا زانچہ بنانے کو جہاں رنیل اور نبوی بلائے جاتے ہیں وہاں برہمن بھی پوحتی کھولے گرد اور پختہ کا حساب لگاتے نظر آتے ہیں۔ بے نظیر جب پاؤں چلنے لگتا ہے تو اس کے نام سے بروے آزلو کیے جاتے ہیں۔ یہ سب رقصیں ہندوستانی مسلمانوں کی ہیں۔

بے نظیر کے باغ میں ایرانی اور ہندی پھول پھل ایک ساتھ بہار دکھلاتے ہیں۔ ایک طرف اگر لال، شبو، اشرفی، جعفری اور گیندا اپنے جلوہ صد رنگ سے آنکھوں کا نور بڑھاتے ہیں تو دوسری طرف چنبیلی، موتیا، دن بان، رائے تل اور موگرا بھی مشام جاں کو معطر کیے دیتے ہیں۔ چپا کے جہاز کے جہاز الگ کھڑے ہیں۔ مونسریوں اور کیلوں کی چھلوں میں آنکھیں لگی جاتی ہیں۔ درختوں پر بگے اور منڈیروں پر مود جھنگرتے ہیں۔

شہزادے کے بارہ سالہ ہونے پر سواری یوں نکلتی ہے گویا کسی مغل بادشاہ کی تخت نشینی کا جلوس چارہا ہے۔ شہنائی و نوبت کی صدا، گھوڑوں پر فگارچی، پھر تیلے کھار، تاش کی پکڑیاں، ذرہت کی کرتیاں، مقیش کے جھلکتے

ساتھ، چوہدر اور جلوہ دار، قلعے سے شہر تک ہاولے کی جھلک اور تھالی سے منڈھے ہوئے در و دیوار۔ یہ سب وہ نظارے ہیں جن سے دہلی کے کوچہ و ہاں نا آشنا نہیں۔

نجم انسا کا بے نظیر کی تلاش کے لیے جوگن کی وضع اختیار کرنا خاص ہندوستانی تخیل ہے۔ میر حسن نے اسے ملنے جھٹکے، سیلی، سرن، یک تارے مندرے، مرگ چھالا وغیرہ تمام ضروری ساز و سامان سے لیس دکھایا ہے۔

ہندوستانی موسیقی کی تانوں اور ارباب نشاط کا ذکر مثنوی میں بے نظیر کے پیدا ہونے، عیش ہائی کے بھرا کرنے اور شادی کی محفل آراستہ ہونے کے موقعوں پر آیا ہے۔ ان مقامات پر میر حسن نے ہندوستانی طوائفوں، رقاصوں اور گیتجیوں کے تک سب اور اعزاز و اطوار کی جو تفصیل پیش کی ہے، وہ بے مثل ہے۔ مثنوی میں جن سازوں اور راگ راگینیوں کا ذکر آیا ہے، یہ ہیں: پریم جوگ، بھنگی، پرطو، دھرپت، گیت، گوری، کدرا، ٹپا ٹھکری، امین وغیرہ۔

ساز: شہنائی، اراتا، گورے، ترسٹی، قرینہ، کمرج، بھانج، طبلہ، مردنگ، ٹھٹھکر، پکھراج، ڈھول وغیرہ۔

شادی بیاہ کی رسموں میں تو ہندوستانی مسلمانوں کی شاید ہی کوئی رسم ہو، جو میر حسن نے نظم نہ کی ہو۔ بے نظیر کی برات کا نقشہ بالکل ہندوستانی شادی براتوں کا سا ہے۔ آتش بازی کی رونق، باجوں کا شور، روشنی کی چمک دک، دلہن کے گھر برات کی پیشوائی، بھرا، گھوڑیاں، شہانے، سہ منوں کے تڑاکے، آرسی مصحف، سروج پھول، نبات چھوٹا، ٹوٹے سلونے، منڈھا اور رخصتی غرض ایک ایک رسم گن گن کر بیان کر دی ہے۔

مثنوی سحر الہیان میں میر حسن نے ایرانی طرز کا قصہ بیان کیا ہے۔ لیکن لوح سے قسمت تک اس میں کوئی مقام ایسا نہیں جہاں اجنبیت کا احساس پیدا ہو۔ بے نظیر اور بد مزید متاخرین مغلوں کی تہذیبی شائستگی اور معاشرتی لطافت اور نفاست کی کامیاب ترجمانی کرتے ہیں۔ شہر میٹو سولہ سے پرستان اور پرستان سے

سرانند پتک ہر جگہ ہندوستانی زندگی کا سونا پھٹکا ہوا ہے۔ یہاں کے قدرتی نظارے، باغات، روشیں، نہریں، پھول پھل، تخت رواں، نوبت اور روشن چوکیاں، جلوں کی پاکلیاں، رتھ، ہاتھی، ٹوٹے کرتی ہوئی عورتیں، قہقہے لگاتی ہوئی سہ خنیں وغیرہ ہر منظر جانا پہچانا معلوم ہوتا ہے۔ مثنوی سحرالبیان کی حیرت انگیز مقبولیت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ میر حسن نے اپنے زمانے کی مخلوط معاشرت اور تہذیب و تمدن کی کامیاب عکاسی بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے کی ہے۔

مثنوی گلزار نسیم

دیا فکر نسیم (۱۸۱۱ء-۱۸۳۳ء) کی مثنوی گلزار نسیم، گل بکاؤلی کے مشہور قصے پر مبنی ہے۔ اس قصے کی اصل کے بارے میں بہت کم معلوم ہے۔ اصغر کوٹروی (۳۰) اور عبدالقادر سروروی (۳۱) قصہ گل بکاؤلی کو ہندوستانی الاصل قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ بیان محض نظر ہے۔ ایرانی داستانوں سے ملتے جلتے واقعات کی موجودگی میں اس قصے کو ہندوستانی الاصل قرار دینا ادبی تحقیق کے خلاف ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے، اس قصے کا تعلق ہندوستان کی کسی مذہبی، قوی یا عوامی روایت سے نہیں، نہ یہ کسی سنسکرت کتاب سے ماخوذ ہے۔ اس قصے کو بھینٹا ایرانی بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کے ایک حصے میں ہندوستانی لوک کہانیوں سے ملتے جلتے واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ دراصل یہ ایک مخلوط قصہ ہے، جس کی تشکیل قصے کہانیوں کی ملی جلی ہند ایرانی روایتوں سے ہوئی ہے۔ ہندو مسلمانوں کے اختلاط سے ہندوستان کی لوک کہانیاں، قصوں یا داستانوں پر جو اثرات پڑے، یہ قصہ ان کی ایک دلچسپ مثال ہے۔

۳۰ یادگار نسیم مرتبہ اصغر، مقدمہ ص ۱۱

۳۱ اردو مثنوی کا ارتقاء، ص ۱۱۵

فارسی نسخے

۱۔ گل بنگالی از عزت اللہ بنگالی، ۱۱۳۳ھ (۳۲)

مجھے کا بیان ہے کہ عزت اللہ بنگالی نے قصہ گل بنگالی اپنے ایک دوست محمد کی فرمائش پر ”ہندوستانی زبان“ سے فارسی میں منتقل کیا۔ ترجمے کا کام ۱۱۳۳ھ یا اس سے پہلے شروع ہوا۔ لیکن ابھی یہ مکمل نہ ہوا تھا کہ ناگہانی طور پر محمد کا انتقال ہو گیا اور عزت اللہ بنگالی نے یہ قصہ کیم ذی الحجہ ۱۱۳۳ھ کو ختم کیا۔ (۳۳)

۲۔ مثنوی رفعت (قصہ گل بنگالی) (۳۴)

۳۔ مثنوی از فرحت (اواخر بارہویں صدی ہجری) قلمی نسخہ کیمبرج یونیورسٹی (۳۵) یہ غالباً فرحت عظیم آبادی ہی ہیں، جو راج عظیم آبادی کے شاگرد تھے اور ۱۱۹۱ھ میں فوت ہوئے۔ (۳۶)

استدراک: ۱۱۹۱ھ میں مرنے والے فرحت، راج کے شاگرد نہ تھے۔ راج کے شاگرد کا نام خواجہ فیض اللہ ہے۔ (۳۷) ۱۱۹۱ھ میں مرنے والے فرحت کا نام فرحت اللہ تھا اور یہ خان آرزو کے شاگرد تھے۔ (۳۸) مثنوی والے فرحت ان سے مختلف ہیں۔

۳۲ مجھے نمبر ۸۲۸ اور ۸۲۹، یزید بن کمالک مں ۹۹۶ (مکمل پلاٹین مں ۱۲۹۰)

۳۳ اپنا

۳۴ مبارک اگست ۱۹۳۶، مں ۱۳۰ باگی مں راج ۷، مں ۱۸۵

۳۵ مکمل مضامین ہاشمی، مں ۳۳۸

۳۶ نثری داستانیں، ۱۶۲

۳۷ مثنویات راج تقدیر، مں ۱۰۲

۳۸ خلی شعراء، مں ۳۶۳

اُردو نسخے

۱۔ دکنی نسخہ مکتوبہ ۱۰۳۵ء، مصنف نامعلوم۔ پارو خانہ اودھ کے شاہی قطب خانے میں تھا^(۳۹) غالباً فارسی، اُردو میں قصہ گل بکاولی سے متعلق یہ قدیم ترین نسخہ ہے۔

مثنوی گل بکاولی دکنی نسخہ، تعداد صفحات ۱۳۰، فی صفحہ ۱۵ ابیات۔

آغاز:

سنو ناں ہوں اک شہر کا تاجدار دھری مال ہو ر مملکت بے شہر^(۴۰)

۲۔ مثنوی تختہ مجلس سلاطین۔ اشپرا نگر نے اس مثنوی کے نام کو تاریخی قرار دے کر اسے ۱۱۵۱ھ کی تصنیف بتایا ہے^(۴۱) حالانکہ اس سے یہ اعداد برآمد نہیں ہوتے۔

۳۔ مثنوی تختہ مجلس سلاطین، اسے اشپرا نگر نے کانپور کے کسی ذاتی کتب خانہ میں دیکھا تھا۔ تعداد صفحات ۳۶۲، فی صفحہ ۱۱ اشعار، آغاز:

حمد کر اس خدائے یکتا کی چشم دل تیری جس نے دنیا کی^(۴۲)

۴۔ مثنوی گل گشت معنوم یا غیبان ریحاں۔ از ریحان الدین ریحاں۔ تقسیم ہند سے پہلے یہ مثنوی کتب خانہ انجمن ترقی اردو، ہند میں تھی۔ اب یہ مثنوی انجمن میں نہیں ہے۔

آغاز:

ساقی میں تری ادا پہ قرباں صدقے سے وجام کے مری جاں^(۴۳)

۳۹ اشپرا نگر، ص ۶۳۵ نیز داسی، صفحات ۱۵۶

۴۰ ایضاً، ص ۶۳۳ اور ۶۳۵

۴۱ ایضاً

۴۲ ایضاً

۴۳ ایضاً

مثنوی خیابانِ ریحان کا تاریخی نام ”باغِ دیہار“ ہے۔ (۳۴) اس سے سالِ تالیف ۱۲۱۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ اشیرانگر نے ۱۲۱۲ھ لکھا ہے (۳۵) جو غلط ہے۔ مصنف ”مثنویات“ نے اس کا تاریخی نام ”باغِ دیہار“ بتایا ہے۔ (۳۶) یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ اس سے ۱۲۱۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ نومبر ۱۹۰۸ء کے رسالہ مخزن لاہور میں ریحان کی اس مثنوی پر مفصل تبصرہ شائع ہوا تھا۔ یہاں نمونے کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

اتھ بیٹھی بکھڑی چنگ پر مانند طلوع مہر - خاور
جس جا کہ نہ ہو صبا کو جرأت لے جاوے چرا کے گل کو تہمت
ہے آدمی کیا بساط کیا مال جلتے ہیں یہاں فرشتہ کے ہال
جب ہاتھ ملایا ہو گا زیہات باقی رہی ہوگی کون سی بات
اے کاش اسے پکڑنے پاتی کیا کیا حرے چوری کے پچھاتی
بقول اشیرانگر ۱۲۲۱ھ میں مصنف نے اس پر نظر ثانی کی۔ صفحات ۶۵۰، ۱۵ بیت فی صفحہ (۳۷)

۵۔ مناسب عشق از نہال چند لاہوری، ۱۲۱۷ھ (۳۸) یہ عزت اللہ بنگالی کے فارسی نسخے سے ترجمہ ہے۔ ترجمے کا کام گل کرائسٹ کی نگرانی میں ہوا۔ اس پر نظر ثانی دوسری اشاعت کے وقت شیر علی افسوس نے کی۔ یہ کتاب پہلی بار

۳۳ سداغ، اگست ۱۹۳۶ء

۳۵ اشیرانگر، ص ۶۳۴

۳۶ مثنویات امیر احمد طوی، ص ۵۵

۳۷ اشیرانگر ص ۶۳۴، دہلی اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ ”یہ نظم دوسری نظموں سے طویل ہے۔ اس میں ۳ باب ہیں اور ہر باب کو محقق سے تعبیر کیا گیا ہے۔“۔ خطبات ۱۵۶

۳۸ آجدر اشعارے ہندو ص ۱۳۵، بولین ص ۱۳۹۰، نیز اشپاک نمبر ۱۷۳۱ء، نوار، ادبیات جلد نمبر ۶۹-۹۷، ۳۶۱، جلد دوم ۱۴۱-۱۵۱، جلد سوم ۶۳۵

نکلنے سے ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی۔^(۴۹) انڈیا آفس لائبریری میں مذہبِ عشق (از نہال چند لاہوری) کے ۱۸۰۳ء سے ۱۸۸۹ء تک کے ۲۰ مختلف ایڈیشن محفوظ ہیں۔^(۵۰)

۶۔ مشنوی گلزارِ نسیم از دیا شکر نسیم ۱۲۵۳ھ۔ نسیم کے ماخذِ ربیعان کی اردو مشنوی اور رفعت کی فارسی مشنوی ہیں۔^(۵۱) سید ظہور حسن راہپوری اپنے مضمون ”مشنوی گلزارِ نسیم کے ماخذ“ میں لکھتے ہیں: ”ان تینوں مشنویوں (ہلغ و بہار از ربیعان، مشنوی رفعت لکھنوی اور گلزارِ نسیم) کا تعلق ایک ہی قصہ سے ہے۔ ایک ہی بحر ہے اور نام اور مقام بھی ایک ہی ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر مصرعوں اور شعروں کا لفظ بہ لفظ مشنوی گلزارِ نسیم میں موجود ہوتا خود اس خیال کا بڑا سہ ہے کہ نسیم کی نظر سے پہلی یا دوسری یا دونوں مشنویاں ضرور گزری ہیں۔ مشنوی گلزارِ نسیم کا سنہ تصنیف ۱۲۵۳ھ ہے اور ”ہلغ و بہار“ کا سال تالیف ۱۲۱۱ھ ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گلزارِ نسیم، ہلغ و بہار سے ۴۲ سال بعد وجود میں آئی۔ رفعت لکھنوی نے صراحت کر دی ہے کہ اس نے قصہ فارسی نثر سے لیا۔ اس کا سنہ تصنیف نہیں ملا۔ لیکن اس کے بعض مصرعوں اور شعروں کا ہو بہو ترجمہ مشنوی گلزارِ نسیم میں پایا جاتا ہے۔“ اس کے بعد مضمون نگار نے تینوں مشنویوں کے ہم مضمون اشعار نقل کر کے ان کی مطابقت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔^(۵۲) مگر خود نسیم اپنی مشنوی کو اردو نثر سے ماخوذ بتاتے ہیں:

۴۹۔ علومِ ہدایت، برائے قس ۱۳۳ (برائے سید نسیم میں اس کتاب کے گیارہ مختلف ایڈیشن محفوظ ہیں) ہندی میں مذہبِ عشق کا ترجمہ ”نکا دھن“ کے نام سے چھپا گیا۔ دہلی، ۱۹۷۳ء۔

(کوثر، ادبیاتِ ہند، ۲۰۵)

۵۰۔ انڈیا مطبوعات، ص ۱۳۱-۱۳۰

۵۱۔ سہارن، ۱۹۳۶ء، ص ۱۳۰

۵۲۔ سہارن، اگست، ۱۹۳۶ء، ص ۱۳۰

افسانہ گل بکھڑی کا افسوں ہو بہار عاشقی کا
ہر چند سنا گیا ہے اس کو اردو کی زبان میں سخن کو
وہ نثر ہے، دلوں لقمہ دوں میں اس سے کو دو آئندہ کروں میں

ان اشعار کی روشنی میں یہی ثابت ہوتا ہے کہ نسیم کے سامنے اس قصے کا کوئی اردو نثری نسخہ تھا۔ اگر ریحان اور رفعت کی مشعوں کے بعض اشعار گلزار نسیم سے مطابقت رکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ جس نسخے سے دیا شکر نسیم نے استفادہ کیا ہو، وہی روایت ریحان اور رفعت کے بھی پیش نظر رہی ہو۔

۷۔ ”گل بلغم بہار“ (۵۳) گل بکھڑی منظوم معصوم محمد دلاور علی ناواں۔
قلمی نسخہ۔ سال کتابت درج نہیں ہے۔ سال تصنیف ۱۲۶۹ھ ہے۔ تعداد اشعار تخمیناً ۳۵۰۰۔

پہلا شعر:

کروں پہلے حیدر خدائے جہاں کیا جس نے ہے مکن میں کون و مکاں
معصوم منظوم دیباچے میں عزت اللہ بنگالی کے فارسی قصے اور مشی
نہال چند (لاہوری) کے اردو نثری ترجمے (مذہب عشق) کا ذکر کرتا ہے۔ مگر
گلزار نسیم سے ناواقف معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے نزدیک مذہب عشق کو پہلے پہل
لقمہ کرتا ہے اور اس کام سے بھلے نام کی امید رکھتا ہے۔ مگر اس کی یہ مشعوں
زبان اور شاعری کے اعتبار سے ہر طرح کے محبوب سے بُرے ہیں۔ اس کی دو
مشعوں اور بھی ہیں۔ ”لقمہ بہار“ اور ”طرز عاشق و معشوق“ اور چار طولانی
قصوں کا ایک مجموعہ نثر میں ہے جس کا نام ”تلوہ اسلامائے الہی“ کتاب کے
موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

معصوم حیدر آباد میں پیدا ہوا اور کچھ مدت سری رنگ چٹن، ریاست

آصفیہ، مصلیٰ جن اور رنگوں میں قیام کر کے نکلتے پہنچا اور شیخ سلطان کے بیچے نواب غلام علی کے یہاں ملازم ہو گیا۔ اس نے اپنی کتاب ”ظہور اسمائے الہی“ شیخ سلطان کے فرزند شاہزادہ محمد سلطان عرف غلام محمد کو بطریق نذر پیش کی۔ مذکورہ بالا چاروں کتابیں مصنف نے قیام نکلتے کے زمانے میں لکھیں۔

آغاز داستان کے اشعار یہ ہیں:

تھا پر رب کے شہروں میں اک بادشاہ کہ تھا وہ شہنشاہ کیتی پناہ
یہ کہتے ہیں زمین الملوک اس کا نام سبکی امر سے تھا یہ مقصد تمام
بحال اس کا جیسا تھا ماہ منیر شجاعت سخاوت میں تھا بے نظیر
کہ قدرت سے حق کی تھے فرزند چار یہ علم و فضل میں تھے وہ آشکار (کذا)
سوا ان کے اک اور پیدا ہوا کہ لمس و قمر جس پہ شیدا ہوا

آخری شعر:

ہوئی شتوی اس جگہ پر تمام حق محمد علیہ السلام (۵۳)

۸۔ گل بکاوی، قلمی، منکوم۔ ۱۲۶۱ھ از محمد داؤد علی، مملوک مسعود حسن رضوی ادیب، لکھنؤ۔

۹۔ گل بکاوی (اُردو نثر) مجہول المصنف، لاہور (۵۵)

اس قصے کو اُردو میں ڈرامہ کے طور پر مندرجہ ذیل مصنفین نے لکھا:

۱۔ نوشیرواں جی مہربان جی آرام (بہمنی) (۵۶)

۲۔ حسین جی الدین (گلشن بے خار، مدراس ۱۸۹۳ء) (۵۷)

۵۳ تصانیف مرسلہ جناب مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ

۵۵ لہرست کتب خانہ، ص ۷۰

۵۶ اردو دارالحدیث، حضرت رحمانی، ص ۲۰۳

۵۷ اشیا علیہ مات، ص ۹۷

۳۔ مرزا نظیر بیگ، نظیر اکبر آبادی (گلزار عاشقی، چترا بکاولی، انگرہ ۱۹۰۸ء) (۵۸)

۴۔ الف خاں حباب رامپوری (۵۹)

۵۔ رونق بھاری (بھٹی) (۶۰)

۶۔ احمد ندیم قاسمی (نثری تفکیریں) لاہور (۶۱)

قصہ گل بکاولی کے ترجمے غیر ملکی زبانوں میں بھی ہوئے ہیں۔ گارساں دتاسی نے نہال چند لاہوری کی مذہب عشق کا خلاصہ فرانسیسی زبان میں ۱۸۳۵ء میں (۶۲) اور پورا ترجمہ ۱۸۵۸ء میں جرس سے شائع کیا۔ (۶۳) گلکراسٹ کا انگریزی ترجمہ ۱۸۴۳ء میں منظر عام پر آیا۔ (۶۴) انگریزی میں گل بکاولی کا ایک اور ترجمہ T.P. Manual نے کیا۔ (۶۵) آر. پی. اینڈرسن نے بھی ۱۸۵۱ء میں قصے کو انگریزی میں لکھا W. A. Clouston نے مینول اور اینڈرسن کے تراجم کو اپنی کتاب A Group of Eastern Romances میں شامل کیا، جو ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی۔ (۶۶) قصہ گل بکاولی کا ایک اور انگریزی ترجمہ ہادا چیمبرام نے "مذہب عشق" سے کیا، جو ۱۹۰۳ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ (۶۷)

۵۸	نورہ مطہر عاصی، ص ۱۳۷، یز صدیق ۳۰۸
۵۹	لردو ڈرائیو، ص ۲۰۹
۶۰	ایضاً، ص ۲۱۴
۶۱	ایضاً، ص ۳۱۷
۶۲	علوم پورٹ برٹش، ص ۸۸
۶۳	ایضاً
۶۴	ایضاً، ص ۱۰۰
۶۵	بحوالہ نثری داستانیں، ص ۵۸۷
۶۶	علوم پورٹ، برٹش، ص ۱۰۰
۶۷	علوم پورٹ، برٹش، ص ۳۸۷

اس قصے کو پنجابی میں شیخ نجم الدین، مسکین، سیالکوٹی نے لکھا ہے۔ (۶۸)
پشتو زبان میں ”قصہ گل بکاؤلی“ کا ترجمہ ملا احمد قاضی نے کیا جو دہلی سے ۱۸۸۱ء
میں شائع ہوا۔ (۶۹) یہی کتاب ”گلشن راحت“ کے نام سے بمبئی سے دوبارہ ۱۸۹۰ء
میں شائع ہوئی۔ (۷۰) پشتو کا ایک اور ترجمہ غازی الدین نے ”گل بکاؤلی افغانی
جدید“ کے نام سے دہلی سے ۱۸۸۳ء میں شائع کیا۔ (۷۱)

بعض ہندوستانی زبانوں میں بھی یہ قصہ فارسی اور اردو روایتوں سے لیا
گیا ہے۔ گجراتی میں اسے کرشن داس نے عزت اللہ بنگالی کی فارسی گل بکاؤلی سے
۱۸۶۳ء میں ترجمہ کیا۔ (۷۲) ہندی میں بھی کچھ سنگھ درمانے اسے عزت اللہ بنگالی
سے ترجمہ کیا جو ”بکاؤلی سن“ کے نام سے بمقام لکھنؤ ۱۸۷۳ء میں شائع
ہوا۔ (۷۳) اسی قصے کا ایک اور مجہول المصنف ہندی ترجمہ ۱۸۶۳ء میں گل بکاؤلی
کے نام سے بنارس میں چھپا تھا۔ (۷۴) بنگالی زبان میں اسے کسی شخص اردت مٹی
نے غالباً وہاب عشق از بہان چند لاہوری سے ترجمہ کیا جو کلکتہ سے ۱۸۷۹ء میں
شائع ہوا۔ (۷۵)

قصہ و تبصرہ

سلطان زین الملوک کے پانچویں بیٹا ہونے پر نجومیوں نے پیشین گوئی
کی کہ اگر سلطان کی نظر اس پر پڑے گی تو اندھا ہو جائے گا۔ چند برس بعد ایک

۶۸	۱۔ ک۔ م۔ مئی ۱۸۵۳ء، ص ۶۳
۶۹	پشتو کتب بر نقش، کالم ۱۰
۷۰	ایضاً ۱۱
۷۱	ایضاً ۱۸
۷۲	کلیلاک گجراتی کتب، بر نقش میوزیم، بلوم ہارٹ، ص ۶۳
۷۳	افغانی ہندی ص ۶۱، نیز ہندی کتب بر نقش کالم ۱۷
۷۴	ہندی کتب بر نقش کالم ۱۷
۷۵	کلیلاک بنگالی کتب، بر نقش میوزیم، بلوم ہارٹ، ص ۷۳

دن اتفاقاً باپ بیٹے کا سامنا ہو گیا۔ باپ کی آنکھیں جاتی رہیں۔ ایک معالج نے بتایا کہ گلزار ارم میں بکاؤلی کا پھول ہے، وہ اگر آنکھوں کو لگایا جائے تو بینائی عود کر آئے گی۔ چاروں خنزروے گل بکاؤلی کی تلاش کو نکلے اور پہلی ہی منزل پر دلہر بیسواسے چوسر کا کھیل ہار گئے اور اس نے انھیں قید میں ڈال دیا۔ پانچویں بیٹے یعنی تاج الملوک نے دلہر بیسوا کو مات دی اور دوسری منزل پر ایک دیو سے مقابلہ کر کے اسے بھی رام کیا۔ دیو کی بہن حمالہ دیوئی مددگار ثابت ہوئی۔ اس کی بتائی ہوئی سرنگ کے ذریعے تاج الملوک گلزار ارم میں پہنچا اور گل بکاؤلی توڑ لانے میں کامیاب ہو گیا۔ وطن کو لوٹتے ہوئے تاج الملک کی بڑے بھائیوں سے منہ بھیڑ ہوئی انھوں نے دھوکے اور فریب سے بکاؤلی کا پھول تاج الملوک سے چھین لیا۔ پھول سلطان کی آنکھوں کو لگایا گیا، جس سے اس کی کھوئی ہوئی بینائی واپس آ گئی۔ لورہر جب بکاؤلی نے گلزار ارم سے اپنے پھول کو غائب پایا تو بہت سٹ پٹائی۔ چور کی تلاش میں وہ سراغ لگاتے لگاتے سلطان کے دربار تک پہنچی اور مرد کی صورت اختیار کر کے اس کی وزیر بن گئی۔ پھول ہاتھ سے نکل جانے کے بعد تاج الملوک شہر کے قریب جاوہ کے زور سے گلشن نگاریں بنا کے رہنے لگا۔ لیکن یہ روز زیادہ مدت تک پوشیدہ نہ رہا۔ بکاؤلی کو بھی پتا چل گیا کہ اصل چور تاج الملوک ہے۔ وہ اس کی شجاعت، دلیری اور مردانگی کی قائل تو تھی ہی، پہلی ملاقات میں دل ہار گئی۔ عشق کی ابتدا ہوئی اور وہ دونوں ساتھ ساتھ گلزار ارم میں دلوریش دینے لگے۔ بکاؤلی کی ماں کو یہ احوال معلوم ہوا تو اس نے بکاؤلی کو قید کر دیا اور تاج الملوک کو ظلم کے جنگل میں پھنکوا دیا۔ تاج الملوک نے تمام آفات کا نہایت ہمت اور جرأت سے مقابلہ کیا اور ظلم سے رہائی حاصل کی۔ آخر بکاؤلی سے اس کا بیوا ہوا اور دونوں گلشن نگاریں میں آکر مزے میں زندگی بسر کرنے لگے۔ درحقیقت بکاؤلی اندر لوک کی پری تھی۔ وہ ہر رات اڑ کر اندر لوک پہنچتی اور صبح تاج الملوک کی آنکھ کھلنے سے پہلے واپس آ جاتی۔ ایک رات تاج الملوک جڑ گیا اور پکھاوٹی بن کے بکاؤلی کے ہمراہ اندر لوک پہنچا۔

ہکاؤلی نے اس رات اتنا عمدہ رقص کیا کہ راجا اندر نے بے اختیار اس کی منہ مانگی سراو پوری کرنے کا وعدہ کر لیا۔ ہکاؤلی نے تاج الملوک کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی اجازت چاہی، مگر اسے سننے ہی راجا کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی اور ہکاؤلی کو نصف پتھر کی بنا کر ایک منٹھ میں قید کر دیا۔ کچھ مدت بعد راجہ جڑ حسین کی بیٹی چڑاوت بھی تاج الملوک پر عاشق ہو گئی۔ اسے تاج الملوک کا روز روز منٹھ جانا اور ہکاؤلی سے باتیں کرنا شائق گزرا۔ اس نے وہ منٹھ ہی کھدوا ڈالا۔ منٹھ کے انہدام کے بعد اس زمین میں سرسوں پیدا ہوئی جس کے تیل سے ایک دھقان کی بیوی کے صلہ وہ گیا اور ہکاؤلی نے نیا جنم پایا۔ دھقان کے گھر جو ان ہو کر ہکاؤلی پھر تاج الملوک سے ملی اور دونوں کے دلوں کی سراو پوری ہوئی۔

گل ہکاؤلی کا یہ قصہ چونکہ بہت مقبول و معروف رہا ہے۔ اس کی اصلیت کے بارے میں بھی روایات گھڑی گئی ہیں اور اس کا تعلق ایک ایسے پھول سے بتایا جاتا ہے جو بھی ہندوستان میں آشوب چشم وغیرہ امراض کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ قصہ گل ہکاؤلی کی جدیختی اصلیت سے اردو میں سب سے پہلے محمد یعقوب ابن اکبر خاں لکھنوی نے اپنی کتاب ”مقدسہ حیرت معروف بہ تواریخ ہکاؤلی“ میں بحث کی تھی۔ انھوں نے ہکاؤلی کے حالات قصہ کا کوری ضلع لکھنؤ کے رئیس محمد عبدالصمد ولد شیخ رحیم باسط سے معلوم کیے اور یہ مختصر سی کتاب خواجہ محمد وزیر کے مطبع گلزار محمدی لکھنؤ سے ۱۲۹۳ھ میں شائع ہوئی۔ محمد یعقوب نے لکھا ہے کہ وکن کے کرنبوٹ نامی راجا کے دو بیٹے تھے۔ شاستر جوگ اور راج بھوج۔ چھوٹے بیٹے راج بھوج کو غیر آباد اور ویران علاقہ دیا گیا۔ لیکن اس نے ریاضی دانوں اور ساحروں کی مدد سے وہیں جنگل میں ایک پراسرار قلعہ تعمیر کر لیا۔ بھوج کے ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی پیدا ہوئی۔ اسے پھولوں کا بہت شوق تھا۔ سو بہن بھدر نامی ایک جوگی نے رانجھاری کو دیکھا اور اس پر عاشق ہو گیا۔ اس نے پیش کش کی کہ وہ ایک بہت بڑے ساحر کے بارگ سے ایک ایسا درخت لاسکتا ہے جس کے پھول خوبصورتی اور خوشبو میں بے نظیر ہیں، بشرطیکہ

وہ کسی سے شادی نہ کرے۔ راجکمار نے اقرار کر لیا اور ایک دن جو وہ سوکر اٹھی تو گل بکالی کی نہایت نہانی خوشبو سے اس کا دماغ معطر ہو گیا۔ اس نے خوش ہو کر جوگی کو باغ میں رہنے کی اجازت دے دی اور پھول کی رعایت سے راج کمار بھی بکالی کے نام سے پکاری جانے لگی۔ اس کے حسن و جمال کا شہرہ ہوا تو شادی کے پیام آنے لگے۔ آخر راجا نے ایک نسبت منظور کر لی۔ شادی کا دن آیا، دلہن غسل کے لیے حوض پہ لائی گئی اور جیسے ہی جوگی کو معلوم ہوا اس نے بد دعا دی اور جوگی اور بکالی دونوں پانی ہو کر بہہ گئے۔

بکالی کے قلعے اور باغ کے آثار ناگپور کشتری کے ضلع منڈا کی تحصیل رام گڑھ میں امرکنک^(۷۶) نام کے جنگل میں موجود ہیں۔ ۱۸۲۰ء میں محکمہ جنگلات کے داروغہ میر قدرت علی نے اس جنگل کا جو نقشہ کھینچا تھا اس میں بکالی کے باغ، قلعے اور دوسری عمارتوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کی نقل محمد یعقوب کی کتاب میں شامل ہے۔ ان کا بیان ہے کہ قلعہ بکالی کے چاروں طرف نہایت گہری دلدل ہے۔ اس کے قرب و جوار میں عجیب قسم کے خوشبودار پھول ہیں جن کا عرق آنکھوں کے درد کو دور کرتا ہے، لیکن دلدل کی وجہ سے یہ پھول مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں اور قلعے تک رسائی محال ہے۔

محمد یعقوب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۳۶۶ ف میں ناگپور کے چیف کشنر ٹیپل صاحب کو قلعہ دیکھنے کی دھن سنائی۔ وہ تقریباً سو سو سالہ انگریزوں اور دیسی سپاہیوں کے ساتھ ہاتھیوں پر روانہ ہوئے۔ تھوڑا سا فاصلہ چلے تھے اور ابھی قلعہ نو کوں دور تھا کہ دلدل کی گہرائی زیادہ ہو گئی اور آگے بڑھنا ممکن نہ رہا۔ قلعہ سے دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیتا تھا، جیسے کہیں بہت دور آگ لگی ہوئی ہو۔^(۷۷)

۷۶ امرکنک دریائے نرپدا کا منبع ہے۔ یہاں ایک قدیم حوض ابھی تک موجود ہے جس کے پارے میں کہا جاتا ہے کہ دریائے نرپدا پہلے پھل نہیں سے بہتا شروع ہوا تھا۔ (امبر نکل گزٹیر آف انڈیا، جلد ۵، ص ۲۷۳)

۷۷ تحقیق در مغلہ تاریخ، ۲، ۲۱۱، ۲۱۲، قلعہ ۱۲۹۳

ہندی زبان کے مشہور لکھت ”ہندی شہسارگر“ میں کل بکاؤلی سے متعلق یہ عبارت ملتی ہے :

(۱) ایک پرکار کا بیڑ جو نرپدا اندی کے اوگم کے پاس امرکھک کے بن میں ہوتا ہے۔ یہ ہندی کے بیڑ سے ملتا جلتا ہے۔ (۲) اس پودے کا پھول جو رنگت میں سفید اور بہت سنگد صفت ہوتا ہے جس پرانت میں یہ ہوتا ہے۔ اس پرانت کے لوگ اسے چیں کر آئی ہوئی آنکھوں پر لگاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ آنکھ کے کئی روگوں کی بہت اچھی دوا ہے۔“ (۷۸)

اس قلعہ کے بارے میں واقف لکھنوی نے ۱۹۲۱ء میں رسالہ ادیب میں لکھا تھا کہ ان کے ایک عزیز، جو محکمہ پولیس میں افسر تھے، ڈاکوؤں کے تعاقب میں ایک مرتبہ امرکھک کے جنگل میں جا پٹکے۔ وہاں انھیں ایک چہار دیواری نظر آئی، جس میں سنگ سرخ اور سنگ مرمر کی ایک بارہ دری دکھائی دی جو گہری دلدل سے گہری ہوئی تھی۔ شہر اگر معلومات بہم پہنچائیں تو تاریخ ریواں دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ بارہ دری بکاؤلی نام کی ایک رانی نے بنوائی تھی۔ نیز یہ کہ ریاست ریواں میں بکاؤلی نام کا ایک پھول پیدا ہوتا ہے جو امراض چشم کے لیے مفید ہے۔ (۷۹)

اس کی تاریخی حقیقت کے بارے میں مولوی سید احمد دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ نے بھی لکھا ہے۔ ان کا بیان ہے : امرکھک ایک بڑا ہی گہنا اور وحشت ناک جنگل ہے۔ اس میں قلعہ، حوض اور باغ و مکانات کے نشان ابھی تک ہیں۔ لیکن دلدل کی وجہ سے ان تک رسائی مشکل ہے۔ گرد و لوارح میں یہ قلعہ ایک ظلم سمجھا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ قدیم زمانے میں دکن کے ایک راجا بھوج نے اپنے چھوٹے بیٹے سے خفا ہو کر اسے اس غیر آباد علاقے میں بھیج دیا۔ بھوج کے امراہیوں میں بعض غیر معمولی ریاضی داں اور منجم بھی تھے۔

۷۸ ہندی شہسارگر، شیم سہرواس، ناگری بھاشا پرچاری سماج، بیلارس ۱۹۱۶ء، ص ۸۲۸

۷۹ ادیب، جولائی ۱۹۲۱ء، ص ۱۰

انہوں نے یہاں قلعہ بنایا اور اس کے گرد ظلم آمیز باغات تعمیر کیے۔ راجا بھوج کے ایک نہایت حسین لڑکی نربدال نامی پیدا ہوئی۔ بڑی ہوئی تو اس کے حسن کا شہرہ دور دور تک پہنچا۔ سون بھدر نای ایک جوگی اس لڑکی پر عاشق ہو گیا اور وہیں قلعے کے قریب محل بنا کر رہنے لگا۔ سون بھدر نے اس شرط پر نربدال کو بکاؤلی کا تیاپ بھول لا کر دیا کہ وہ کسی سے شادی نہ کرے گی۔ اسی اثنا میں ایک شہزادہ بکاؤلی سے عاشقی کا دم بھرنے لگا اور راجہ بھوج نے اس کی درخواست منظور کر لی۔ جب برات آئی تو سون بھدر کو سارے معاملے کا پتا چلا اور اس نے بددعا دی کہ بکاؤلی پانی ہو کر بہہ جائے۔ اسی روز سے یہ پانی ایک دریا کی شکل میں جاری ہے اور اسے ”نربدال“ کی رعایت سے ”نربدال“ کہا جاتا ہے۔^(۸۰)

حال ہی میں محمد عبداللہ قریشی نے گل بکاؤلی کے بارے میں ایک مقالہ شائع کیا ہے۔^(۸۱) ان کا بیان ہے کہ یہ قصہ ایک سچے واقعہ پر مبنی ہے۔ پچاس برس پہلے ایک ظلم بکاؤلی ایکسپلورنگ ایسوسی ایشن قائم کی گئی تھی۔ اس نے بڑی پیمانہ زمین کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ یہ قصہ محض فرضی انسانہ نہیں۔ قلعہ بکاؤلی ہوشک آباد اور امرکنگ کے علاقہ میں تھا۔ یہ علاقہ اس وقت کوسوں لمبی اور نہایت گہری دلدل میں گھرا ہوا ہے۔ بکاؤلی کا تالاب، مندر اور فوارہ شکستہ حالت میں پائے گئے ہیں۔ اس علاقے میں ایک بوسیدہ عمارت کھسا پتیا کا محل کہلاتی ہے۔ غالباً یہ دلبر جیوا کا مکان تھا، جہاں اس نے جوئے کی بازی میں چاروں شہزادوں کو مات دی تھی۔ محمد الدین فوق نے اپنے اخبار کشمیری لاہور میں ۱۹۱۰ء میں لکھا تھا کہ امرکنگ ہندوؤں کا تیر چھ ہے۔ دریائے نربدال یہیں سے نکلتا ہے۔ آگے نکل کر دریائے سون اور نربدال کی دلدلی میں موٹھا کے قریب ایک بڑا جنگل ہے جو اب تک بکاؤلی کا باغ کہلاتا ہے۔ اس جنگل میں ہلدی کے رنگ کے پھول عام طور پر کھلتے ہیں۔ مشہور ہے کہ ان کا عرق آنکھوں میں

۸۰ فرنگ آصفیہ، جلد چہارم ۵۳-۵۶

۸۱ نقوش، لاہور، جون ۱۹۵۸ء، ص ۷۰-۷۲

ڈالنے سے آشوب وغیرہ سے شفا ہوتی ہے۔ روایت ہے کہ بکاؤلی کا اصل درخت غائب ہو چکا ہے اور موجودہ پھول جہاں ہم نہیں گئے اتر سے اصل گل بکاؤلی کی کچھ خاصیت رکھتے ہیں۔ آنکھوں کے امراض کے متعلق ان پھولوں کے اثر کی تصدیق خان بہادر مولوی رحمان علی دیکل دربار راجاں نے بھی اپنی کتاب ”تحفہ خان بہادر“ میں کی ہے۔

فرض گل بکاؤلی کی اصلیت کے بارے میں کئی روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ یہ صحیح ہیں یا غلط، اتنی بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اپنی موجودہ حالت میں گل بکاؤلی کا قصہ ہندوستان ہی میں تخلیق ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ سے ہندوستان کی زندگی میں اخذ و قبول کا جو عمل شروع ہوا تھا، گل بکاؤلی کا قصہ اس کی کامیاب نمائندگی کرتا ہے۔

قصے کے اعتبار سے مثنوی گلزار نسیم کے دو حصے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ پہلا شہزادے کے گل بکاؤلی کی تلاش میں نکلنے سے لے کر شادی ہو جانے تک اور دوسرا اندر سجا کے واقعہ سے بکاؤلی کے دوبارہ پیدا ہونے تک۔ یوں تو ساری مثنوی میں ہندی اور ایرانی عناصر ملے جلے نظر آتے ہیں، لیکن پہلے حصے میں ایرانی رنگ غالب ہے اور دوسرے میں ہندوستانی۔ قصے کی فضا اس زمانے میں رائج داستانوں کی سی ہے۔ مثنوی کے کرداروں میں بعض نام فارسی ہیں اور بعض ہندی۔ زمین الملوک، تاج الملوک وغیرہ ایرانی نام ہیں اور چتر سین، چتراوت وغیرہ ہندی نام ہیں۔ دلبر دسوا کے نام میں دلبر فارسی لفظ ہے اور دسوا ہندی۔ اسی طرح لفظ ”گل“ فارسی ہے اور ”بکاؤلی“ تدبیر (तद्विर) ہندی لفظ ہے جو سنسکرت بک (बक) یا بکھا (बक़्हा) سے نکلا ہے۔ بک (बक) سنسکرت میں بنگے کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ بنگے کے ساتھ کنول کے معنی میں بھی آیا ہے۔ بکل (बकल) سنسکرت میں ایک ایسے خیالی درخت کا نام ہے، جس پر لگ کر کوئی نوجوان عورت اپنے منہ سے شراب چھڑک دے تو پھول مکمل اٹھیں۔ (۸۲) بکل (बकल) ”شی

دھ گندھو“ اور ”مسعیہ کیشر“ یعنی موسسری کے پھول کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔^(۸۳) قیاس چاہتا ہے کہ ”بکاولی“ کا لفظ اسی نکل (वकाल) سے نکلا ہو گا اور ممکن ہے کہ کسی زمانے میں ایسا کوئی پھول امراض چشم کے لیے استعمال ہوتا ہو۔

مشغولی کے پہلے حصے کی کچھ داستانیں ہندی ہیں اور کچھ اسلامی۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اس کی طرف کچھ اشارے کیے ہیں۔^(۸۴) دلبر دیشوا کا چوسر کیلینا مقامی ماحول سے اخذ کیا گیا ہے۔ قصے میں جنس بدلنے کا ذکر آیا ہے۔ یہ مہابھارت سے ماخوذ ہے۔ جہاں لوصیوگ پر د میں شکھیڑی ایک یکش سے جنس بدل کے مرد بن جاتا ہے۔ ایسے واقعات کا ذکر چٹال بکچی وغیرہ کہانیوں میں بھی ملتا ہے۔

قصہ کل بکاولی کے بعض عناصر اسلامی حکایتوں سے بھی ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً ساج الملوک اپنے بھائیوں کو زنداں سے رہا کراتا ہے، لیکن وہ اس کے ساتھ دعا کرتے ہیں۔ یہ بنیادی طور پر حضرت یوسف کا قصہ ہے۔ پھول یا کسی اور چیز کے آنکھوں کو لگانے سے بینائی کا عود کر آنا حضرت یعقوب کے واقعہ سے مختلف نہیں۔ دیودس کے ذریعے محل تیار کرنا الہ دین کے چراغ“ میں بھی پایا جاتا ہے۔ قصہ بکاولی میں طلسم کی جو تہ اسرار فضا تیار کی گئی ہے، اس کے نمونے امیر مزہ، الف لیلہ اور بوستان خیال میں بکثرت مل جاتے ہیں۔

بکاولی کی شادی کے بعد قصے کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جو ہندوستانی لوک کہانوں سے ماخوذ ہے۔ اس میں روہان کی فضاء، راجا اندر اور پریوں کے ذکر سے امدادی گئی ہے۔ راجا اندر اور اہسراؤں کی کہانیاں ہندوستانی ادبیات میں عام طور پر ملتی ہیں اور ہر ہندوستانی ان سے اچھی طرح واقف ہے۔

دیاشنکر نسیم نے راجا اندر کو یوں پیش کیا:

۸۳ शब्दावलीविवरणमणि: नरकानन्दनाथ (मुद्रक) अंश १११ कृ. जلد ४, ص ३३९

۸۴ ڈاکٹر گیان چند جین، نثری داستانیں، ص ۱۶۲

خالق نے دیا ہے فوق اس کو نفع سے ہے ذوق شوق اس کو
انساں کا سرود و رقص کیا ہے پریوں کا تاج دیکھتا ہے
باری باری سے جو پری ہے راجہ اندر کی بھرتی ہے
لیکن جو بکالی دل انگار باری پہ پہنچ سکی نہ بھار
اک شب راجا تھا محفل آرا یاد آئی بکالی دل آرا

چنانچہ حکم ہوا کہ بکالی کو زمین سے لایا جائے۔ یہ واقعہ وکرم اردوشی کے قصے سے ملتا جلتا ہے۔ مہابھارت کے آوی پرو میں راجا اندر اسی طرح اپنی اپسرا اردوشی کو طلب کرتا ہے جو ایک زمینی انسان وکرم کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ بکالی شہزادے کو پکھا دینی بنا کر اندر سبھا میں لے جاتی ہے۔ تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ بکالی ایک منٹھ میں قید کر دی جاتی ہے۔ رانی چتراوت اس منٹھ کو کھدوا دیتی ہے۔ اس منٹی سے اگنے والی سرسوں کے تیل سے وہتان کی بیوی کے حمل رہتا ہے اور بکالی پھر سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب خیالات ہندوستان کے پُرانے قصوں کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ لہذا کی اندر سبھا کا نقش لالیں بھی قصے کے اسی حصے میں ملتا ہے۔

گلزار نسیم میں ہند ایرانی عناصر کی آمیزش نہایت عمدہ طریقہ پر ہوئی ہے۔ شہزادی کی ابتدا احمد و نعت سے ہوتی ہے۔ یہاں بھی دیا فنکر نسیم نے مہابادی کے ساتھ لفظ نہر کا استعمال کیا ہے۔ اس سے دونوں مذہبوں کا احترام ملحوظ تھا۔ ایک اور مقام پر جہاں استخارے کا ذکر ہے، وہاں علم جو قش کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

سیاروں سے کر کے استخارہ اس برج کے زرخ وہ مہ سدھارا
قصے کی جائے وقوع کے سلسلے میں فردوس، گلزار ارم اور گلشن نکھریں
کے ایرانی نام بار بار آئے ہیں لیکن یہ خیالی اور فرضی ہیں۔ سنگل ویپ ہندوستانی

نام ہے جس کا ذکر مختلف لوگ کتھاؤں میں ملتا ہے۔ مثنوی کے آغاز میں سلطان زین الملوک کو پورب کا بادشاہ کہا گیا ہے، اس سے مراد ہندستان ہی ہے۔ اس کی صراحت اس موقع پر ہو گئی ہے جہاں تاج الملوک شادی کے بعد بکاؤلی کے ساتھ وطن لوٹا ہے :

غربت میں وطن کی دھن سہلی اس فعل کو یاد ہند آئی
کہنے کو اس قصے کے افراد فردوس اور پرستانوں میں رہتے ہیں لیکن ان کے آداب و رسوم ہندستانوں جیسے ہیں۔ تاج الملوک جب زین الملوک کی پیشوائی کو آتا ہے تو اس شان سے :

جو جو کہ تواضعات ہیں عام لے آئے خواص نازک اندام
چکنی ڈلی، عطر، الابچی، پان نقل و مئے و جام و خوں الوان
برات کا انتظام بھی ہندستانی طریقے پر دکھایا گیا ہے۔ جلوس میں ہاتھی شامل ہوتے ہیں۔ دولہا کے سہرا ہاندا جاتا ہے، سر پر چتر رکھا گیا ہے، چنور ہلایا جاتا ہے اور ہر سو ”ہریالے بنے“ کے شور و غل میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، پھولوں کے ہاروں، دھواں دھار بیج دانوں، پان کے بیڑوں اور چکنی ڈلی سے تواضع کی جاتی ہے۔ آرسی مصحف، شہانے، ٹیک دیا، ٹونا گانا یہ سب ہندستانی رسمیں ہیں۔

پرانے زمانے میں رخصت کے وقت آئینہ پر پانی ڈال کر دیکھتے اور اس سے فال لیتے تھے :

انکوں سے شکوں لیا نرالا آئینہ زرخ پہ پانی ڈالا
بعض اشعار میں ہندستانی راکوں کے نام بھی آگئے ہیں :

وہ پورنی کر کے جو گیا بھیں جھکے کی راہ سے چلا پردیس

وہ تاپنے کیا کھڑی ہوئی تھی خود راہی آکھڑی ہوئی تھی
 دیا شکر حیم بلا کے ذہین اور طہار آدی تھے۔ زبان اور بیان پر انھیں
 غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ میں بچپن برس کی عمر میں فن شعر میں وہ کمال
 پیدا کیا کہ ان کی مثنوی اردو کے زندہ جاوید کارناموں میں شمار کی جاتی ہے۔ نیم
 بلاغت اور معنی آفرینی پر جان چڑھتے تھے۔ میر حسن کا ساسور و گداز ان کے
 یہاں نہیں۔ نہ وہ روزمرے اور محاورے کے بادشاہ ہیں۔ لیکن شوکت الخاٹہ،
 انحصار، تناسب لفظی، بلند پروازی، باریک بینی، استعاروں کی نزاکت اور تشبیہوں
 کی چنگلی میں ان کا ایک خاص رنگ ہے۔ وہ لکھنؤ کی رنگین، لوچدار اور مریض
 زبان کے نمائندہ شاعر ہیں۔ طبیعت چونکہ مشکل پسندی پر مائل تھی، سلاست
 اور گھلاوٹ ان کے کلام میں نہیں۔ البتہ کہیں کہیں تکلفات سے ہٹ کر بڑے
 ہی سادہ اور برجستہ شعر کہے ہیں، جو ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں۔

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دے جاتا ہو تو اس کا غم نہ کہے
 منہ پھیر کے ایک مسکراتی آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
 چوتھوں کو ملا کے رہ گئی ایک ہوتوں کو بلا کے رہ گئی ایک

کھاتے ہی حمل کا رنگ پایا سرسوں سا ہتھیلی پر جھلایا

بیٹھا دس اس دبو کو کھلاؤ گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو

کانٹوں میں اگر نہ ہو الجھا تھوڑا کھٹا بہت سمجھا

سمجھانے سے تھا ہمیں سردکار اب مان نہ مان تو ہے مٹا

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے جاو وہ جو سر چڑھ کے بولے

دونوں کی رہی نہ جان تن میں کانٹو تو لہو نہ تھا بدن میں
قہصے کے آخر میں بہرام وزیر زادہ اور روح افزا منظر پر آتے ہیں۔ یہ
ایک ذیلی حکایت ہے جس کا تعلق قہصے سے بہت کم ہے۔ اصل قہصہ کا مصنف
اسلامی شریعت سے واقف معلوم ہوتا ہے۔ اس کا ایک ثبوت قہصہ کا انجام بھی
ہے جہاں تاج الملوک چار بیویوں کے ساتھ لوطاً دکھایا گیا ہے۔ اس قہصہ میں
میر شہوی کا ساتھ چار عورتوں سے پڑتا ہے۔ دلبر مسوا، دیوتی کی بیٹی محمودہ، رانی
چراوت اور بکالی۔ انجام کار شہزادہ چاروں ہی کو اپنے ساتھ رکھتا ہے۔

دلت کے بعد گھر میں آئے کھوئے ہوئے پیسے سب نے پائے
فردوس کی مسوا وہ دلبر محمودہ دیوتی کی دختر
چراوت چتر سین کی جان آرام ارم بکالی جان
ان چاروں میں ایک مسوا بادہ پورب کا بادشاہ ہزارہ

اس قہصے کے مختلف اجزا پر غور کرنے سے یہ بات پائیے تحقیق کو پہنچی
جاتی ہے کہ پھول بن اور قہصہ بدر منیر و بے نظیر کی طرح گل بکالی کے قہصے کی
عام فضا بھی داستانوں کی سی ہے۔ لیکن موجودہ حالت میں یہ قہصے نہ تو ہندی
الاصل ہیں نہ فارسی الاصل۔ ان میں اسلامی داستانوں اور ہندی لوک کہانیوں
کے عناصر ساتھ ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ ان کے بعض حصوں میں امیر
حزہ، الف لیلہ، یعقوب د یوسف اور بوستان خیال سے ملتے جلتے واقعات پائے
جاتے ہیں؛ تو کچھ حصے مہابھارتی قہصے کہانیوں، راجا اندر سے متعلق مشہور لوک
کہانیوں، شیخ تنویر، شک سہتی اور پچال کچھکی سے ماخوذ ہیں۔ ان داخلی شہادتوں
کی بنا پر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان قصوں کی تخلیق ہندو مسلم اختلاط کے زیر اثر
ہوئی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے سابقے کے بعد ہندوستان میں تہذیبی اور

معاشرتی سطح پر اشتراک و اختلاط کا جو عمل شروع ہوا تھا، عوامی قصے کہانیوں نے بھی اس سے گہرے اثرات قبول کیے اور مخلوط قسم کے ہندو ایرانی قصے وجود میں آئے۔ پھول بن، سحر الہیان اور گل بکھلی اس اخذ و قبول کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان مشعوذوں کے کچھ اجزاء ہندی ہیں، کچھ اسلامی، لیکن مشعوذ نگاروں نے انھیں اپنے تخیل کے سانچے میں اس خوبی اور خوش اسلوبی سے بنایا ہے کہ ان میں عرب کے سوز و دروں، عجم کی نفاست اور ہند کی لطافت نے باہم کر مل کر فریب نظر کی ایک جادوئی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

کتابیات

- اردو ڈارلہ، تاریخ و تنقید از عشرت رحمانی، لاہور ۱۹۵۷ء
- اردو شہ پارے، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، حیدر آباد، ۱۹۲۹ء
- اردو کی نثری داستانیں، ڈاکٹر گیان چند جین، کراچی، ۱۹۵۳ء
- اردو مشنوی کا ارتقاء، عبدالقادر سروری، حیدر آباد ۱۹۳۰ء
- اردو کے قدیم، محسن اللہ قادری، لکھنؤ ۱۹۴۵ء
- افسانہ پد متنی، محمد احتشام الدین دہلوی دہلی ۱۹۳۹ء
- اکبر نامہ، ابوالفضل غلامی، جلد ۳ بہ تصحیح مولوی عبدالرحیم، لکھنؤ ۱۸۸۶ء
- ایک مشرقی کتب خانہ، اسکاٹ لوکونز مترجمہ مہارذ الدین رفعت، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء
- بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء، اختر اورینٹی، پٹنہ ۱۹۵۷ء
- جیتل بھگوتی، رام کمار پریس، لکھنؤ ۱۹۵۳ء
- پہلات (اودھی) ملک محمد جانشی، مشمولہ جانشی مگر تھاولی مرتبہ ماتا پرشاد گپت،
۱۹۵۲ء
- پہلات بہاکا مترجم، عنایت علی بیک عنایت، کانپور، ۱۸۹۸ء
- پہلات بہاکا مترجم، چنڈت بھگوتی پر ساو پانڈے انوج، لکھنؤ
- پنجابی قصبے فارسی زبان میں (جلد اول) ڈاکٹر محمد باقر، لاہور، ۱۹۵۷ء
- پنجابی ادب کی تاریخ، عبدالغفور قریشی، لاہور ۱۹۵۶ء

تاریخ نواب اردو، رام بابو سکسین، ترمیم مرزا محمد عسکری، کھنڈ ۱۹۲۹ء

تاریخ فرشتہ، نول کشور، کھنڈ ۱۸۷۳ء

تاریخ مبارک شاہی، یحییٰ بن احمد بن عبداللہ لیسر ندی مرتبہ محمد ہدایت حسین،
کھنڈ ۱۹۳۱ء

تاریخ مشوقیات اردو، جلال الدین احمد جعفری، لاہور، طبع دوم

(تذکرہ) آثار الشعراء ہندو، وحی پر شاہ بٹاش، کھنڈ ۱۲۹۹ء

چندستان شعرا بھی نرائن شفیق، لاہورنگ آباد، ۱۹۲۸ء

فحاشات چلوید، سری رام، لاہور، جلد اول تا مجملہ ۱۹۰۸-۱۹۳۰ء

دو تذکرے (مشتق و شورش) مرتبہ کلیم الدین احمد، پٹنہ، ۱۹۵۹ء

تذکرہ رینڈ کوپان، فتح علی حسینی گرویزی، لاہورنگ آباد، ۱۹۳۳ء

سر لپا خن، میر حسن علی حسن، کھنڈ ۱۷۷۷ء

خن شعراء، عبدالغفور خاں نسخ، نول کشور کھنڈ ۱۸۷۳ء

تذکرہ شعراء اردو، میر حسن، دہلی، ۱۹۳۰ء

شیخ الحسن، نواب سید محمد صدیق حسن خاں، مطبع شاہجہانی، بمبئی، ۱۲۹۳ھ

طبقات خن (قلمی) قدس اللہ شوق، کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد

تذکرہ گل رحمتا (قلمی) شفیق لاہورنگ آبادی، کھنڈ ۱۸۹۶ء مخزن کتب خانہ سالار جنگ،

حیدر آباد

گل حجاب، اسد علی حتمتہ، لاہورنگ آباد، ۱۹۳۶ء

گلزار ابراہیم مع گلشن ہند، علی ابراہیم خاں، و میرزا علی لطف، لاہور ۱۹۰۶ء

گلشن بے خار، محمد مصطفیٰ خاں شیفہ، کھنڈ ۱۸۷۳ء

تاثر الامراء، نواب مصباح الدولہ شاہ نواز خاں، بہ صحیح مولوی مرزا اشرف علی،
ایشیاک سوسائٹی، بنگال ٹکٹ، ج ۳، ۱۳۰۹ء

تاثر انکرام، دفتر ثانی موسوم بہ سرود آزادی، میر غلام علی آزاد بکراوی، بہ صحیح و
تکلیف عبداللہ خاں، حیدر آباد، ۱۹۱۳ء

مجمع الاحباب، قلمی، شاہ کمال الدین، سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد

مجموعہ نغز، قدرت اللہ قاسم، مرتبہ محمود شیرانی، لاہور، ۱۹۳۳ء

محبوب الزمن، (تذکرہ شعراء دکن) محمد عبدالجبار خاں صوفی، لکناؤ پری، جلد
اول دوم، حیدر آباد، ۱۳۲۹ء

تذکرہ مقالات الشعراء، میر علی شیر قانع مختصی مرتبہ سید حسام الدین راشدی
کراچی، ۱۹۵۷ء

نکات الشعراء، میر تقی میر، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء

عزیز نکات، محمد قیام الدین قائم، اورنگ آباد، ۱۹۲۹ء

ہند و شعراء، خواجہ عشرت کسٹوی، لکھنؤ، ۱۹۳۱ء

تذکرہ ہندی، شیخ غلام محمد انانی مصحفی، دہلی، ۱۹۳۳ء

یادگار شعراء، طفیل احمد، ۱۱، آباد، ۱۹۳۳ء

خزائن الفتح، امیر خسرو (انگریزی ترجمہ محمد حبیب)، بمبئی، ۱۹۳۱ء

خطبات گار ساں داسی، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء

خلاصۃ التواریخ از سبحان رائے بھٹاری مرتبہ ایم۔ ظفر حسن، دہلی، ۱۹۱۸ء

دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی، حیدر آباد، ۱۹۳۶ء

دیوان لائٹ، مرتبہ سید آغا حسن لطافت، قوی پریس لکھنؤ، ۱۳۰۷ء

(دیوان) محبت مظہر، ہرچند رائے ہرچند، میرٹھ، ۱۹۲۹ء

کسی ہڈوں، لاہور، ۱۹۰۳ء

کسی باشم (پنجابی) ہر عام سنگھ شان، انبالہ ۱۹۵۶ء

سعادت یاد خاں رنگین، ڈاکٹر صابر علی خاں، کراچی، ۱۹۵۶ء

سودا، شیخ چاند، لورنگ آباد، ۱۹۳۶ء

شہد آر تھ چٹا منی، (منسکرت) سکھ احمد تھ، آگرہ ۱۹۳۱ء بکری

شعر العجم، شیلی نعمانی، لاہور ۱۹۲۳ء

شکستہ - شکوم، محمد فاروق وحشت بریلوی، ۱۹۳۶ء

شکو متھ یا انگشت گشدہ، علی اصغر شکستہ، دہلی ۱۹۵۷ء

طبقات اکبری، خواجہ نظام الدین احمد، جلد اول، مرتبہ بی ڈے، کلکتہ ۱۹۲۷ء

فتوح السلاطین، مولانا عصای مرتبہ ڈاکٹر مہدی حسین، آگرہ، ۱۹۳۸ء

فرہنگ آصفیہ، سید احمد دہلوی، دہلی ۱۸۹۵ء

کلیات سودا، مرتبہ عبدالہادی آسی، لکھنؤ ۱۹۳۲ء

کلیات محمد قلی قطب شاہ، مرتبہ ڈاکٹر نجی الدین قادری زور، حیدر آباد، ۱۹۳۰ء

کلیات میر تقی میر، مرتبہ: عبدالہادی آسی، لکھنؤ ۱۹۳۱ء

کلیلاک: مختلف ہندوستانی اور یورپی کتب خانوں میں محفوظ اردو، فارسی اور ہندوستانی علاقائی

زبانوں کے مخطوطات و مطبوعات کے توضیحی کلیلاکوں کی تفصیل کے لیے ملاحظہ

ہو فہرست مخطوطات

گارساں دجسی اور اس کے ہم عصر بی خواہاں اردو۔ ڈاکٹر نجی الدین قادری زور،

حیدر آباد، طبع ۱۹۳۱ء

گلدستہ خیرت، محمد یعقوب، لکھنؤ ۱۸۷۶ء

مشکوٰۃ اسرار محبت (تلمیذ) محبت خاں محبت، کتبہ، خانہ رضائیہ دم پور، پٹنن نظم ۵۲۸

ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو نثریں

مثنوی اسرار محبت مرچہ حسرت سوبانی، اردو سے معنی پر لکھی، علی گڑھ

مثنوی افسانہ غم، ہر چند رائے ہر چند، لکھنؤ ۱۲۸۲ھ

مثنوی پداوت شیخ و پروانہ (قلمی) ضیاء الدین عبرت و غلام علی عشرت،

کتب خانہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ، نکلان ۷۵/۶۳۰

شیخ و پروانہ (قلمی) فن لاہوری علی گڑھ نکلان ۵۰/۱۰۸

شیخ و پروانہ، مطبع مہمقانی، ۱۲۶۵ھ

مثنوی پداوت، محمد قاسم علی بریلوی، نول کشور، کانپور ۱۸۷۳ء

مثنوی پھول بن، امین نٹاطی، مرتبہ عبدالقادر سروری، حیدر آباد، ۱۹۳۸ء

مثنوی پھول بن، امین نٹاطی، مرتبہ شیخ چاند امین حسین، کراچی، ۱۹۵۵ء

مثنوی پیام سادتری، جگر بریلوی، لکھنؤ، ۱۹۵۱ء

مثنوی تصویر چائیں (قلمی) شفیق لورنگ آبادی کتب خانہ رضانیہ راجپور،

نکلان ۵۳۲ ب

مثنوی چند بدن و مہیار (قلمی) مقیمی، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ،

نکلان ۶۳/۶۱۹

مثنوی چند بدن و مہیار، مقیمی، مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی، حیدر آباد، ۱۹۵۶ء

مثنوی خورہید روشن، عنایت اللہ روشن بدایونی، لکھنؤ، ۱۹۰۳ء

مثنوی ستونٹ مینا، (قلمی) خواجہ، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ،

نکلان ۷۴/۶۴۷

مثنوی سراپا سوز، محمد صادق خاں اختر، لکھنؤ ۱۸۸۵ء

مثنوی سنگھان پتشی بکرا بیت (قلمی) ذخیرہ سر شاہ سلیمان، فن لاہوری،

علی گڑھ، نکلان ۱۱۵

مشنوی سنگھاسن بیتی (دعے بکریم) قلمی، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ،

نشان ۶۰۳/۳۹

مشنوی سنگھاسن بیتی، رنگ لال جمن، نول کشور، کانپور، ۱۸۶۹ء

مشنوی سوز و گداز، شوق نیوی، پٹنہ، ۱۹۴۳ء

مشنوی طالب و موہنی، سپد محمد والد، مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حیدر آباد،

۱۹۵۷ء

مشنوی طوطی نامہ، خواص، مرتبہ سعادت علی رضوی، حیدر آباد ۱۹۳۹ء

مشنوی عود و صندل (قلمی) امیری، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، نشان

۶۳۰/۸۵

مشنوی قطب مشتری، ونجی، مرتبہ مولوی عبدالحق، دہلی ۱۹۳۹ء

مشنوی کام روپ اور کلا کام (قلمی) کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، نشان

۵۶۶/۱۳

مشنوی کام روپ و کلا از حسین الدین مرتبہ گارساں دتاسی مطبوعہ پیرس ۱۸۳۵ء

مشنوی گلدستہ مسرت، عطا علی خاک، کانپور، ۱۲۸۵ھ

مشنوی گلزار نسیم (یادگار نسیم) مرتبہ اصغر گوٹھوی، الہ آباد، ۱۹۳۰ء

مشنوی گلشن عشق، عنایت اللہ روشن، لکھنؤ، ۱۸۹۵ء

مشنوی گلشن عشق، نصرتی، مرتبہ مولوی عبدالحق، کراچی، ۱۹۵۲ء

مشنوی لال و گوہر، عازف الدین خاں، عاجز، مصطفائی پریس مظفر نگر

مشنوی مہر و مشتری، امجد علی قلیق، لکھنؤ ۱۲۷۷ھ

مشنوی ندرت عشق (قلمی) محمد باقر آگاہ، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ،

نمبر ۶۶/۶۲۱

مشکوٰۃ نسیم سحر، جیالال خٹہ دہلوی، دہلی ۱۸۸۳ء

مشکوٰۃ غل و دمن، فیضی، نول کشور نکتہ، ۱۹۳۰ء

مشکوٰۃ غل و دمن، (قلمی) میر نیاڑ علی کھیت، کتب خانہ رضائیہ رام پور، نشان ۵۸۲

مشکوٰۃ غل و دمن (قلمی) بھگونت رائے راحت، بکوپ ۱۸۵۶ء

کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ نشان ۵۵

مشکوٰۃ نیرنگ سحر، اقبال ورماسکر بھگائی، بکاپور ۱۹۱۶ء

مشکوٰۃ ہیر رانجھا، (قلمی) مول چند منشی، کتب خانہ رضائیہ رامپور، نشان ۵۷۰

مشکوٰۃ ہیر رانجھا (قلمی) نجیب الدین نجیب، کتب خانہ انجمن ترقی اردو،

علی گڑھ، نشان ۱۰۲/۶۵

مشکوٰۃ ہیر رانجھا (ارمغان گدا) عبدالغفور قیس، آگرہ، ۱۳۱۷ھ

مشکوٰۃ ہیر رانجھا، کرم الہی بھوپالی، سیالکوٹ، ۱۹۰۵ء

مشکوٰۃیات، امیر احمد علوی، نکتہ ۱۹۳۶ء

مشکوٰۃیات جرأت (قلمی) کتب خانہ رضائیہ رامپور، نشان ۵۵۵ ب

مشکوٰۃیات راج، ڈاکٹر مستاز احمد، پٹنہ، ۱۹۵۷ء

مشکوٰۃیات میر حسن، مرتبہ عبدالہادی آسی، نکتہ، ۱۹۳۳ء

مقالات ہاشمی، فصیر الدین ہاشمی، لاہور

مقالات گارساں دتاسی، جلد اول و دوم، دہلی ۱۹۳۳ء

ملک محمد جاسسی، کتب مصطفیٰ، دہلی، ۱۹۳۱ء

منتخب التواریخ، عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی، چھپچھپ احمد علی، کلکتہ جلد ۱، ۲، ۳

۱۸۶۹-۶۵ء

مہابھارت (منسکرت) ہندو کر دیسراج انسٹی ٹیوٹ، لاہور، ۱۹۳۳ء-۱۹۵۶ء

کتابیات

میر تقی میر، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، دہلی ۱۹۵۵ء
 نذیر محمد قلی قطب شاہ، مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حیدر آباد، ۱۹۵۸ء
 نصرتی از مولوی عبدالحق سلو، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی
 وقائع عالم شاہی، کنویر پریم کشور فراقی، راجپور، ۱۹۴۹ء
 ہندی ساجیہ کا اجلاس، رام چندر شکل، ناگری پرچارنی سبھا، کاشی، مہاراجا سوامی انجمن،
 ۲۰۱۳ء

ہندی شہد ساگر، شیاام سندھ داس، مدراس، ۱۹۱۶ء
 یاد پش دکنی مخطوطات، نصیر الدین ہاشمی، حیدر آباد، ۱۹۳۲ء

رسائل

اولی دنیا، لاہور، ستمبر ۱۹۳۹ء، جولائی ۱۹۳۶ء
 ادیب، جون ۱۹۴۱ء
 اردو، ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۹ء، ۱۹۵۹ء، ۱۹۵۶ء
 اردو ادیب، دسمبر ۱۹۵۰ء
 انڈین بی ای این، جنوری ۱۹۶۰ء
 اورینٹل کالج میگزین، اگست ۱۹۴۷ء، نومبر ۱۹۴۸ء، مئی ۱۹۳۱ء، نومبر ۱۹۳۱ء،
 فروری ۱۹۳۴ء، مئی ۱۹۳۴ء، اگست ۱۹۳۴ء، نومبر ۱۹۳۴ء، نومبر
 ۱۹۳۳ء، فروری ۱۹۳۳ء
 برہان، دہلی، نومبر ۱۹۵۱ء
 سب رس، حیدر آباد، فروری ۱۹۶۰ء
 ماہ نوکراچی، دسمبر ۱۹۵۸ء، جون ۱۹۵۹ء

معارف، اگست ۱۹۳۶ء

معاصر، پٹنہ، شمارہ ۹، ۱۰، ۱۱ اور ۱۶

نقوش، لاہور، جون ۱۹۵۸ء

نگار، جولائی ۱۹۳۹ء

نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۲ء، جولائی ۱۹۵۳ء، اکتوبر ۱۹۵۸ء

نیا دور، لکھنؤ، جنوری ۱۹۶۰ء

English Books

Annals and Antiquities of Rajasthan,
by James Tod, New York, 1914

Chambers Encyclopaedia,
London, ed. 1950

The Encyclopaedia Americana,
New York, ed. 1944.

The Encyclopaedia Britannica,
Chicago, ed. 1955.

The Encyclopaedia of Islam,
Leyden and London.
Vol. I, 1913 Vol. II, 1927
Vol. III, 1936 Vol. IV, 1934

The Encyclopaedia of Religion and Ethics
by James Hastings, New York, 1951.
Hindu Mythology by John Wilkins,
London. 1957

History of Khiljis, by K. S. Lal,
Allahabad, 1950.

History of Sanskrit Literature,
by Arthur A. Macdonell,
London, 1900

Hitopadesa, edited by F. Johnson,
London, 1884.

Imperial Gazetteer of India,
Vol. V & Vol. XVIII,
Oxford, 1908

Jataka Tales by Ethel Beswick,
London, 1956.

Kathasaritsagara
edited and translated by Brockhaus, Leipsie,
(Books i – v) 1939, (vi – xviii) 1862 – 66

Ocean of Story, Translated by C. H. Tawney,
Edited by N. M. Penzer in 10 volumes,
London, 1924 – 1928.

Oriental Biographical Dictionary
by Thomas William Beale,
ed. Henry George Keene, Calcutta, 1881.
Panchatantra, edited by Kosegarten,
Bonn, 1848.

Sanskrit – English Dictionary,
by A. A. Macdonell,
London, 1893

Shakuntala, edited by Richard Pischel,
Harvard Oriental Series No. 16, 1877.

اشاریہ

264, 265	آتش
20, 41, 46, 104, 116	آرزو، مختار الدین احمد
238, 291	آسی، عبدالہادی
19, 263	آکا، محمد باقر
19, 20, 26, 80, 270, 303, 304, 309	ایمن نشاطی
37, 79, 82, 83, 254	ابوالفضل
22, 46	اش، محمد میر
235	اش، صالح
23, 40, 41, 42, 43, 46, 47	احمد سرلوی
23, 40, 48, 57, 157	احمد علی
19, 282, 283, 285	اختر، قاضی محمد صادق
80, 81, 98, 99, 103, 114, 221, 222, 226	استوارث
41, 42, 50, 62, 63, 98, 106, 113, 116, 119, 154,	اشپر انگر
167, 180, 196, 200, 224, 226, 227, 258, 270,	
278, 282, 283, 321	
21, 25, 322	افسوس، شیر علی
49	امانت کھنوی
179, 180, 214	امیر خسرو
225, 250	امیر جیلانی

19	ایمن
26, 155, 156	انشا
27	انصاری، عبداللہ
272	انور
77, 79, 96, 98, 105, 115, 127, 130, 179, 182,	اسحق
196, 320	
26	بادشاہ محل، نواب
250	برہم گور کچھوری
220, 225, 226	بڑی، عبداللہ
291	بسل، محمد خواجہ
23, 49, 133, 159	بشاش، دہلی پر شاہ
19, 262, 264	بلبل
39, 40, 50, 56, 57, 77, 83, 89, 98, 106, 110, 115,	بلوم ہارت
116, 127, 132, 137, 157, 158, 167, 182, 185,	
223, 236, 251, 273, 280, 303, 326	
236	جباب، احمد رام
24	جے نظیر شاہ
40	بہادر مستقیم جنگ سید علی اکبر
268	پردین (پرین)
20, 110, 115, 118, 121, 125	عسین الدین
313, 327	ترای، ملا احمد
26	خلیم سہوانی، انور حسین
25	خلیم کھنوی، امیر اللہ
22	حق، سید محمد

25	تمنا، رام سہائے
211, 213, 215, 219, 221, 232	جانشیں، ملک محمد
22, 25, 26, 201, 290	جراث
46	جیتو
24, 68, 72	جگر بریلوی
20, 90	جمال الدین
61, 62, 132	جواں، کاظم علی
150	جوہری، آیت اللہ
17, 77, 80, 291, 334	جین، گیان چند
23, 133, 136	چمن، رنگ لال
21, 25	حاتم، شاہ
269	حاتی محمد
267	حامد
154, 201	حسرت، جعفر علی
197, 200, 205, 283	حسرت موہانی
62	حسن، ڈاکٹر بادی
20, 22, 26, 46, 116, 236, 311, 313	حسن، میر حسن
225	حسن، ظلیل کھٹوی
211	حسینی، میر بہادر علی
250	حقیقت، میر شاہ حسین
62	حکمت، علی اصغر
83	حیدری، حیدر بخش
293, 294, 296, 298	خاک، منشی عطا علی
25	خوشتر

113	خوشگوار، بند راین واس
46	درغ
22, 324	داؤد علی
23, 46, 134, 201	درد، خواجہ میر
19	دولت
23, 40, 49, 50, 51, 56, 99	راحت کا کوڑی، بھگونت رائے
103, 104, 220	رازی، عاقل خاں
241, 242, 243, 277, 285, 287	راخ عظیم آبادی
21, 25	راغب دہلوی
23, 157	راغب سروہوی، سخن لعل
21	راغب، محمد جعفر خاں
25	رام پرشاد
223	رہا، احمد علی
276	رضوی، شمیم
200, 325	رضوی، مسعود حسن اویس
320, 323	رفعت کھنوی
184	رفیق خاؤر
19, 27, 250, 251, 280	رنگین، سعادت یار خاں
23, 134	رنگین لال رنگین
20, 23, 89, 157	ردشن علی
147	ردشن، عتایت اللہ
321, 323	ریحان الدین ریحان
96, 97, 111, 113, 114, 129, 167, 178, 181, 221, 223	ریح
21	رنجی، میر جعفر

243, 254, 255, 256, 257, 264, 270	زور، محی الدین قادری
63	زیدی، قدسیہ
235	زیم کہ، عطا محمد
24, 223	زبانک
24, 65, 66, 67	زحر، اقبال دریا بھنگائی
20, 116	زرانج
17, 261, 303, 311, 319	سردری، عہد القادر
236, 237	سعادت علی، میر
21, 25, 26, 237, 238	سودا
26	سہوائی، عبدالباقی
25	سہیل
103, 104	سید مظفر
19, 262, 265	سیف اللہ
27	شمار، واسے پر شمار
19, 262, 265	شاکر، عہد القادر
25	شایاں، طوکار اسم
198	شرر، عہد العلیم
22, 236, 261	شلیق، بھگی نرائن
39	شوق، الٹی بخش
229, 238	شوق، قدرت اللہ
24	شوق قدوائی
23, 26	شوق، نواب مرزا
19, 20, 275, 277, 278, 279	شوق نیوی
25	شوقی

25	شعلہ، بنواری لال
27	شمید، محمد بخش
236	شیفتہ، مصطفیٰ خاں
266	سبقت اللہ
256, 257, 259	صدیقی، محمد اکبر الدین
245	صفاء، میر ذوالفقار علی خاں
20, 116	ضیفم
27	طالب، سکھیا لال
19	طیس
27	طرب، چمنو لال
25	طرب، حسین علی
90, 91, 261, 266	ظہیر الدین مدنی
20, 103, 106, 107	عاجز، عارف الدین خاں
98, 101, 238, 252, 254	عبدالحمق
26, 49, 80, 95, 155, 201, 246, 276, 278, 283	عبدالودود، قاضی
20, 42, 43, 89	عبداللہ، سید
28, 92, 129, 178	عبدالقادر بدایونی
23, 24, 224, 229, 230, 231	عبرت، ضیاء الدین
320, 324, 327	عزت اللہ، بنگالی
23, 224, 229, 231	عشرت، غلام علی
19, 221, 224, 227, 228	عشرتی، سید محمد
236	علی امیر ایم خاں
22, 46, 65	عنایت سکھ
26	غالب، اسد اللہ خاں

22	غلام احمد
19, 225, 226, 325	غلام علی دکنی
50	غیمت، محمد اکرام سکپانی
24, 82, 84, 85, 92	غواصی
275	غاری، خواجہ احمد
21, 25, 26	غازو دہلوی
25	فرحت شکر دیال
41	فراغ بھولانا تھ
320, 323	فرحت عظیم آبادی
253	فرشتہ، ملا محمد قاسم
178, 180, 181, 195	فضل حق، قاضی
236	فضل شاہ
37, 38, 42, 43, 46, 47, 254	فیضی
77, 79, 83, 88	قادی، سید محمد
109, 221, 227, 256	قادی، شمس اللہ
259	قاضی، سید نور اللہ
21, 22, 25, 26, 236, 237, 238, 241	قائم چاند پوری
236	قدرت اللہ قاسم
18, 251, 252, 254, 255	قشب شاہ، محمد علی
198	قلق، امجد علی
24, 183, 184, 188	قمیس، عبد الغفور
23, 40, 56, 66	کالی پے شاہ
24, 36, 57, 61	کالی داس
25	کرامت جواہر لال

24, 183, 184, 188	کرم الہی بھوپالی
24	کھیرا سنگھ
39, 40, 41, 57, 81, 99, 110, 113, 115, 116, 119.	گارساں دہاسی
121, 127, 128, 182, 185, 198, 199, 258, 326	
236	کچھ رام
236	گوپال سنگھ
24	لال سنگھ
27, 272	لغنی، میر لطف علی
133, 206	بھنوں گور کچھوری
22, 24, 197, 200, 201, 211, 229, 283	محبت، محبت خاں
20, 27, 152	محمد الفضل
176, 177, 178, 196, 267	محمد باقر
173, 178	محمد شفیع
23, 224, 232, 233	محمد قاسم علی بریلوی
111	محمد کاظم مسینی
329	محمد یعقوب ابن اکبر خاں
222	مخلص، آئندہ رام
23, 83, 158, 160, 169	مدہوش، انہی پر شاد
27, 112, 116, 180	مراد
257	مرزا محمد ملیم اختر آبادی
235, 327	مستین، نجم الدین
22, 26, 236, 246	مصطفی، غلام محمد علی
182, 198	مقبول احمد
19, 256, 259, 261, 265	مقبلی

287	مستز احمد، ڈاکٹر
95	مکتبہ
23, 183, 184, 186	غشی، مول چند
26	مشیر کھنہ آبادی
269, 270	موسوی، سید محمد وار
27	مولوی لیاقت علی
27, 255	موسن
26	میر، حاتم علی
19, 21, 25, 26, 236, 237, 241, 245, 273	میر، میر تقی
23, 40, 57	میر علی، بنگالی
23	ناقواں، خدام
282	نارنج، امام بخش
25	ناظم، رائے برج فرائن و رما
23, 183, 184, 187	نجیب، نجیب الدین
78, 79, 84	نحس، ضیاء الدین
51, 236	نذیر، عہد الغفور
22, 319, 323, 334, 337	نسیم، دیا شکر
18, 24, 25, 26, 98, 99, 100, 103, 104, 310	نصرتی
18, 75, 76	نکھائی
75, 78, 88	نکھائی، خلیق احمد
23, 48, 49, 52	نکھتہ، نیاز علی
322, 326, 327	نہال چند لاہوری
198, 199	نیاز فتح پوری
27, 50, 137	واہد علی شاہ

173, 179, 184, 188, 190	وارث شاہ
19, 262	واقف
26, 260, 331	واقف، حسین بخش
18, 24, 251, 252, 253	وجہی
66, 67	وحشت بریلوی
27	وحشت بہادر علی
20, 27	ولی دکنی
19, 224, 226, 227	ولی ویلوری، سید محمد فیاض
75, 225, 227, 236, 257, 259	باشمی، نصیر الدین
282	باشمی، نور الحسن
23, 148	ہر چند، ہر چند واسے
11, 112, 113, 166, 167, 180	ہست خاں
26	ہندی، مرزا محسن علی
20, 108, 118	ہنر، سید احمد

کتاب کے بارے میں مشاہیر کی آرا

امتیاز علی عرشی

آپ نے مولو کے فراہم کرنے اور پھر اسے باضابطہ مرتب کرنے میں جو کاوش کی ہے، وہ ستائش و آفریں کی مستحق ہے۔ اس راہ میں جہل کرنے کا شرف آپ ہی کو حاصل ہے اور آئندہ جو کوئی بھی مشنوں کے اس پہلو سے بحث کرے گا، وہ آپ کی راہبری کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا۔

اس بحث نے ایک اور پہلو کو بھی روشن کر دیا، اور وہ ہے اردو ادب کا قدیم ہندوستانی ذخیرہ کا ادب سے استفادہ۔ جزاک اللہ، خدا آپ کو مزید توفیق کار عطا فرمائے اور ملک کے دوسرے باذوق نوجوان آپ کی ہمپائی کی کوشش کریں۔

قاضی عبدالودود

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی زیر نظر کتاب قابل قدر ہے۔ انھوں نے محنت کی ہے اور بہت سی ٹھہریاں سلجھائی ہیں۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اردو شاعری کے ایسی عناصر پر اتنی تحقیق کی ہے اور اس مضمون کے ہر پہلو کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہے کہ ان کو اس مضمون کا بھرپور خصوصی سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے کثیر التعداد مشنوں کی ضروری اور مناسب ترمیم کے ساتھ نصاب دی کی ہے جو ہندوستانی قصوں پر مبنی ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ نے ان مشنوں کو اپنی عالمانہ تحقیقی کتاب کا موضوع قرار دے کر صرف اردو ادب کی نہیں بلکہ ہندوستانی نگار کی بھی قابل قدر خدمت کی ہے۔

مولانا ضیا احمد بدایونی

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے پہلی بار اردو مشنویوں کی ہندوستانی پر نہایت لیاقت اور دیدہ ورنہ جامعیت کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ انھوں نے بڑی جستجو اور کاوش سے کار آمد مواد تلاش کیا اور کمال سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب بے شبہ ہماری زبان کی تاریخ و تحقیق کے سلسلے میں ایک نہایت مفید اور گراں قدر اضافہ ہے۔

نیاز فتحپوری

مصنف مشنوی پر اس وقت تک بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن ڈاکٹر نارنگ کی یہ تصنیف زور دگرست میں کمال را۔۔۔۔۔!

سید احتشام حسین

موضوع کی جدید اور تہذیبی اہمیت نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی زیر نظر کتاب کو امتیازی حیثیت دے دی ہے، کیونکہ اس وقت تک اردو مشنویوں کا یہ پہلو نگاہوں سے اوجھل تھا۔ ڈاکٹر نارنگ اردو کے محققوں میں اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں۔ ان کی اس کتاب نے ادبی مطالعہ کے ایک نئے زاویے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شعر و ادب کی تہذیب کی پوری تصویر بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کی سعی و جستجو سے اس مطالعہ کے لیے زمین ہموار ہو گئی ہے۔

آل احمد سرور

”ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مشنویاں“ ڈاکٹر گوپی چند کا کارنامہ ہے۔ اردو مشنویوں میں جو فضا اور ماحول ہے اس کی طرف ابھی تک بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے اس کمی کو دور کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور نہایت تلاش اور تحقیق سے اردو مشنویوں کی ہندوستانی بنیاد کا جائزہ لیا ہے۔ نارنگ جس

موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے سادے گوشوں پر نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے تحقیق کے ان نوادر کو جو نغروں سے لوجھل تھے، یکجا کر کے ایک داستان مرتب کی ہے جس میں معلومات کے ساتھ دل کشی بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو کی ہندستانی بنیاد کو واضح کرنے میں یہ کتاب نہایت مفید ہوگی اور اس کے اثر سے اردو مشنری کے سرمائے کو ہمارے ادب کی عظمت متعین کرنے کے سلسلے میں مناسب اہمیت دی جائے گی۔

ڈاکٹر گیان چند جین

ڈاکٹر نارنگ نے غیر معمولی محنت سے یہ کتاب مرتب کی ہے اور اردو مشنریوں پر ایک نئے اور اہم زاویہ سے روشنی ڈالی ہے۔ اس میں بہت سی ایسی مشنریوں کا تعارف کرایا گیا ہے جن کے ذکر سے ہماری سمجھیں خالی ہیں۔ زبرد نظر کتاب اردو مشنریوں سے متعلق تحقیقی معلومات کا گنجینہ ہے جو اس موضوع سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے بحد کار آمد ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اردو کے ان نوجوان لادبوں میں سے ہیں جن کی تحریر میں چنگی اور شائستگی جھلکتی ہے۔ وہ اردو کے مزاج داں ہیں اور کلاسیکی ادب پر ان کی نظر گہری ہے۔ ان کی تحقیق سے اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جاتا ہے کہ اردو مشنریاں گل و بلبل کی داستان ہیں اور نیکی و عوامی روایات سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کی ذات سے اردو کی بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ بیچ بہادر سپرو اور برج سوہن و ستر یہ کئی کے بعد اردو دنیا ایک ایسے دیدہ ور کی منتظر تھی جو اپنے ادبی و علمی کاموں سے اردو کے تہذیبی کردار کو زیادہ سے زیادہ واضح کر سکے۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو

ڈاکٹر گوپی چند ہارنگ نوجوان محققین میں ایک خاص اہمیت کے مالک ہیں۔ انہیں مولو تلاش کرنے اور اس سے صحیح کام لینے کا فن بہت اچھی طرح آتا ہے۔ اردو مشعوں پر ان کی نظر گہری ہے۔ انہوں نے زیر نظر کتاب بڑی محنت اور جہان بین کے بعد لکھی ہے اور اس موضوع پر یہ پہلی اہم اور جامع کتاب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی افادیت اور بلند معیار کے تلاش نظر اس کی قدر افزائی کی جائے گی۔

مالک رام

فردو میں تحقیقی کام ابھی بہت ابتدائی حالت میں ہے۔ چونکہ یہ کام محنت طلب ہے، ہمارے کہنے والے اس طرف توجہ نہیں کرتے۔ اس لیے خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر گوپی چند ہارنگ نے ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مشعوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ کوئی بھی تحقیقی کام حرف آخر نہیں ہو سکتا، تاہم اتنا یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر ہارنگ کی اس تالیف میں بہت دن تک کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہو سکے گی۔

گوپال محل

ڈاکٹر ہارنگ کی کوشش قابل قدر ہے اور انہیں اس معاملے میں بہا طور پر اہم کا مقام حاصل ہے۔

تنقید، ادب

اُردو افسانہ وایت اور مسائل
 سائنسیات، ایس سائنسیات اور شرقی شعریات
 ادب کا جدید منظر نامہ اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ
 ادبی تنقید اور اسلوبیات
 امیر خسرو کا ہندوی کلام
 سانچہ کر بلا بطور شعری استعارہ
 اندازِ نظر
 حسین وترید
 فیض شاعری اور سیاست
 تحفیات
 اقبال فراموشی
 اقبال از اقبال
 اقبال — فکر و عمل
 تحریک آزادی کشمیر (اردو ادب کے آئینے میں)
 احمد ندیم قاسمی شاعر اور افسانہ نگار
 فلسطین اردو ادب میں
 اپنی آگ کی تلاش
 مسائل ادب
 ہمارا ادب
 اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ
 ادب اور فطرت
 پروہ غفلت اور اس کا تنقیدی جائزہ
 تخلیقی، تخلیقی شخصیات اور تنقید
 اردو زبان کیا ہے؟

Rs. 350.00

www.sang-e-meel.com

ISBN 969-35-1461-0



9 789693 514612